مولانا

مودودی

سے ملئے

اسعد گیلانی

مولانا مودودی

سے ملئے

○ ان کے پاس آپ کے لئے ایک اہم پیغام ہے ○

اسعد گیلانی

ناشر: آزاد بک ڈپو سرگودھا (مغربی پاکستان)

سول ایجنٹ: بساطِ ادب چوک انارکلی لاہور

طابع :۔ پنجاب نیشنل پرنٹنگ پریس سرکلر روڈ لاہور
ناشر :۔ بشیر بٹالوی آنرلنگ ڈپو سرگودھا
کاتب :۔ سید کلب عباس تمکین رقم

طبع اوّل :۔ فروری ۱۹۶۲
تعداد :۔ ـــــ ۱۱۰۰
قیمت :۔ چھ روپے پچاس پیسے

بھارت میں ہماری مطبوعات

مکتبہ "الحسنات" رام پور یو، پی سے

طلب فرمائیں

مولانا مودودی سے ملئے

اسعد گیلانی

"—— مولانا ابوالاعلیٰ کی خدماتِ جلیلہ سے اُمّتِ مسلمہ کبھی صرفِ نظر نہیں کرسکتی کہ ایسے کارہائے نمایاں تاریخِ تجدیدِ اسلام کے ہر باب و فصل کے لئے سرمایۂ افتخار و بہ درجۂ عنوان ہیں۔ مولانا گلشنِ حق کے ان لالہ و سنبل میں سے ہیں جن کی خوشبوئے سدا بہار ہمیشہ تعفّنِ باطل کو مغلوب کرکے طالبانِ حق کے دل و دماغ کو معطّر کرتی رہتی ہے اور جسے فنا نہیں۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما! ——"

ابوالکلام

اُمّتِ مُسلمہ

کی خدمت میں

ہدیہ

کتاب ایک نظر میں

فہرس

انجمنیں اور ادارے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مُشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

"دیباچہ"

انسانم آرزوست

محترم جناب نعیم صدیقی

کہو وہ کون حسین ہے تمہاری بستی میں
کہ جس کے نام کے ساغر اٹھائے جاتے ہیں

زندگی کے شہر میں اولادِ آدم کے انبوہ پائے جاتے ہیں ان میں سے ہر آن کچھ تعداد پردۂ عدم کے پیچھے چلی جاتی ہے اور اپنے سے زیادہ جانشین پیچھے چھوڑ جاتی ہے مگر ان میں مجسمہ ہائے حُسن و خوبی کم ہوتے ہیں۔ اشخاص کروڑوں ہوتے ہیں لیکن شخصیّت کم ہی پائی جاتی ہے اور پھر ان میں تابناک شخصیتیں تو اکّا دکّا سامنے آتی ہیں۔

ہمارے اس دور میں، اور ہمارے اپنے ہی دیس میں ایک شخص ہیں جس کو مولٰینا مودودی کہا جاتا ہے۔

میرے دوست اسعد گیلانی نے انہی" مولٰینا مودودیؒ کی شخصیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

کسی شخصیت نگار کی پرکھ کرتے وقت دیکھنے کی پہلی چیز یہی ہوتی ہے کہ اس نے کس شخصیت پر نگاہ جمائی۔ اس لحاظ سے اسعد گیلانی کا انتخاب اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کی اپنی انسانیت کا معیار خاصا بلند ہے۔

دیکھنے کی دوسری چیز یہ ہے کہ جس مرتبے کی شخصیت سامنے ہے، کیا اس کے مطابق شخصیت نگاری کا حق ادا ہو گیا اس سوال کا جواب نفیاً یا اثباتاً نہ میں دے رہا ہوں۔ اور نہ میں نے یہ جواب سوچا ہی ہے۔ یہ جواب ہمیشہ زمانہ دیا کرتا ہے۔ البتہ اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود میں نے مولینا کی شخصیت کا ایک اجمالی خاکہ قلمبند کیا تھا جو شائع بھی ہو چکا ہے۔ اور ایک آدھ مضمون اس کے علاوہ بھی لکھا میرا اندازہ یہ ہے کہ مولینا مودودی کے شخصیت نگار کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کام کے لئے میرے اندر جس درجہ کا بڑا انسان موجود ہونا چاہیئے۔ وہ شاید موجود نہیں ہے۔

دراصل مولینا مودودی کی شخصیت کی تصویر اتنی پھیلی ہوئی ہے اور اس کے اتنے درخشاں گوشے سامنے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے پھر سوال صرف اسے پیش کر دینے کا نہیں، پیش اس طرح کرنا ہے کہ قاری یہ محسوس کرے کہ جیسے اس نے تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

مولینا کے اندر ایک داعیٔ حق، ایک متکلّمِ اسلام، ایک مفکرِ حیات، ایک ادیب ایک خطیب، ایک سیاسی قائد، ایک تنظیم کار بیک وقت جمع ہیں۔ ان کی شخصیت سیاسی و تاریخی اور علمی و ادبی ہر دو لحاظ سے بے حد اہم ہے اور پھر اس کے ساتھ حُسنِ کردار کا اجتماع ان کو اپنے دور کی ایک قیمتی شے بنا دیتا ہے۔ مگر کسی ایسی جامع شخصیت کے حُسن کو دوسروں تک منتقل کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ

سلہ نقوش شخصیات نمبر حصہ (۲)

اس کام کو کیا ہی نہ جائے۔ کوشش ہی کی راہ کامیابی کی منزل کو جاتی ہے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں ان کے شخصیت نگاروں کا قلم زندگی دیتا ہے ورنہ وہ ہمیشہ گمنامی میں پڑی رہتیں چنانچہ ڈاکٹر جانسن کے متعلق کارلائل نے ٹھیک کہا کہ اس کا نام شاعر اور قصہ گو یا مقالہ نگار اور مؤلف ہونے کی بناء پر زندہ نہیں ہے بلکہ وہ زندہ ہے تو باسویل کی لافانی تصنیف کے اوراق کے بل پر زندہ ہے اس سوانح عمری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دنیا کے سوانحی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

دوسری قسم کی شخصیتیں وہ ہوتی ہیں کہ جن کی عظمت ان کے سوانح نگاروں کو بھی شہرت و عظمت کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ شخصیت نگار کو کسی حسین شخصیت کے حسن سے اسی طرح حصہ ملتا ہے جس طرح مامون نے محبوبہ کی طرف بھیجے ہوئے قاصد کی آنکھوں کے متعلق لکھا تھا کہ ؎

أَرَى أَثَراً مِنْهُ بِعَيْنَيْكَ بَيِّنًا
لَقَدْ أَخَذَتْ عَيْنَاكَ مِنْ عَيْنِهِ حُسْنًا

(تیری آنکھوں نے میری محبوبہ کی آنکھوں سے حسن کا جوہر تو قبول کیا ہے۔ میں اس کا واضح اثر تیری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں)

اس کی مثال میں مولانا مودودی کی شخصیت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو آج بالکل مولانا کی شخصیت یا سوانح کو دنیا کے سامنے شایانِ شان طریق سے لائے گا اس کا نام مولانا مودودی کے نام کے ساتھ ساتھ رہے گا۔

آج نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کسے یہ مقام حاصل ہو گا!

مولانا مودودی کی شخصیت اور سوانح میں بہت ہی غیر معمولی اہمیت کیوں پیدا ہو گئی ہے؟

سچ یہ ہے کہ شہرت کی زرنگار قبائیں دیکھ کر نگاہ کتنے ہی مواقع پر بہکی ہو گی مگر وائے ناکامی کہ ان قباؤں میں انسان کم ہی ملا فرماں رواؤں کے طنطنے دیکھے۔ ادیبوں کے چمنستان ہائے نگارش دیکھے۔ شعرا کی زمزمہ سنجیوں سے استفادہ کیا، جادو بیان خطیبوں کی طلاقت لسانی کے شعبدے دیکھے۔ اہلِ علم کی نکتہ آفرینیوں سے بہرہ پایا، مذہبی شخصیتوں کو عقائد و احکام کی وضاحت کرتے اور کفر و ایمان کے فیصلے کرتے دیکھا مگر کم ہی ایسا ہوا کہ انسانیت کے حُسن سے دامن نگاہ بھرا ہو کیا پوچھتے ہو۔!

آدمیت! تیری تلاش رہی

دیکھے ہیں پردہ ہائے نام بہت

مگر مودودی کے اندر انسان کو موجود پایا اور زندہ پایا، اور اسے انسانِ عظیم پایا۔ مودودی کی عظمت تاریخی لحاظ سے یہ ہے کہ اس نے حالات کے دھارے پر بہنے والے انبوہ ہائے کثیر کے بالمقابل دھارے سے لڑنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ بہنے والے وہ بھی ہیں جو پانی پر پُر شکوہ تخت بچھائے بہ رہے ہیں۔ وہ بھی جو خوبصورت بجروں میں بہہ رہے ہیں، وہ بھی جو براہِ راست موجوں کی آغوش میں جھولے لیتے ہوئے بہ رہے ہیں۔ اور وہ بھی جو غوطے کھا کھا کر بہہ رہے ہیں۔ اور یہ بہنے والے ایک ایک کر کے ڈوب بھی رہے ہیں۔ مادہ پرستی کے اس طوفانِ مغرب میں جو قیمتی عنصر دھارے کے خلاف لڑ رہا ہے یا کم سے کم قدم جمائے کھڑا ہے یا کھڑا رہنے کی سعی کر رہا ہے اس کے درمیان مولینا مودودی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ کیونکہ وہ

وقت کی ہوا کے ساتھ چلنے پر ایک لمحہ کے لئے کبھی راضی نہیں ہوئے بلکہ برابر ہوا کا رُخ بدلنے کے لئے کوشاں ہیں۔

دراصل کسی دینی ملّت کی ساری زندگی کشمکش کی زندگی ہوتی ہے کیونکہ اسے ایک واضح عقیدہ اور ایک معینہ ضابطہ کے تحت اپورے تمدن کو چلانا ہوتا ہے۔ مگر حالات کی ہوائیں موافق ہی نہیں، مخالف ہو کر بھی چلتی ہیں۔ مخالف ہواؤں کے چلنے پر سفینۂ تمدن کا رُخ اپنے اصولی نصب العین کی جانب رکھنا ایک کٹھن کام ہے۔ یہی کٹھن فریضہ ملّتِ اسلامیہ کے سر عائد ہے۔ یہ فریضہ خلافتِ راشدہ کے دور تک ملّت اسلامیہ نے بخوبی سرانجام دیا مگر بعد میں بدلتے حالات کا مقابلہ کما حقہٗ جاری نہ رہا۔ ایک اصولی نظام کا رُخ تاریخ کس قدر موڑ لے گئی۔ مسلمانوں پر ماضی میں ایسے دو بڑے خوفناک دور آئے۔ ایک عبّاسی دور، دوسرے سلطنت مغلیہ میں اکبر کا دور۔ ان دونوں موقعوں پر جو قوت سفینۂ ملّت کی ناخدائی کر رہی تھی۔ وہ طوفانی ہواؤں اور موجوں کے سامنے خم کھا گئی اور ان دونوں موقعوں پر طوفان سے لڑنے اور نظریہ و اصول کو بحال رکھنے کی سعادت ان مردانِ خدا کے حصے میں آئی۔ جن کے پاس ایمان، علم اور کردار کے سوا کوئی دوسری طاقت نہ تھی اور اب تیسرا سنگین ترین دور درپیش ہے جس میں باہر سے فکری سیاسی اور ثقافتی اثرات۔ کا طوفان خوفناک رفتار سے پورے عالم اسلام میں بہ رہا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے اور ان میں سے اُٹھے ہوئے اربابِ قیادت جن پر قلعہ کے بچاؤ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے — ذہنی غلامی کے روگ نے ان سے تابِ مقاومت سلب کر لی ہے۔ اور وہ ہنستے۔ مسکراتے

اور خوش آمدید کہتے ہوئے کنجیاں دشمن کے حوالے کر رہے ہیں۔ عالم وہ ہو گیا ہے کہ

مستی سے اس نگاہ کی اے محتسب خبر
دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی

یہی وہ خطرناک مرحلہ تھا جس کے لئے اقبال نے یہ احساس قوم کو دلانا چاہا تھا کہ تم میدانِ جنگ میں ہو اور یہ موقعہ نوائے چنگ سے لطف اندوز ہونے کا نہیں۔ بلکہ اس مردِ فرد انگر نے "دورِ حاضر کے خلاف" اس بھرے پر اعلانِ جنگ بھی کر دیا تھا کہ قوم کے نوجوان اس کے اعلان پر صف بستہ ہو جائیں گے۔ آج اگر وہ نغمہ طرازِ جہاد اٹھ کے دیکھے کہ اس کے شاہین و عقاب کس شان سے پسپا ہوتے ہیں تو اپنے رجز کو واپس لے کر شاید وہ مرثیہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتے۔

بہر حال اقبال کے اعلانِ جنگ کی لاج رکھی تو مولینا مودودی نے کہ خود ہی فکری و تہذیبی جنگاہ میں سینہ سپر نہیں ہوئے بلکہ قوم کے اندر سے جیدار اور صاحب کردار عنصر کو اپنے گرد سمیٹا اور آج اگر معرکہ گرم ہے تو اس شخص کے دم سے!

فیضی! احسنت ازیں عشق کہ در شہر امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را

مولانا مودودی نے اس کوشش میں اپنی پوری زندگی کھپا دی ہے کہ حالات کے سامنے جھک کر اپنے اصولوں کو مسخ کرنے کے بجائے ہم اصولوں کو قائم رکھنے کے لئے حالات سے جنگ کریں۔ اسلام کو ہم اپنی سہل طلبی کی وجہ سے بازیچۂ تاریخ نہ بنا دیں بلکہ تاریخ کو مجبور کر دیں کہ وہ اسلام کے منشا کے مطابق

رہے۔ مودودی کا مشورہ ہے کہ ہم مغربیت کے سانچے میں آرام سے نہ ڈھل جائیں بلکہ مغربیت کے مقابل میں اسلامی نظریہ، اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی تہذیب کو برپا کریں۔

یہ دراصل حقیقت اپنی خودی کے تحفظ اور اپنی ہستی کی بازیافت کا پیغام ہے اس پیغام سے اثر پذیر ہونے والوں کا احساس یہ ہوتا ہے کہ۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

مادیت کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لئے جس ایمان و شعور کی ضرورت ہے اسے نوجوانوں میں ابھارنے کے لئے مولینا مودودی نے ایک عظیم فکری کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہزارہا صفحوں پر پھیلا ہوا لٹریچر فراہم کیا ہے۔ جس میں کتاب و سنت کی حکمت اور علوم حاضرہ دونوں کی روشنی میں تہذیب مغرب کے خلاف اپنا مقدمہ نہایت مدلل طور پر ثابت کیا ہے۔ اور اسلام کی اساسی صداقتوں سے کر اس کے اصولی احکام تک ہر چیز کو اس طرح منقح کر دیا ہے کہ اس دور کے عقلیت زدہ ذہن اس کے زیر اثر فکری انقلاب سے دوچار ہو جاتے ہیں اور انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اپنی گمشدہ ہستی دوبارہ ہاتھ آ گئی ہے۔

مولینا مودودی نے اسلام کو انفرادی مذہب کی حیثیت سے نہیں پوری زندگی کے بہترین نظامِ عدل کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ اور بے شمار دلوں کو اسکی برتری کے اعتراف پر مجبور کر دیا ہے اتنا ہی نہیں انہوں نے اس نظام کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کے لئے نوجوان طاقت کو اٹھا کھڑا کیا ہے۔ شہروں میں، دیہاتوں میں، تاجروں میں، ملازمین میں، ادیبوں

اور ہمسائیوں میں، طلبہ میں، خواتین میں، مزدوروں میں، غرضیکہ ہر طبقے میں ایک فعال طاقت موجود ہو گئی ہے۔

اس معرکۂ استدلال میں ایسی بھرپور فتح مولانا مودودی کو حاصل ہوتی ہے کہ بے اختیار یہ شعر نوکِ قلم پر آ گیا ہے کہ ؎

سَکَتْنَا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالاً لِصَامِتٍ
وَقُلْنَا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالاً لِقَائِلٍ

"ہم جب خاموش رہے تو کسی خاموش بیٹھنے والے کے لئے کہنے کی کوئی بات باقی نہ رہی۔ اور جب ہم نے بات کی تو ہم نے کسی بات کرنے والے کے لئے کوئی موضوع نہ چھوڑا۔"

مولانا مودودی کا لٹریچر آج پاکستان ہی کی ایک ایک بستی میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ متعدد دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر عالمِ اسلام اور یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل رہا ہے۔ اس کے نفوذ کا یہ حال ہے کہ مولانا کے مخالفین تک کے ذہنوں میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس لٹریچر کے چھیڑے ہوئے مسائل۔ اس کا طرزِ فکر اور اس کی اصطلاحات کس گوشے میں موجود نہیں بارہا اونچے اونچے ایوانوں سے ایسی تقاریر سنی گئی ہیں جن میں یہ لٹریچر بول رہا ہوتا ہے یعنی ؎

اب وہی سارے زمانے کی ادا ٹھہری ہے

مولانا مودودی محض حکیم، مفکر اور ادیب ہوتے اور صرف اپنا پیغام ہی دے جاتے تو بھی ان کی عظمت کے کنگروں کو چھونا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا

مگر انہوں نے انقلاب کی عملی جدوجہد کی ذمہ داریاں بھی اٹھائی ہیں اور مردانہ وار اٹھائی ہیں۔

قوم کو پکارا، لبیک کہنے والوں کو جمع کیا، ان کو نظم میں پرویا، ان کی تربیت کی، نصب العین کے لئے ان کو وقت توی اور مال کی قربانی دینے کا درس دیا ان کو سیاسی و عمرانی مسائل کا گہرا شعور دیا، ان کو مفاد کی کشمکش سے بے نیاز رہ کر زندگیاں کو انسانی اور ملکی خدمات کے لئے وقف رکھنے کا جذبہ دیا، پھر اس بہم شدہ قوت کے بل پر ایک طرف الحاد پسند، کمیونسٹ، مغرب پرست اور جاہ طلب عناصر کی مزاحمت نظریاتی اور سیاسی میدانوں میں جاری رکھی، دوسری طرف عوام ملک کو اسلامی نظام کے لئے تیار کرنے کی مہم چلائی۔ اخلاقی فساد کا مقابلہ کرنے کے لئے انجمن تحفظِ اخلاقِ عامہ کی تاسیس کی، تعلیم عوام کے لئے قرآن و حدیث کے درسوں، دارالمطالعوں، تعلیم بالغان کے اداروں، اور اسکولوں اور مدارس کا اجراکیا، وقت کے مسائل سے جمہور کو آگاہ رکھنے کے لئے سلجھے ہوئے خطیبوں اور مقرروں کی ایک بہت بڑی ٹیم میدان میں اتاری۔ محنت کشوں کو ان کے حقوق دلوانے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا، غریب طبقوں کو بیماریوں سے بچانے اور بڑے بڑے مواقع مصیبت پر سہارا دینے کے لئے شعبۂ خدمتِ خلق قائم کیا۔ خواتین میں دینی اخلاقیات، اجتماعی مسائل کا شعور اور جدوجہد کا جذبہ پھیلانے کے لئے ان کی تنظیم کی، نوجوان طلبہ کو الحاد، کمیونزم اور مغربیت کا مقابلہ تعلیمی دائروں میں کرنے کے لئے خطوطِ کار بہم پہنچائے اور ان کو رہنمائی اور تربیت دی، ادب کی دنیا میں اسلامی قدروں کے مشعل بردار کھڑے کئے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے

میں تعمیرِ نو کے لئے ایک حرکت پیدا کر دی۔

آج اتنی رفیع الشان دینی و قومی خدمات کو انجام دینے والی مشین معطل ہو چکی ہے اور اس کے پرزے کھلے پڑے ہیں۔

بدقسمتی سے مولینا مودودی کو نہایت گھٹیا حریفوں سے سابقہ پڑا اور زمانے نے اس داعیٔ فلاح کا خیر مقدم اولاً گالیوں، پھبتیوں، الزام تراشیوں اور تکفیر و تفسیق سے کیا (اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی حد تک برابر جاری رہا ہے) اور پھر غداری اور تخریب اور پاکستان دشمنی کے سیاسی الزامات وضع کئے گئے۔ یہاں تک کہ آخر کار سیفٹی قوانین کے ترکش سے تیر برسائے جانے لگے، قید و بند کے دور آئے اور بالآخر ایک دن اس مسافرِ راہِ حق نے دیکھا کہ پھانسی کی کوٹھڑی اس کی منزل بن گئی ہے۔

چلی تھی بات جو منبر سے دار تک پہنچی
قلم کی نوک سے خنجر کی دھار تک پہنچی
مگر صدا تیری گردوں کے پار تک پہنچی

ظلم و جور کی یہ بھٹی ہر داعیٔ حق کے لئے گرم کی جاتی ہے۔ کیوں کہ بغیر اس سے گذارے کھرے کھوٹے کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔

بچہ گیرند عیار ہوس و عشق دگر
رسمِ بیداد مبادا ز جہاں برخیزد!

اسی لئے عشق کی نگری کا دستور یہ ہے کہ کلمۂ خیر کہئے اور گالیاں کھائیے، پھول برسائیے اور کانٹوں سے دامن بھریئے، موتی لٹائیے اور پتھر کھائیے، ایلے لوٹ

خدمت کیجئے اور مجرم ٹھہریئے۔ راستی کے مسلک پر چلئے اور تعزیر بھگتئے۔
مولانا مودودی کی شخصیت۔ بفضلہٖ تعالےٰ۔ ان بھٹیوں سے گزر کر کھرا سونا ثابت ہوئی۔

اور آج اس طویل کشمکش، عمر بھر کی تعمیری جدوجہد اور امتحان بلا کی لذت کشی نے صورت ایسی پیدا کردی ہے۔ کہ مولانا مودودی راہِ حق کی ایک علامت ٹھہرے ہیں امام احمدؒ بن حنبل عقوبت سے گزرنے کے بعد اپنے دور میں علامتِ حق بن گئے تھے اور ان کی ذات معتزلہ اور دوسرے فتنہ طرازوں کے مقابل میں محاذ سنت کا ایسا مرکز بن گئی تھی کہ ایک شاعر پکار اٹھا۔

تریٰ ذا الھویٰ جھلاً لِاَحمد مُبغضاً
وَتَعرِف ذا التقویٰ یُحِبُّ ابنَ حنبلٍ

"تو بندگانِ ہوس کو دیکھ کہ وہ جہالت زدہ ہوں گے اور احمدؒ بن حنبل سے بغض رکھتے ہوں گے اور اہل تقوےٰ کو تو اس علامت سے پہچان کہ ابن حنبل کے لئے ان کے دلوں میں محبت موجزن ہوگی۔"

مولانا مودودی بھی اس دور میں اور اس ملک میں حق کے محاذ کی ایک نمایاں علامت بن گئے ہیں۔ وہ ایک شخص نہیں رہے۔ بلکہ ایک دعوت، ایک پیغام ایک تحریک، ایک جدوجہد ایک نظامِ زندگی اور ایک انقلابی محاذ کا مظہر ہیں عینی مشاہدہ ہے کہ صدہا لوگ آتے ہیں، ایک نظر مولانا مودودی کو دیکھتے ہیں اور بس اتنے ہی سے ان کی امیدیں، امنگیں اور ہمتیں استوار ہو جاتی ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تجدید واحیائے اسلام کا کام اس تاریک ترین دور میں بھی ہو سکتا ہے

انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ رات کتنی بھی گھنی ہو اس کی کوکھ سے صبح جنم ضرور لے گی۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مودودی کے اندر جو انسانِ عظیم پایا جاتا ہے وہ بہ حیثیت انسان کشمکش اور امتحان ہی کے مراحل میں نہیں بلکہ غیر معمولی درجے کی شہرت و اعزاز کے درمیان بھی برابر حسن پاش رہا ہے۔ اس کی طرف سے کسی کو کچھ بھی گھٹیا پن کا تجربہ نہیں ہوا۔

ہزارہا انسان اس سے ہر سال ملتے ہیں۔ ہر روز مختلف طبقوں کے اور علاقوں کے نت نئے ملاقاتی آتے ہیں، مختلف قسم کے ظروف و احوال میں اسے دیکھتے ہیں، مگر اسے دیکھ کر کبھی کسی کو مایوسی نہیں ہوتی۔

حتیٰ کہ اس کے نادان حریف بھی تنہائیوں میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آدمی بس وہ ایک ہے جو نہ کبھی بکا، نہ جھکا۔

جی ہاں! لوگوں نے عجیب عجیب حرکتیں کیں۔

بعض نے اسے نظر انداز کرنا چاہا کہ گویا وہ موجود ہی نہیں۔ انہوں نے اس سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ان کے ساموں کو بھی دکھائی دیا کہ ایک کوہِ گراں سامنے کھڑا ہے اور یہ تردید نہیں کی جا سکتی کہ وہ موجود نہیں ہے یا وہ محض ایک ذرۂ ناچیز ہے۔ بعض نے بہت اونچی اونچی مسندیں بچھا کر مصنوعی مناصب کی بلندیوں سے اسے دیکھا کہ شاید وہ اس طرح ان کے مقابلے میں پست رہ جائے گا۔ مگر اس سرو بلند و بالا کا قامت کوتاہ نہ ہو سکا۔ بعض نے اسے ملّا کہہ کر ملا دوپیازہ بنانا چاہا۔ مگر اندازہ ہوا کہ بحیرۂ عرب کو چہ بچہ کہہ کر سکیڑنے کی کوشش کا کچھ حاصل نہیں۔ یہ مقام قدرت کی دین ہے۔ کسی نے خوب کہا تھا۔ بغداد کے رند شاعر ابو نواس نے کہ

وَلَا یَطْمَعَنَّ فِیْ ذٰلِکَ مِنِّیْ طَامِعٌ
وَلَا صَاحِبُ التَّاجِ الْمُحْتَجِبِ فِی الْقَصْرِ

(مجھ سے میرے مقامِ فخر کو چھیننے کے لئے کسی شائق کا جی نہ للچائے۔ حتیٰ کہ اس تاجدار کو بھی اس کے درپے نہ ہونا چاہئیے جو قصرِ شاہی کے سراپردہ میں دربانوں کے درمیان گھرا بیٹھا ہے)

ایسی درخشاں شخصیت کی سوانح نگاری یا شخصیت نگاری کی ذمّہ داری اٹھانے والوں کے لئے ایک اہم کام یہ ہے کہ اس کی شخصیت کا صحیح مرتبہ اور مقام اور موقف واضح کریں۔ ہونے کو تو یہ کام از خود ہو رہا ہے اور ایک شمع روشن کے گرد کتنا بھی غبار کیوں نہ پھیلا رہے وہ اپنے تعارف کے لئے اس کی محتاج نہیں ہوتی کہ کوئی قصیدہ خواں یہ بیان کرے کہ یہ شمع ہے اور اس کے روشنی بھی ہے (ابو نواس کا جو شعر اوپر درج ہوا اسی کے ساتھ کا ایک مصرعہ ہے۔

فَمِیْ عَنْ جَمِیْعِ النَّاسِ حَسْبِیْ مِنَ الْفَخْرِ

(میرا دہن یعنی زبان تمام لوگوں کے مقابلے میں میرا سرمایۂ افتخار بننے کو کافی ہے)

سو مولانا مودودی کے لئے بھی ان کا اپنا ایمان و کردار ان کا مقام متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ مگر معاصرت زدہ عناصر (خصوصاً سیاسی حلقے) جب کسی کام کے آدمی کے گرد تعصبات اور غلط فہمیوں کا غبار پھیلا دیتے ہیں تو بہت سے لوگ استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ تاہم اگر حقیقت از خود ان پر آشکارا ہو۔ بڑا سوال یہ ہے کہ معاشرے میں، تاریخ میں، اور اپنے دور میں اس کی جگہ کیا ہے!

معاشرے میں لوگوں نے اسے زیادہ سے زیادہ علماء کی صفوں میں جگہ دی ہے۔ تاریخی کشاکش کے لحاظ سے اسے حریفوں نے ایک اقتدار طلب شخصیت کے رنگ میں دکھانا چاہا ہے اور دور کے لحاظ سے اسے بیرونی اور اندرونی مخالفین نے مغرب کے اسلام دشمن پروپیگنڈا کی مروجہ اصطلاح کے مطابق ایک قدامت پسند اور رجعتی شخصیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ معاشرے کے موجودہ طبقوں میں سے کسی میں بھی مولانا کی ذات پوری طرح نصب نہیں ہوتی ان کے لئے ایک نئی جگہ درکار ہے۔ کیونکہ وہ قدیم و جدید طبقوں کے درمیان بالفاظ خویش "بیچ کی راسس کے آدمی" کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ تاریخی کشمکش کے لحاظ سے وہ اسلامی نظریہ اور اصولوں کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے کوشاں ہیں۔ دور کے لحاظ سے وہ علم اور سائنس کی ساری ترقیوں سے استفادہ کرنے اور مسائل تازہ کو اجتہادی زاویہ نگاہ سے حل کرنے کے داعی ہوتے ہوئے مادیت کا طلسم توڑ کر انسانیت کی لازوال اخلاقی قدروں پر تمدن کی بنیاد رکھنے کے خواہاں ہیں۔

مگر کم لوگ۔ اور مخالفین میں تو بہت ہی کم لوگ۔ ان کے صحیح مقام کو جان سکے ہیں۔ یہ کام مولانا کے سوانح نگار اور شخصیت نگار کا ہے کہ وہ ان کو صحیح مقام پر دکھائے۔

بات، آخر لمبی ہو ہی گئی!

محترم دوست اسعد گیلانی نے مولانا مودودی کی شخصیت پر جو کچھ بھی مرتب کرنے کی کوشش کی ہے وہ میری نگاہ میں دو وجوہ سے بڑا قیمتی ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ خود اسعد گیلانی کے اندر کا انسان زندہ و توانا ہے اور وہ مولانا مودودی

کی انسانیت کا مطالعہ کرنے اور حاصل مطالعہ کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے پاس وہ سرمایۂ اخلاص و محبت موجود ہے جو اس کام کے لئے نہایت ضروری ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اسعد گیلانی اہلِ نظر کی اس صف کے ایک فرد ہیں جنہیں مولینا مودودی سے قریبی تعارف بلکہ رفیقانہ رابطہ کی سعادت حاصل ہے۔ وہ استحقاق رکھتے ہیں کہ مولینا کی شخصیت کی عکاسی کریں۔ تیسرے اس وجہ سے کہ موصوف کے ہاتھ میں ایسا حقیقت نگار قلم ہے جو زبان و ادب پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ قاری کے دل میں تحریک پیدا کر سکتا ہے۔

پس میں یہ پیشگوئی کر سکتا ہوں کہ مولینا کی شخصیت اور سوانح کے اب تک جو دو چار خاکے مرتب ہوئے ہیں ان میں اس تازہ خاکے کا اضافہ نہایت قابلِ قدر ہوگا۔

مبارک ہیں وہ ہاتھ جو تاریکی میں کاغذی فانوس کے اندر حسنِ انسانیت کی ایک شمع روشن کر رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

۱۹۵۳ء میں میں نے ارادہ کیا تھا کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی پر ایک کتاب لکھوں۔ اس وقت مولانا مودودی جیل میں تھے اور وقت کے ارباب اقتدار سے سزائے موت سننے کے بعد ۱۴ سال کی عمر قید گزار رہے تھے۔ میرے چند ایک مضامین رسائل میں شائع ہوئے تو بعض احباب نے بھی اس طرف توجہ دلائی کہ میں اس موضوع پر ایک کتاب تیار کر دوں۔ جیل میں محبوس ایک محترم دوست سیّد نقی علی صاحب سے اس ارادے کا اظہار کیا تو انہوں نے بھی اس کی پر زور تائید کی اور میں نے اس پر کام کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا بلکہ لاہور کے ایک پبلشر کو اشاعتِ کتاب کے لئے خط بھی لکھا۔ پبلشر کا جواب آنے سے پہلے ہی ایک روز کراچی کے ایک نہایت ذمّہ دار دوست نے مجھے بلا کر پوچھا کیا تم مولانا مودودی پر کوئی کتاب لکھ رہے ہو؟ میں نے حیرانی کے ساتھ اپنے ارادے کا اقرار کیا۔ حیرانی اس لئے ہوئی کہ میں نے اس بات کا تذکرہ ان سے یا کسی اور سے نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آج مجھے ایک خاص ذریعے سے سی آئی ڈی دفتر سے یہ معلوم ہوا ہے کہ انہیں لاہور سے ڈائریکٹ آئی ہے کہ چھاپہ مار کر تمہاری اس کتاب کے مسودے پر قبضہ کر لیا جائے اور ہو سکتا ہے کہیں رات چھاپہ پڑ جائے اس لئے کہ اربابِ اقتدار اس کتاب کی اشاعت کو سخت

ناپسند کرتے ہیں۔ تم اپنا مسودہ محفوظ کر لو۔ میں نے وہ نامکمل سا مسودہ محفوظ کر لیا لیکن پھر چھاپنا نہیں پڑا۔ وہ نامکمل مسودہ پھر کچھ ایسا محفوظ ہوا کہ اس پر برسوں گزر گئے ۱۹۵۵ء کے وسط میں مجھے تبلیغی کام کے سلسلے میں مشرقی پاکستان جانا پڑا اور ۱۹۵۶ء میں وہاں سے واپس آکر دوسرے تبلیغی کاموں میں ایسا مصروف ہوا کہ پھر اس طرف توجہ ہی نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ مارشل لا نے ہر قسم کی مصروفیت کے کاموں سے فارغ کر دیا اور مجھے لکھنے پڑھنے کی طرف دوبارہ توجہ دینے کا موقعہ ملا۔ اب اس پرانے مسودے کو دیکھا تو اس کی حیثیت محض کام کے لئے جذبہ پیدا کرنے اور رخ متعین کرنے کے لئے ایک بنیاد کی تھی اس سے زیادہ وہ کچھ نہ تھا لیکن دوسری طرف اس کام کی ضرورت موجودہ حالات میں سب سے زیادہ محسوس ہوتی چنانچہ پھر اس کام کو اٹھا لیا۔

اس کام کے لئے مولانا کے لٹریچر کو نئے سرے سے دیکھنا پڑا ہے جو خود میرے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے اور دل و دماغ کی بہت سی الجھنیں اور کثافتیں صاف ہو گئی ہیں یہ فائدہ ہے جو میں نے خود اس کام سے اٹھایا ہے۔ دوسری طرف اس کام کے دوران میں گویا اتنی دیر بیٹھ کر بھی مجھے مولانا کی صحبت میسر رہی ہے جو ہمیشہ قلب و ضمیر کی زندگی میں اضافہ کرنے والی اور ایمان کی حرارت کو بڑھانے والی ہوتی ہے اس لئے میرے اس کام سے دوسرے لوگ کچھ فائدہ اٹھا سکیں یا نہ اٹھا سکیں لیکن میں نے ضرور اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس طرح اپنی محنت کی قیمت وصول کر لی ہے۔

اس کتاب میں میرا موضوع نہ تاریخ ہے نہ سوانح اور نہ محض شخصیت

بلکہ مولانا مودودی کی شخصیت کے وہ بیرونی مظاہر جو دعوت و مشن پر مشتمل ہیں اور جو اقامت دین کی جدو جہد کے ذریعے ہم سب پر ظاہر ہوئے ہیں۔ جن کے سبب میرا اور ہزاروں بندگان خدا کا تعارف ان سے ہوا ہے اور جن کے سبب مجھے اور ہزاروں اور لاکھوں افراد کو ان سے گہری محبت اور بہت سے حضرات کو ان سے گہرا بغض و عناد ہے۔ اگر اس پہلو کے علاوہ کسی اور خاص دائرے میں بند ہو کر مجھے یہ کام کرنا پڑتا تو شاید میں کبھی ہمت نہ کرتا۔ میرا عمومی موضوع تو بس مولانا کی دعوت اور مشن ہی ہے یہ آسان ترین اور اہم ترین موضوع تھا جو میں لے سکتا تھا۔

اسی کام نے مولانا کو ایک شخصیت بنا دیا ہے اور اب اتنی دراز، وسیع الاطراف اور وسیع الصفات شخصیت بنا دیا ہے کہ ان کی شخصیت پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں رہا ہے۔ خوش نگارش کے لئے اور رو آزمائش کے لئے میں نے تو اس وسیع شخصیت کے بیرونی مناظر کا صرف ایک پنسل اسکیچ ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ بس ایک اندازہ ہو جائے کہ وہ شخصیت کس نوعیت کی ہے اور اس جہان فانی میں کیا کام کر رہی ہے جو اسے حیات جاوداں عطا کرنے والا ہے۔

مولانا مودودی کی اندرونی شخصیت لکھنا میرے لئے تو ایک نہایت مشکل بلکہ ناممکن سا کام ہے میں اس کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ مولانا مودودی سیاستدان ہیں، مدبر ہیں اجتہادی صلاحیتیں رکھنے والے عالم دین ہیں۔ مفسر قرآن ہیں، مقرر ہیں۔ اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں۔ بہترین قائد ہیں۔ منتظم ہیں۔ ایک عالمگیر نظریے کے علمبردار ہیں۔ ماہر معاشیات ہیں، معاشرتی مصلح ہیں۔ پر عزیمت مجاہد ہیں

ایک شفیق اور غمگسار رفیق اور ساتھی ہیں قانون داں ہیں۔ ماہرِ تعلیمات ہیں۔ یہ محض گنتی پوری کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سب شعبوں میں انہوں نے اعلیٰ درجے کا علمی، تحقیقی اور عملی کام کیا ہے اور وہ کیا ہوا کام ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے سامنے موجود ہے سیاست دور اندیشی اور فراست کا عالم یہ ہے کہ دینِ حق کی اقامت میں کافر حکومت اور نسلی مسلمانوں کی قومی حکومت کا تذکرہ کرتے ہوتے ۱۹۳۹ء میں وہ لکھتے ہیں۔

"وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا ہوگا۔ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم قومی حکومت ان پر سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی۔ اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمتہ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوئم)

اس بات کے پورے پندرہ سال بعد ایک مسلم قومی حکومت نے جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا تھا۔ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے کے لیے خود مولانا مودودی کو انتہائی ڈھٹائی جرأت اور بے باکی سے سزائے موت سنائی تین دن رات پھانسی کی کوٹھڑی میں بند رکھا اور پھر عوام کے شدید احتجاج اور داخلی اور خارجی دباؤ پر اس جرمِ بے گناہی کی سزائے موت کو عمر قید سے بدل دیا گیا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے تو کیا یہ اس نورِ فراست کا بہترین نمونہ نہیں ہے۔

مولانا مودودی ایک مدبر ہیں۔ تقسیم ملک سے بہت پہلے مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے ایک اجلاس منعقدہ مدارس میں کہا۔

"رفیقو اور دوستو! اس وقت ہم ہندوستان کی تاریخ کے ایک بہت نازک اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ اور یہ مرحلہ جس طرح ہندوستان کی قسمت کے لئے فیصلہ کن ہے۔ اسی طرح ہماری اس تحریک کے لئے بھی فیصلہ کن ہے، جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے الگ الگ مل جائیں گے۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پوری طرح خود مختار ہوں گے۔ اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اسٹیٹ کا نظام چلائیں گے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا ہو گا۔ جہاں تک مسلم علاقے کا تعلق ہے۔ اس بارے میں یہاں بحث نہ کروں گا۔ کیونکہ اس کے لئے موزوں مقام شمالی مغربی حلقہ کا اجتماع ہے۔ جو عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ کے سامنے مجھے صرف ہندوستان کے مستقبل پر گفتگو کرنی ہے۔ کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آئندہ کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اور ان حالات میں آپ کو کس طرح کام کرنا ہو گا۔"

اس کے بعد مولانا نے تفصیل سے ان اجتماعی حالات کا ذکر کیا ہے جو آزادی کے بعد ہندوستان میں آج تک مسلمانوں کے ساتھ خصوصی طور پر پیش آتے رہے ہیں اور آرہے ہیں اور جس رخ پر ہندوستان جا رہا ہے۔ اس کی نشان دہی آج سے ۱۷ سال پہلے صحیح صحیح کر دی۔ پھر وہاں کی تحریک اسلامی کے

سامنے جو کام کا نقشہ رکھا وہ یہ تھا۔

● قومی کشمکش کا خاتمہ کرا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برپا ہے تاآنکہ مسلمانوں کا وعوتی وجود مشخص ہو جائے

● مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا علم پھیلائیں ماور ان میں دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کردیں۔ اور ان کی اخلاقی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کریں کہ ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کو خود اپنی سوسائٹی کی بہ نسبت ان کی سوسائٹی صریحاً بہتر محسوس ہونے لگے۔

● ملک کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنی اس دعوت کے لئے فراہم کریں۔

● ہندوستان کی مختلف زبانوں کو سیکھا جائے۔ ان میں تقریر و تحریر کی صلاحیت پیدا کی جائے اور ان میں جلدی سے جلدی اسلامی لٹریچر کا ضروری حصہ منتقل کیا جائے۔

آج پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی ہندوستان کی تحریک اسلامی انہیں چار بنیادی خطوط پر اپنے کام کو پھیلا رہی ہے۔ اور مسلم معاشرے میں ان کے اعتماد کا یہ حال ہو چکا ہے کہ جبل پور کے فسادات میں مسلم مظلومین کی امداد کے لئے جماعت اسلامی ہند نے جو خدمت خلق کا پروگرام بنایا تو اس کے لئے نہایت قلیل وقفے میں ہندوستان کے غریب مسلمانوں نے ۵ لاکھ سے زائد رقم جمع کردی اس کے لئے جو کام جماعت نے کیا ہے اسے ہر طرف سے پسند کیا گیا ہے۔ اور وہاں جماعت بتدریج اپنے اس کام کو پھیلا رہی ہے

جس سے مسلمانوں کا دعوتی وجود بلا تعصب مذہب و ملت مشخص ہو کر ہندوستان کے عوام کے سامنے آ سکے۔

خطابت کا یہ عالم ہے۔

——— یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لئے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لئے نہیں اتری ہے۔ ہوا کے رخ اڑ جانے والے خس و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لئے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادر شیروں کے لئے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں۔ جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں۔ جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں۔ اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رخ اس راستے سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس پلٹے ہوئے رخ پر بہنے کے لئے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ تو اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا۔ کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پروا نہ ہوگی۔ وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ اگر دریا کی

روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں۔ اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی کنارے پر پھینک دیں تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔"

اور مولانا مودودی کے نزدیک یہ باتیں صرف زورِ خطابت میں کہنے اور ابھارنے کے لئے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ خود عمل کرنے کے لئے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ ربع صدی سے وہ دریائے جاہلیت کے خلاف جس پامردی سے لڑ رہے ہیں۔ اور اس کا رُخ پھیرنے کے لئے وسیع تدابیرِ عمل میں لا رہے ہیں۔ ان سے کوئی شخص بھی اب ناواقف نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اسی عملی جدوجہد میں کھپائی ہے۔ سیاہ بال سفید کئے ہیں لیکن ان کی ہمت و جراءت کا یہ حال ہے۔ کہ سخت مایوس کن حالات میں بھی اگر ان کی صحبت میں آدمی جاکر تھوڑی دیر بیٹھ آئے تو ہمت و جراءت اور قوّتِ عمل کا ایک وسیع ذخیرہ اور ولولہ اپنے سینے میں لے کر واپس آتا ہے۔ مایوسی۔ نامرادی۔ دل شکستگی اور افسردگی کا ان کے قریب کہیں گزر نہیں ہے۔ وہ اپنا سفینہ دربارِ حبیبؐ کی طرف کھیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس سے قطعی بے نیاز ہیں کہ مخالف لہروں کے تھپیڑے کتنے شدید اور طوفانوں کے جھکڑ کتنے جان لیوا ہیں۔ جب تک دینے والے مالک نے اپنی آخری امانت جان واپس نہیں لے لی ہے۔ مومن کو مالک کے بتلائے ہوئے راستے پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔

ایک مصلح کی حیثیت سے وہ اصلاح قوم میں ساری قوتیں لگانا ضروری سمجھتے ہیں اس سلسلے میں وہ اپنی قوم کے علماء و مشائخ کو خصوصی طور پر توجہ دلاتے ہیں اور خدا کی پکڑ سے ڈراتے ہیں۔

"—— ظالم جفاکار اور عیش پسند امراء اور ایسے امراء کی خوشامدیں کرنے والے علماء و مشائخ کا تو خیر کہنا ہی کیا ان کا جو حشر خدا کے ہاں ہوگا اس کے ذکر کی حاجت ہی نہیں لیکن جو امراء اور علماء و مشائخ اپنے محلوں اور اپنے گھروں اور اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی داد دے رہے ہیں، وہ بھی خدا کے ہاں جوابدہی سے بچ نہیں سکتے کیونکہ جب ان کی قوم پر ہر طرف سے گمراہی اور بداخلاقی کے طوفان امڈے چلے آ رہے ہوں تو ان کا یہ کام نہیں ہے۔ کہ گوشوں میں سر جھکائے بیٹھے رہیں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ مرد میدان بن کر نکلیں اور جو کچھ زور اور اثر اللہ نے ان کو عطا کیا ہے۔ اس کو کام میں لا کر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ طوفان کو دور کرنے کی ذمہ داری بلاشبہ ان پر نہیں مگر اس کے مقابلے میں اپنی پوری امکانی قوت صرف کر دینے کی ذمہ داری تو یقیناً ان پر ہے۔ اگر وہ اس میں دریغ کریں گے تو ان کی عبادت و ریاضت اور شخصی پرہیزگاری ان کو یوم الفصل کی جوابدہی سے بری نہ کر دے گی، آپ محکمہ صفائی کے اس افسر کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے جس کا حال یہ ہو کہ شہر میں وبا پھیل رہی ہو اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہوں۔ مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی تدابیر کر رہا ہو۔ عام شہری اگر ایسا کریں تو چنداں قابلِ اعتراض نہیں لیکن محکمہ صفائی کا افسر ایسا کرے

تو اس کے مجرم ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ محاربہ اشتراکی ڈکٹیٹرشپ کے سخت ناقد ہیں۔ اور اسے انسانیت کے لئے سخت خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ روس میں اشتراکی تجربے اور انسانیت پر جبر و ظلم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"_____ جب کوئی کارکن اپنے گھر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔ دوسرے دن وہ اس کی ضرورت کی چیزیں آپ ہی آپ پولیس کے دفتر میں پہنچانی شروع کر دیتی ہے اور ان کا قبول کر لیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کا قیاس صحیح تھا۔ وہ کوئی سوال کرے تو دفتر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ یہ ہے وہ قیمت جو وہ دست کی روٹی اور برے وقت کی دستگیری کے لئے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے لیکن کیا انسانیت کے لئے معدوقت کی روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے، کہ ساری ئدئے زمین ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈز اس کے جیلر اور وارڈر ہوں۔"

مولانا مودودی ایک مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔ ایک ایسے مجاہد جن کی ساری عمر کفر و ضلالت و جاہلیت کی تاریکیوں اور طاغوت کے ظلم و تشدد اور قہرمانی کے خلاف جہاد کرتے گزر گئی ہے۔ نظام اسلام کے قیام کے لئے وہ جس نوعیت کے مجاہدین کا گروہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں اس کا معیار یہ ہے۔

"_____ جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش بغیر کسی دھن دولت کے

لالچ بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنا کے محض خدا کی خاطر دنیا کو فتنہ سے پاک کرنے کے لئے اور اس ظلم کو دور کر کے اس کی جگہ عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال۔ اپنی تجارت کے فوائد اپنے بال بچوں اور ماں باپ بھائیوں کی محبت اور اپنے گھربار کے عیش و آرام سب کو قربان کر دے۔ اس سے زیادہ اللہ کی محبت اور اللہ کی رضامندی کا مستحق کون ہو سکتا ہے۔ اور کیلئے کامرانی کی آغوش اس کے سوا اور کس کے لئے کھل سکتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی یہی فضیلت ہے جس کی بنا پر اسے تمام انسانی اعمال میں ایمان باللہ کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا گیا ہے"۔

اس معیار پر اور کوئی پورا اترے یا نہ اترے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اپنے ساری زندگی کی گواہی اس معیار پر پیش کر دی ہے۔

مولانا مودودی کی ایک بڑی خصوصیت ان کا انتہائی شریفانہ کردار ہے وہ نہایت کے شریف انسان ہیں۔ ان کا اپنے مخالفوں کے ساتھ طرزِ عمل بھی اتنا شریفانہ رہا ہے کہ اس بات کے خود ان کے مخالف بھی معترف ہیں۔ انہوں نے اپنی طویل ملک لائف میں گالیاں کھائی تو بہت ہیں۔ لیکن دی کسی کو نہیں؛ الزامات ان پر لگائے تو بہت گئے ہیں لیکن انہوں نے کسی پر کبھی کوئی جوابی الزام نہیں لگایا۔ ان کو بے شمار دکھ دیئے گئے ہیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے قول و فعل سے کسی کو دکھ نہیں دیا۔ گالیوں کے مقابلے میں صبر و تحمل۔ زیادتیوں کے مقابلے میں حلم اور غنڈہ گردی کے مقابلے میں شرافت و عالی ظرفی یہ مولانا مودودی کا طرۂ امتیاز ہے۔ جس سے ان کے شریف النفس مخالفین متاثر ہوتے

اور کمینہ فطرت مخالفین خم ٹھونکتے ہیں۔ وہ ہر شخص کے ساتھ انتہائی شریفانہ طرزِ عمل اپنی آخری حد تک نبھاتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص کسی حد کو پھاندے بغیر نہ چھوڑے۔ تو خاموشی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ الزامی طرزِ عمل۔ جوش بلا ہوش کا طریقہ کار، اشتعالی انداز اور غیر شائستہ رنگ ڈھنگ کی ان کے ہاں کھپت نہیں ہے۔ وہ کسی سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ تو انتہائی شرافت۔ سلیقہ اور مہذب طریقے سے۔ عقلی استدلال اور معقول دلائل سے۔ اور دوسرے کے حقِ اظہار و بیان اور اختلاف کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس دور کے سیاسی اور علمی میدان میں ان سے زیادہ شریف النفس انسان دور دور تک کہیں نہیں پایا جاتا۔

ان کے مزاج کی ایک اور خصوصیت حق کا بے باکانہ اظہار ہے۔ اظہارِ حق میں وہ کسی مداہنت۔ کسی مصلحت۔ کسی خوف۔ ڈر۔ لالچ یا دھن دھونس۔ اور دھمکی کی پرواہ نہیں کرتے۔ حق اگر ان کے کسی عزیز ترین دوست کے خلاف پڑتا ہو تو وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے اور اگر سلطانِ جابر کے خلاف جاتا ہو تو وہ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔

نیا عائلی قانون جو چند الٹرا خواتین اور مغرب پرست افراد پر مشتمل کمیشن کی دی ہوئی سفارشات پر مشتمل ہے۔ جب حکومت نے جبر و تشدد سے عوام کے احتجاج و اضطراب کے باوجود نافذ کرنا چاہا اور حکومت کی نازک مزاجی شدت اور ذکاوتِ حس کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کسی نے پرائیویٹ گفتگو میں بھی اس پر مخالفانہ اظہارِ رائے کیا تو اسے بھی پولیس اور سی، آئی ڈی کے ذریعے دھمکانے

کی کوشش کی گئی۔ تمام فرقوں کے علماء نے ایک مشترکہ بیان اس پر تنقید کرتے ہوئے دیا تو سرکاری افسران اطلاعات کی معرفت اخبارات کو ہدایت کی گئی کہ کوئی اس بیان کو شائع نہ کرے۔ اس بیان کو ہینڈ بل یا پمفلٹ کی صورت میں چھپنے سے روکنے کے لئے پریسوں کو سخت ہدایات دی گئیں جس کے سبب کوئی پریس اسے کاروباری نقصان کے خطرے سے چھاپنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کسی خطیب نے اگر اس پر کچھ خطبہ جمعہ میں کہہ دیا تو اسے بلا کر تنبیہہ کی گئی کہ آئندہ وہ اس قرآنی حکم کو بیان کرنے کی جرأت نہ کرے۔ ایک صاحب نے لاہور میں وہ بیان پمفلٹ کی صورت میں چھاپا تو اسے ایک سال کی سزا بلا دلیل و اپیل سنا کر جیل پہنچا دیا گیا۔ نفاذ کی تاریخ پر اس کے امکانی مخالفین کو پولیس کے گرگوں نے جا بجا یہ بات پہنچانے کی کوشش کی کہ اگر انہوں نے اس پر اظہارِ اختلاف کیا تو ان کے وارنٹ گرفتاری تیار رکھے ہیں —— ایسے حالات میں مولانا مودودی نے اس فرمان پر بار بار تبصرہ کیا اور اس کی مطلق پرواہ نہ کی کہ شاہی پیشانی پر کتنے بل پڑ جائیں گے انہوں نے خدا کے ایک فرمان کی خلاف ورزی ہوتے دیکھ کر ہر قسم کے فرمان کو بالائے طاق رکھ کر اظہارِ حق کر دیا اور کہہ دیا کہ۔

"—— اس عائلی قانون سے اختلافات کا اظہار ہرگز کوئی سیاسی کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ سراسر ایک مذہبی کام ہے۔ ہم اسے قرآن کے صریح احکام کے خلاف پاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر قرآن بھی ہمارا مذہب نہ ہو تو پھر کسی معاملے کو بھی ہمارا مذہبی معاملہ نہیں کہا جا سکتا۔ میں یہ اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ یہ قانون قرآن اور سنت کے خلاف ہے۔ اور ہم کو جب بھی موقعہ

ملے گا ہم اسے بدلوا کر رہیں گے۔"

انہوں نے حق کے اظہار میں عمر بھر میں کبھی ایک بار بھی مداہنت کو قریب نہیں آنے دیا۔ سزائے موت کے مقدمے میں ان کا وکیل مولانا کے ایک بیان کا خاص مفہوم عدالت میں پیش کرتا تھا جس کے سبب وہ قانونی راستہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مولانا نے اس سے اختلاف کر کے صاف صاف خود کہہ دیا کہ میرا مدعا وہی ہے۔ جو لیا جا رہا ہے۔ میں اس میں ایک لفظ کا رد و بدل بھی نہیں کرنا چاہتا

ان کی ایک اور خصوصیت ان کے مزاج کی جمہوری افتاد ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے جمہوری ذہن کے آدمی ہیں۔ اپنی بات زبردستی کبھی کسی پر نہیں ٹھونستے۔ استدلال سے قائل کرتے اور عقل و دلائل سے اپنی بات کا وزن ثابت کرتے ہیں اور جب تک مخاطب مطمئن نہ ہو جائے وہ اپنی بات کو سمجھانے کے لئے معقول استدلال کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر مخاطب کی بات میں وزن پاتے ہیں تو اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ جس طرح وہ جماعت کے اندر ہمیشہ جمہوری روح کو بیدار رکھنے اور جمہوری شعور کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ ملکی معاملات میں بھی جمہوریت کے قائل ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہر بات عوام کی مرضی سے طے ہو ان پر کوئی بات زبردستی نہ ٹھونسی جائے۔

ان کے مزاج کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے۔ کہ وہ مخاطب کو رعب داب سے یا زبردستی کوئی بات منوانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہر معاملے میں ان کی اپروچ انتہائی معقول Rational ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں جن مخالفین سے

واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سے چاہے وہ قدیم طبقے سے تعلق رکھتے ہوں یا جدید سے وہ اپنے مسائل میں نہ دلیل کے قائل ہیں، نہ معقولیت کے اور نہ رائے عامہ کے احترام کے۔ قدیم طبقے کو تو خیر چھوڑیئے۔ وہ آزاد خیالی کا مدعی بھی نہیں ہیں لیکن جدید طبقہ میں جو لوگ اپنی عقلیت پرستی (Rationalism) اور آزاد خیالی (Liberalism) کا ڈھنڈورا پیٹتے پیٹتے نہیں تھکتے وہ بھی مولانا مودودی کے معاملے میں انتہائی غیر معقول (Irrational) اور تنگ ظرف (Narrow Minded) ثابت ہوئے ہیں۔ گذشتہ ۱۳ سالہ سیاسی جدوجہد میں مغرب پرست طبقہ جسے جمہور کا اعتماد یقیناً حاصل نہیں ہے۔ اور جس کا علم خود اسے بھی ہے۔ جو سوء اتفاق سے انگریز کے قرب کے سبب اس کی وراثت پا گیا ہے مولانا مودودی کے بارے میں جتنے تنگ ظرفانہ نامعقول اور جارحانہ طرز عمل کا اظہار کر چکا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس نے ایک بار بھی جہاں رائے عامہ معلوم کرنے کے لیئے عام انتخابات نہیں ہونے دیئے اور مولانا مودودی کو عوام کے اسلامی جذبات کا ترجمان جاننے کے باوجود ان کے ساتھ جس جس قدر مظالم اور زیادتیاں کیں، جھوٹے الزامات لگائے، جیلوں میں جھونکا اور جبر کی قوتوں کا بے دریغ استعمال کیا اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس طبقہ نے جیسا وقت دیکھا اسی کے مطابق عوام کی خواہشات کے علی الرغم کرسیوں کی چھینا جھپٹی میں ہاتھ رنگے اور ہاتھ مارے۔ وزارتیں توڑیں۔ اسمبلیاں برخاست کیں۔ دستور منسوخ کئے۔ مارشل لاء لگائے غرض ملک کے اندر نظم و ضبط اور امن و امان کو برباد کرنے کی کوئی تدبیر بھی بچا نہ رکھی اور اپنے ہر ظلم و زیادتی کا الزام عوام اور اسلامی عناصر پر رکھا۔ برسوں کے

بعد دستور بنایا۔ پھر خود ہی اس کی خلاف ورزی کی اور پھر خود ہی اسے توڑ دیا اور پھر کہہ دیا کہ وہ ناقابل عمل تھا۔ جمہوریت کو بار بار سیفٹی قوانین ظلم و جبر، زیادتیوں محلاتی سازشوں اور انتخابی دھاندلیوں سے خراب کیا۔ پھر خود ہی اسے اٹھا کر پھینک دیا اور کہہ دیا کہ عوام میں جمہوریت کا شعور ہی نہیں۔ غرض اس سب کچھ کے مقابلے میں مولانا مودودی انتہائی صبر و ضبط سے ہمیشہ جمہوری اصولوں کی شدت سے پابند رہے اور قوانین ملکی کا احترام کرتے چلے جاتے ہیں اور شائد مولانا کی یہی وہ کمزوری ہے جسے اربابِ اقتدار نے اپنے حق میں مفید پا کر ہر قسم کی دھاندلی کو روا رکھا ہوا ہے۔

مولانا مودودی کا علم ہمارے ملک میں روشنی کا مینار ہے۔ وہ وقت کے جدید ترین تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور ان کی ضروریات کو احسن طریق سے پورا کر سکتے ہیں۔ وہ مذہب کے اصولوں کو جدید حالات میں زندگی کے عملی مسائل پر منطبق کرنے کی بہترین صلاحیت اور خداداد استعداد رکھتے ہیں اور اپنی تصانیف میں بیشتر جدید مسائل کا اسلامی حل پیش کر چکے ہیں پھر بھی جو لوگ بار بار زور سے کہتے رہتے ہیں کہ اسلام کو آج تک کسی نے جدید تقاضوں کی روشنی میں پیش نہیں کیا اور جب تک اس میں جدید تقاضوں کی گنجائش پیدا نہ کی جائے گی مذہب اسلام چل نہیں سکتا وہ دراصل اپنی کم علمی اور ناواقفیت کا اظہار کرتے رہتے ہیں یا پھر وہ حقیقتاً مغربی تہذیب پر اسلام کا لیبل لگا کر ہی اسے قبول کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے مولانا مودودی کے پاس ایک پرعزیمت اظہارِ حق اور اس پر استقامت کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہے۔

مولانا مودودی کی شخصیت ایک نہایت وسیع الاطراف شخصیت ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ اسے کسی ایک مجموعے میں سمیٹ سکے تو یہ بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے بڑے علم۔ بڑے مطالعہ اور بڑے زوردار قلم کی ضرورت ہے شاید اسے ان صفحات میں مولانا مودودی کی اک جھلک ہی ہونا چاہیئے اس لئے میرے لئے یہ سعی لاحاصل ہے البتہ اسکی ضرورت بڑی شدید ہے کہ مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو کتابچوں کی صورت میں مختلف لکھنے والے مرتب کریں تاکہ اس قوسِ قزح کے سارے رنگ علیحدہ علیحدہ دیکھے جا سکیں امید ہے کہ مولانا مودودی سے زیادہ قربت رکھنے اور قریبی مطالعہ کرنے والے اہل قلم اس طرف ضرور توجہ کریں گے۔ یہ بھی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ شخصیتیں انسانوں کو متاثر ([illegible]) کرتی ہیں اور اعلیٰ کردار کا جادو وہ ہے جو ہمیشہ سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور جس کے وزن کو ہر معاشرے نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ یہ وہ جادو ہے جو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا

میں نے اس کتاب میں مولانا مودودی کی سوانح نہیں لکھی ہے۔ آپ کو اس کتاب میں مولانا کے خاندان شجرۂ نسب یا دیگر ابتدائی حالات کہیں نظر نہ آئیں گے۔ میں نے اس میں مولانا کی شخصیت بھی پیش نہیں کی ہے۔ آپ کو کہیں اس میں مولانا کے داخلی مشاغل۔ ان کا ذوق و افتاد طبع۔ فارغ اوقات کی مصروفیات، بیوی بچوں کے درمیان کی زندگی اور ایسی ہی بیسیوں شخصی اور ذاتی خصوصیات کا کہیں نشان نہ ملے گا۔ مجھے دراصل اس مرحلے میں ان کی زندگی کے ان پہلوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ سب

ثانوی چیزیں ہیں جن پر مجھ سے بہت بہتر طور پر لکھنے والے دوسرے بہت سے حضرات موجود ہیں سب کچھ تو ان کی دعوتی زندگی اور اس کی مختلف جھلکیوں اور حیثیتوں سے بحث ہے۔ وہ ایک با مقصد آدمی ہیں تو ان کا مقصدِ زندگی کیا ہے وہ کس لیلائے مقصد کے عاشق ہیں۔ اس عشق میں ان کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اس کے لئے انہوں نے کیا کیا داد دی، کیسی کیسی گھاٹیاں اور کیسے کیسے دشوار گزار راستے طے کئے ہیں۔ اس عاشق کے لئے کیسے کیسے دار و رسن کے جھولے نصب کئے گئے ہیں جن میں جھول جانے کے لئے ان کے قدموں میں ذرہ بھر بھی لغزش نہیں پائی گئی۔ اس راہِ عشق میں ان کا مقام کتنا بلند ہے۔ ان کے اس عشق کے چرچے کہاں کہاں تک پہنچے ہیں؟ اپنی اس آرزو کو لئے کہاں کہاں سے وہ گزرے ہیں۔ اپنی نظر میں وہ کیا ہیں دوسروں نے انہیں کیسا پایا ہے۔ حق کے عشق کی راہِ سلوک میں کہاں کہاں تک ان کا قدم پہنچا ہے۔ جنہوں نے ان کو آزمایا ہے انہوں نے انہیں کیسا پایا ہے۔ ان کے علم و ادب کا چمن کتنا سرسبز ہے اور اس میں کیسے کیسے تر و تازہ اثمار ہیں جو انسان کے قلب کو مسرور اور روح کو سرشار کرتے ہیں۔

بس اس کتاب میں میرا یہی موضوع رہا ہے۔ شاید اس موضوع کے علاوہ مولانا کے بارے میں مجھ میں کسی دوسرے موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت بھی نہ تھی یہ داری بھی مجھے ایسی دشوار گزار محسوس ہوتی ہے کہ بڑی مشکلوں سے قدم قدم چل کر اسے عبور کیا ہے۔ اب اگر کسی کو کچھ ملے یا نہ ملے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قلمی اور ذہنی سفر میں میں نے بہت کچھ پایا ہے۔ اور جو کچھ پایا ہے اس کا نہایت ادھورا حصہ خلق خدا کی تواضع کے لئے اس کے سامنے رکھ دیا ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

سرگودھا

اسعد گیلانی

(۳)

ایک قلمی خاکہ

کسی شخصیت کے تعارف میں اس کی تصویر بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تصویر کی ضرورت کے لئے انسان کے دو جذبے اس کا تقاضا کرتے ہیں پہلا جذبہ تو یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا تعارف کرایا جارہا ہے۔ اس کی صورت دیکھنے کو خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا ہے۔ اس کا چہرہ کیسا ہے لباس کیسا ہے۔ خدوخال کیسے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ اور اس تقاضے کو معدوم کرنا بڑا مشکل ہے۔ دوسرا جذبہ اس شخصیت کے چہرے مہرے خدوخال تراش خراش اور ساخت پرداخت سے اس کی داخلی کیفیات اور شخصیت کے وزن کا اندازہ لگانے کا ہوتا ہے۔ انسان دوسرے کی شخصیت کو نظروں سے تولتا اور وزن مقرر کرتا ہے۔ اس کے بارے میں از خود ایک رائے قائم کرتا اور حسن و قبیح اور شخصیت کی اچھائی برائی کے بارے میں اپنے تول سے خود ایک فیصلہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مردم شناس لوگ دوسروں کے چہرے دیکھ کر بتا دیتے ہیں۔ کہ یہ بھلا آدمی ہے۔ یہ شریر آدمی ہے۔ یہ خدا ترس آدمی ہے۔ یہ دلیر آدمی ہے۔ یہ بزدل آدمی ہے اور آدمیوں کی اقسام عموماً لوگوں کو دیکھ کر پہلے متعین کرتے اور بعد میں واقعات کی تائید و تصدیق سے اپنی رائے قائم رکھتے یا بدلتے ہیں۔

مولانا مودودی تصویر کے قائل نہیں اس لئے میں یہاں ایک قلمی خاکہ پیش کر رہا ہوں۔

چہرہ مہرہ:-

پہلی نظر میں مولانا مودودی ایک شریف، کم گو اور متین آدمی نظر آتے ہیں جن کے چہرے پر ذہانت نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ پُر عزم دہانہ اور بامروت آنکھیں۔ قدیم بزرگوں کی سی شان۔ گول چہرہ جو خاصی مشرع داڑھی کے باوجود گولائی لیئے ہوئے ہے۔ پیشانی کشادہ جس میں سفیدی اور سُرخی کی جھلک ہے۔ ابرو گھنے اور خمدار، رنگ گورا جو سُرخی لیئے ہوئے ہے۔ اگرچہ مسلسل محنت اور بیماری نے اسے بہت ہلکا کر دیا ہے ہونٹ موٹے خدوخال۔ عینکیں بالعموم دو استعمال کرتے ہیں۔ ایک دور کی نظر کے لیئے دوسری لکھنے پڑھنے کے لیئے جو تقریر کرتے وقت یا عموماً سامعین کی طرف دیکھنے اور تقریر کے نوٹس دیکھنے کے لیئے بدلتے ہیں۔ ناک ذرا چھوٹی اور موٹی ہے۔ رخسار ہموار اور ہلکے ذرا نیچے کی طرف ڈھلکتے ہوئے۔ دہانہ فراخ اور کشادہ ہے۔ دانت چند ایک مصنوعی لگے ہوئے ہیں۔ جو نئے ملاقاتی کو محسوس نہیں ہوتے۔ دانتوں اور مسوڑھوں پر پان کھانے کے نہایت خفیف سے اثرات بھی نظر آتے ہیں

داڑھی مشرع۔ کم از کم ڈیڑھ مٹھی جو چہرے پر موزوں معلوم ہوتی ہے۔ سلیقے سے ترشی ہوئی۔ بالکل سفید۔ پاکستان بننے پر داڑھی کا غالب حصہ سیاہ تھا لیکن اب بالکل سفید ہو چکی ہے۔ گھنے اور بھرپور گنجان بال۔ سر بڑا اور گولائی لیئے ہوئے ہے۔ بال سیدھے اور باریک اور سر پر بیٹھے

ڈیل ڈول:-

جسم گٹھا ہوا جیسے ورزشی ہو۔ بھاری تو نہیں ہے لیکن مائل بہ فربہی ہے پیٹ کچھ کچھ خفیف سا نکلا ہوا۔ قد لمبا نہیں ہے لیکن کچھ زیادہ ٹھگنا بھی نہیں درمیانہ لیئے

جسم تروتازہ ہے اور جسم دیکھنے سے دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے دیکھنے میں پُرعزم اور پختہ مزاج آدمی نظر آتے ہیں۔ کندھے کشادہ لیکن خفیف سے آگے کی طرف جُھکے ہوئے، فروتنی کا سا انداز۔ ہاتھ پاؤں مضبوط۔ آواز میں جذبۂ رفاقت و مروّت۔ آہستہ آہستہ۔ ٹھہر ٹھہر کر بولنے کی عادت۔

لباس:-

گھر سے باہر، سر پر اونچی دیوار کی ٹوپی۔ کبھی سیاہ کبھی سلیٹی لمبے دامن کی حیدرآبادی فیشن کی شیروانی۔ تنگ مُہری کا علی گڑھ پاجامہ اور بلا تسمے جوتے جو بالعموم سیاہ پمپ ہوتے ہیں۔ تسمے والے جوتے ایک نمازی کے لئے بار بار وضو میں جس طرح مخل ہوتے ہیں۔ غالبًا اسی لئے انہیں ترک کر دیا ہے۔ گھر میں دلّی طرز کا کُھلے پانچوں کا سفید پاجامہ اور اس پر بالعموم گرمیوں میں سفید کھلی آستینوں کا ململ کا کرتہ اور سردیوں میں سفید بلا کالر کی قمیص۔ اس پر سویٹر اکثر براؤن رنگ کا ہوتا ہے۔ لنگی پہنے ہوئے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ غالبًا اسے غیر ساتر سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔ ویسے بھی دلّی کے شرفاء کی تہذیب میں لنگی کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ لباس میں اسلامی وضع کے شدت سے قائل ہیں اور غیر قوموں کے ملبوسات کو استعمال کرنا ذہنی غلامی کی دلیل سمجھتے ہیں۔ ایک مستقل وضع کے مالک، اور ٹھوس اسلامی اور قومی طرزِ لباس کے قول و فعل سے قائل اور پابند ہیں۔ دوسری قوموں کے وہ ملبوسات جو شرعًا مباح کے دائرے میں آتے ہیں۔ انہیں بھی ان کے لیے جائز تو لیکن اپنے لئے غیر موزوں سمجھتے ہیں کہ اس سے کسی قوم میں احساس کہتری پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔

چال ڈھال | کندھے خفیف سے آگے کی طرف جھکا کر تیز رفتاری سے

چلتے ہیں۔ جس سے کبر و تکبر کی بجائے فروتنی اور حقیقی عجز و بندگی نمایاں ہوتا ہے خصوصاً جب نماز میں کھڑے ہوں تو یہ عجز اور فروتنی جسم پر لباس کی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے چلتے ہوئے مجمع میں اکڑ کر چلنے یا نمایاں ہونے کا مطلق انداز نہیں ہوتا بلکہ بے تکلف احباب کے اندر جیسے کوئی سنجیدہ متین لیکن شگفتہ مزاج، بے تکلف بزرگ، رفیق چلا جارہا ہوتا ہے۔ ہٹو بچو یا پیری و بزرگی یا حضرت جی اور شاہ صاحب کا سا انداز نہیں ہوتا بلکہ حلقۂ احباب میں ایک بزرگ دوست کا انداز ہوتا ہے۔

بات چیت ہمیشہ ٹھہر ٹھہر کر کرنے کے عادی ہیں، لہجہ نمایاں لیکن دھیمہ۔ تقریر کرتے ہوئے احساسِ ذمہ داری سے چہرہ سامعین کی طرف پوری طرح متوجہ اور چہرے کے انداز اور خدوخال سنجیدگی اور متانت کا پورا پورا احساس لئے ہوئے اتنی ٹھہر ٹھہر کر تقریر کرتے ہیں کہ تیز لکھنے والا پوری تقریر رواں خط میں لکھتا جائے چنانچہ میاں طفیل محمد صاحب جو عرصۂ دراز سے مولینا کے رفیقِ خاص ہیں، عموماً مولانا کی تقاریر معمولی فروگذاشتوں کے ساتھ پوری ہو بہو نوٹ کر لیتے ہیں۔ لہجہ اور تلفظ اتنا صاف ہوتا ہے کہ سامعین میں سے ہر ہر شخص اچھی طرح بات سمجھ لیتا ہے۔ پنجاب اور سرحد کے دیہاتی عوام جو اردو زبان سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ وہ بھی بات پوری طرح پالیتے اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ تقریر کے دوران صرف چند ایک مقامات پر کبھی کبھی لہجے میں ہلکا سا جوش پیدا ہوتا ہے۔ جس کا سامعین پر کئی گنا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ پرجوش تقریروں کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے پبلک زندگی میں ہمیشہ استدلال اور افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جذبات ابھارنے اور بھڑکانے سے ہمیشہ اجتناب

کیا ہے۔ دشمنوں کے طعن و تشنیع اور الزام و بہتان کا جواب بھی اگر کبھی دیا تو ٹھنڈے استدلال اور افہام و تفہیم سے دیا۔ الزامی جواب ان کا موضوع نہیں ہے۔ فحش اور نفرت انگیز کلمات ان کی زبان سے کبھی نہیں سُنے گئے۔

مجلسی بات چیت میں بھی لہجہ ہمیشہ متین سنجیدہ اور باوقار ہوتا ہے البتہ گفتگو میں کبھی کبھی نہایت شُستہ مزاح کی پھلجھڑی سی پھوٹ جاتی ہے۔ جس سے مخاطب محظوظ ہوتا ہے لیکن مزاح میں کسی کی دل آزاری کبھی نہ مقصود ہوتی ہے۔ اور نہ ہوتی ہے۔ بلکہ اس کا انداز عموماً بات میں سے بات پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مزاح اور شگفتہ گوئی سے ان کی مجلس ہمیشہ شگفتہ رہتی ہے اور ایک غمگین آدمی بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنا غم بھول جاتا ہے۔ دوسری چیز جو آدمی کو ان کی مجلس میں حاصل ہوتی ہے وہ غمِ دنیا اور غمِ روزگار سے رہائی ہے۔ وقتی طور پر آدمی ہر قسم کے آلام و تفکرات سے بے نیاز ہو کر سکونِ قلب اور اطمینان ذہنی حاصل کر لیتا ہے۔ ہر قسم کے انسانی مسائل پوچھا ہے علمی تحقیق اور فلسفیانہ نوعیت کے ہوں یا معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یا مجلسی۔ مولانا کے پاس سوالات کے بہترین مدلل جوابات اور الجھاؤں کے لئے بہترین مشورے موجود ہوتے ہیں

گفتگو صاف ادبی پاکیزہ دلّی کی ڈھلی ہوئی اردو میں کرتے ہیں البتہ جدید طبقہ کے ذہن کے مطابق تسہیلِ فہم کے لئے مناسبتِ مضمون سے کہیں کہیں انگریزی کے اصطلاحی الفاظ بھی آجاتے ہیں۔ گفتگو میں استدلال کا انداز وہی ہوتا ہے جو ان کے مضامین میں پایا جاتا ہے۔ وہ کسی سوال یا مسئلے کا الزامی یا منفی جواب دیں گے اور مسائل کے ذہن کی مناسبت سے علمی استدلالی اور مثالی سے بات کو

سمجھانے اور واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر بات ضرورت سے زیادہ طول پکڑ جائے اور سائل اپنی رائے یا خیال پر بضد یا مصر ہو تو اسے نہایت شستگی اور سلیقے سے مزید سوچنے اور رائے قائم کرنے کا مشورہ دے کر بات ختم کر دیں گے
گفتگو کے دوران جا بجا مسکراہٹ شامل کلام رہتی ہے۔ خشک اور تلخ چہرے یا لب و لہجہ کے ساتھ میں نے ان کو کبھی بات کرتے نہیں دیکھا۔
اس سب کچھ کے باوجود مولانا مودودی ایک خاموش طبع آدمی ہیں جب کوئی بات موضوع بحث نہ ہو تو وہ خواہ مخواہ بات نہ چھیڑے رکھیں گے بلکہ خاموش بیٹھ جائیں گے۔ لیکن ایسی طویل خاموشی نہیں جو مجلس کو بوجھل بنا دے۔
تقریر کرتے ہوئے کسی کسی وقت انگلی یا ہاتھ سے اشارہ بھی کرتے ہیں جس سے بات کی اشارے سے وضاحت مزید ہو جاتی ہے یا بات پر زور دینا ہو تو اس سے اشارہ مقصود ہوتا ہے ورنہ اسٹیج پر دوران تقریر بہت زیادہ نقل و حرکت کے قائل نہیں ہیں۔ واعظین کے رائج الوقت انداز وعظ سے ان کا انداز تقریر قطعی مختلف ہوتا ہے۔ وہ وعظ نہیں کرتے تقریر کرتے ہیں اور تقریر نہیں کرتے بلکہ مسلسل گفتگو کرتے ہیں جس میں یقین، اعتماد، توکل تفہیم، مخاطب سے ہمدردی اور استدلال کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ تقریر میں ادب کی چاشنی بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ اور بعض بعض جملے تو تاریخی یادگار بن جاتے ہیں۔ جیسے قرار داد مقاصد پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بار فرمایا۔ "ایک عجیب بارش جو برس گئی لیکن برسنے سے پہلے نہ گھٹا اٹھی اور نہ برسنے کے بعد کوئی روئید گی ہوئی۔"
زبان پر قدرت حاصل ہے۔ جس بات کو پھیلا کر بیان کریں گے۔ اس کے

تمام گوشے شرح وبسط سے سامنے آجائیں گے اور جسے اختصار سے بیان کریں گے اس میں قادر الکلامی کا جوہر ایسا نمایاں ہوگا کہ موضوع کے تمام گوشے بھی آجائیں گے۔ اہم استدلال کا رنگ بھی نمایاں ہوگا اور بات بھی مختصر ہوگی۔ اس کے کئی ایک نمونے موجود ہیں "الجہاد فی الاسلام" جو ۶۰۰ سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے اور "جہاد فی سبیل اللہ" جو ۴۸ صفحات کا ایک پمفلٹ ہے یا "اسلامی ریاست" جو کئی سو صفحات کی کتاب ہے اور "اسلام کا نظریۂ سیاسی" جو ایک مختصر پمفلٹ ہے یا پھر ان کی ریڈیائی تقاریر جو "اسلام کا نظامِ حیات" کے نام سے چھپ چکی ہیں مختصر اور جامع تحریر کے بہترین نمونے ہیں۔

لیڈروں میں تصنع اور بناوٹ کا کچھ نہ کچھ عنصر آہی جاتا ہے۔ یہ چیز مولانا کے ہاں قطعی نہیں پائی جاتی۔ جیسے بے تکلف وہ اپنی پرائیویٹ مجلس میں ہیں۔ ایسے ہی ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں جابجا پردے لٹکے ہوئے نظر نہیں آتے۔ حسنِ کلام اور سادہ بیانی ان کی خصوصیت ہے۔

تقریر:۔

اس موضوع پر اگرچہ پہلے ضروری باتیں آگئی ہیں۔ لیکن ایک خصوصی چیز مولینا کی ہر تقریر کے لئے مناسب تیاری ہے۔ تیاری کے بغیر مولینا حتی الامکان تقریر نہیں کرتے۔ ان کی تقریر کا موضوع متعین ہوتا ہے۔ اس پر مضمون سوچا سمجھا ہوتا ہے اس کے لئے کہی جانے والی باتوں کے مفصل اشارات نوٹ ہوتے ہیں۔ تقریر کو کہاں سے شروع ہونا اور کہاں ختم ہونا ہے۔ یہ سب باتیں پہلے سے طے ہوتی ہیں۔ بے ہنگم مسلسل بے انتہا اور لاطائل تقریر جس میں مقرر الفاظ کے جھوٹے میں لطائف

ظرافت اور قصہ کہانی بیان کرتا اور دائیں سے بائیں مارتا رہتا ہے۔ یہ چیز یہاں نہیں ہے۔ تقریر میں کوئی بات نہ ضرورت سے زائد بیان ہوتی ہے اور نہ کم۔ جب وہ بات کہہ دی جو کہنی تھی تو پھر بات آگے نہ چلے گی۔ مولانا اوقات کے سختی سے پابند ہیں۔ مقررہ وقت پر شروع کریں گے اور متعین وقت پر تقریر ختم کر دیں گے۔ دیر سے شروع کرنا اور پھر سامعین کو اضطراب میں رکھ کر مسلسل بولتے چلے جانا۔ مولانا اس کے قائل نہیں ہیں۔ مروج قسم کی واعظانہ طول طویل تقاریر اگر کوئی فن ہیں تو مولانا اس فن سے نابلد ہیں۔ اس لائن میں انہوں نے اپنے لئے خود ہی ایک فن ایجاد کیا ہے۔ وہ صاحب طرز مقرر ہیں اور یہ طرز ان سے اور بھی بہت سے لوگوں نے سیکھا ہے۔

تقریر میں عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں لیکن ایک خاص معیار سنجیدگی سے نیچے نہیں اترتے۔ عوامی تقریروں میں بھی وہ عامیانہ زبان نہیں بول سکتے۔ لیکن ان کی بات کو ان کی قوم کا ہر شخص سمجھ لیتا ہے۔ یہ بات وہ گذشتہ ۱۲-۱۳ سال کے عرصے میں ثابت کر چکے ہیں اور دستور جیسے مشکل سے مشکل موضوعات کو عوام کے فہم میں اتار چکے ہیں۔

موقعہ کی نزاکت کے پیش نظر بعض اوقات مولانا اپنی ہمت اور استعداد سے بڑھ کر بھی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ تھکے ہوئے جسم، خشک گلے اور مسلسل تکان کے باوجود جس چیز کو اتمام حجت کے طور پر پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے اپنے جسم کی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ ان کی بعض خاص خاص مواقع کی تقاریر اس پر شاہد ہیں مثلاً ان کی ایک تقریر جو انہوں نے تقسیم سے قبل "دارالسلام کے

ایک اجتماع میں کی جب مولانا سخت بیمار تھے۔ پتھری کا اپریشن کروانے والے تھے اور وہ اپنے رفقاء کے سامنے "ایمان، اسلام، تقوےٰ اور احسان" کی صحیح صحیح تشریح کر کے مومنین کی زندگی میں ان کا مقام متعین کر دینا چاہتے تھے۔ اس تقریر میں ایک عجیب پرسوز الوداعی رنگ ہے اور تربیت اخلاق کی بہترین تقاریر میں سے ہے۔ جو اب "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ یا جب جماعت کے اندر ایک نظریاتی اختلاف کے سبب بحران سا اٹھا اور اس کو سلجھانے کے لئے ایک آل پاکستان اجتماع بلایا گیا جس میں مولانا نے غالباً اپنی زندگی کی طویل ترین تقریر ۶ گھنٹے تک دو تین نشستوں میں کی اور اس میں جماعت کے نصب العین۔ طریق کار۔ تاریخ۔ روایات اور لٹریچر کی روشنی میں جماعت کے آئندہ لائحہ عمل کی وضاحت کی یہ ایک سخت ترین جانی اور ذہنی مشقت تھی جو انہوں نے اپنے چند رفقاء کو سمجھانے کیلئے برداشت کی۔ پھر وہ مارشل لا والی رات کی تقریر بھی ایسی ہی تقریر تھی جو انہوں نے موچی دروازے میں کی تھی جس میں ملک کی پوری گندی سیاست پر تبصرہ تھا اور آئندہ جمہوریت کے لئے آنے والے خطرات کی نشاندہی تھی چنانچہ وہ خطرات اسی رات امنڈ پڑے تھے

احباب کا دل موہ لینے کی خوبی بھی مولانا کو خدا نے وافر عطا فرمائی ہے ترش کلامی ان سے بالکل بعید ہے۔ اپنے حلقۂ جماعت میں بھی انہوں نے شدید سے شدید تنقیدیں ہمیشہ ٹھنڈے دل و دماغ اور کشادہ پیشانی سے سنیں اور مخاطب کو کبھی خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔ جماعت کے اندر پالیسی اور لائحہ عمل کے موضوع پر جو شدید اختلاف رائے ہوا تھا اس

میں دوسری رائے رکھنے والے بعض حضرات نے جس طرح ذاتی اور شخصی طور پر بھی دکھ دینے والی باتیں مولانا پر چھانٹیں۔ یہ ان کا ہی دل گردہ تھا کہ اس کی ہوا تک انہوں نے نہیں نکالی اور سب کچھ سہہ گئے اور اس کے باوجود کہ مخالف رائے رکھنے والے حضرات دو فیصد بھی نہ تھے لیکن ان کو مطمئن کرنے کے لئے مولانا نے ان کے ہر ہر سوال اور اعتراض کا جواب دیا۔ چند افراد کے اطمینان کی خاطر پوری جماعت کو کتنی مدت تک ایک جگہ بیٹھائے رکھا اور مجلس مذاکرہ سی قائم رکھی اور اس سارے دوران میں مولانا کا طرز عمل خالص عقلی، استدلالی اور جمہوری رہا۔

تقریر میں مولانا مثالیں دینے کا ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ ہر مثال معہود اور حالات پر اس طرح منطبق ہو جاتی ہے کہ سننے والا نہ صرف قائل ہوتا ہے بلکہ لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ مولانا کے استدلال میں مخاطب کے لئے "یہ تو میرے دل میں تھا" کا سا انداز ہوتا ہے اور مخاطب محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل کی بات کہہ دی گئی ہے۔ اور اگر وہ خود یہ بات کہتا تو شائد یوں نہی کہتا۔

عام حالات:۔

مولانا اپنے ملنے جلنے والوں کو خاصا وقت دیتے ہیں۔ اگرچہ ملنے والوں کا ایک سلسلہ قائم رہتا ہے جن میں ہر ہر قسم کے ملاقاتی آتے ہیں۔ حکمران طبقے کے سوا ہر طبقہ کا آدمی مولانا سے ملنے آتا ہے۔ دیہاتی جو دور دور سے آتے ہیں، شہری، جدید، قدیم، علماء فضلاء، یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ

جنہیں اپنے مختلف موضوعات پر مولانا سے سوالات کرنے اور مواد لینا ہوتا ہے اخبار نویس اور دور و نزدیک کے احباب اور معتقدین ریٹائرڈ سرکاری افسران۔ سیاسی لیڈر، غیر ملکی جو تحقیقِ حال کی خاطر آتے ہیں۔ ان سب کو مولانا ملاقات کا وقت دیتے ہیں۔ بعض اوقات ملاقاتی ان کے لکھنے پڑھنے اور آرام کرنے کا وقت بھی لے جاتے ہیں۔ دور سے آنے والوں کے لئے بعض اوقات اپنے آرام کے دوران بھی باہر نکل آتے ہیں۔ ویسے نمازِ عصر سے عشاء تک بالعموم دفتر ترجمان القرآن کے صحن میں کھلی مجلس ہوتی ہے جس میں ہر قسم کے ملاقاتی متفرق نوعیت کے سوالات پوچھتے اور گفتگو کرتے رہتے ہیں اور مولانا سب کی باتوں کا جواب دیتے ہیں۔

احباب کی عیادت کے لئے جانا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی دعوتوں میں شوق سے شریک ہونا اور ان کی مشکلات میں مفید مشورے اور مدد دینا مولانا کا روزمرہ کا معمول ہے۔ آدمی سے اس کے مرتبہ کے مطابق تواضع سے پیش آتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ہم جیسے معمولی آدمیوں کا بھی اس فروتنی سے کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہیں کہ آدمی ان کی بلند اخلاقی اور اپنی کم مائگی پر نادم سا ہو جاتا ہے۔

گھر میں میں نے ان کو مکان کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے بھی دیکھا ہے۔ بجلی کا فیوز اڑ گیا تو اسے درست کر دیتے ہیں گھڑی رک گئی تو اسے کھول کر معمولی خرابی دور کر لی۔ کتابیں سلیقہ سے رکھ لیں۔ کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع ان کے ارد گرد دور دور تک نہیں پایا جاتا۔ آج تک انہوں نے اپنے لئے کوئی

جائداد بنائی ہے اور نہ کوئی مکان تعمیر کیا ہے۔

کھانے پینے کا ذوق صاف ستھرا ہے مذاق دہلوی ہے اور دہلوی طرز کے کھانے ہی زیادہ پسند کرتے ہیں لیکن ویسے جو مل جائے کھا لیتے ہیں۔ نہاری پسند ہے البتہ بکری کے گردے پسند نہیں ہیں جس کی وجہ غالباً گردوں کا تعلق پیشاب سے ہونا ہے پانی بہت ٹھنڈا استعمال کرتے ہیں اور فارسی کی مثل نانِ گرم اور آب خنک کے پوری طرح قائل ہیں۔ گرمیوں میں برف کا پانی کثرت سے استعمال کرتے ہیں جو اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ ہمارے لئے تو اس کا استعمال ہی مشکل ہوتا ہے مجلس میں یا کھانا کھاتے ہوئے عموماً آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں جس کی وجہ غالباً جسم کا بھاری پن ہے سفر میں عموماً سادہ لباس پہنتے ہیں۔ کھلا پاجامہ قمیص۔ ٹوپی اور کوئی سستا یا پرانا جوتا۔ عموماً سفر میں پاٹا کا ربڑ کا سستا جوتا پہنے ہوئے دیکھا گیا ہے سفر میں اپنا بستر ضرور ہمراہ رکھتے ہیں چاہے اس کے استعمال کی ضرورت پیش آئے یا نہ آئے۔ دوسرا لوٹا ہے جو لازماً ہمراہ ہوتا ہے۔ ایک بار مسکرا کر کہا کہ جواہر لال نہرو کے نزدیک ہماری تہذیب آخر اونچا پاجامہ اور لوٹے کے سوا کیا ہے۔ اس لئے انہیں کیسے ترک کیا جا سکتا ہے۔ سفر میں اگر دوسرے ساتھی بھی ہمراہ ہوں تو بالعموم اسی درجے میں سفر کرتے ہیں جس میں دوسرے سفر کر رہے ہوں۔ زیادہ اونچے درجے میں کسی خصوصی تکلیف یا ضرورت کے سوا سفر کرتے نہیں دیکھے گئے۔

مولانا کی حاضر جوابی اور شگفتہ مزاجی ان کے ملنے جلنے والوں کے لئے بڑی نعمت ہے۔ وہ مجلس کو کبھی بوجھل نہیں بننے دیتے۔ ان کے بیسیوں لطائف

جو حقیقتاً "کلمِ لطیف" کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو یاد ہیں۔ ہر تھوڑے وقفہ کے بعد مولانا کسی نہ کسی بات میں سے نہایت سادگی کے ساتھ مزاح کا کوئی ایسا پہلو پیدا کر لیتے ہیں جو پوری مجلس کو شگفتہ کر جاتا ہے مزاح دراصل مولینا کے ایک خاص اندازِ کلام کا ایک پہلو ہے جو وہ بات اور الفاظ کے اندر سے پیدا کر لیتے ہیں اسے بلند قہقہہ بار لطیفوں یا ضلع جگت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

مولانا کا خط نہایت پاکیزہ اور نفیس ذوقِ تحریر کا آئینہ دار ہے چھوٹے چھوٹے خوبصورت حروف۔ ہمیشہ پورے حروف لکھتے ہیں۔ شوشے۔ کامے۔ نکتے۔ زیر۔ زبر اور شد کا خاص اہتمام رکھتے ہیں۔ فن کتابت کے لحاظ سے بھی کبھی غلطیاں نہیں کرتے۔ حروف ایک سلیقے سے قطار اندر قطار چلے جاتے ہیں۔ سطریں سیدھی۔ پورے صفحہ پر کہیں کاٹ چھانٹ نہیں ہوتی جو ان کی راست فکری اور ذہنی یکسوئی پر دلالت کرتی ہے اور لکھا ہوا صفحہ بلا پڑھے خود بتا دیتا ہے کہ جس شخص نے لکھا ہے اس کا ذہن ہر قسم کے الجھاؤں سے صاف اور استدلال کے اعتبار سے محکم ہے۔ تصورات و جذبات میں کہیں جھول نہیں ہوتی تحریر اتنی پختہ ہے، کہ آج سے بیس برس پہلے کی لکھی ہوئی تحریر اور آج کی تحریر کے خط میں کوئی فرق نظر نہیں آتا جو محکم کردار اور راست فکری کی علامت ہے

مولانا کی نماز ایک خاص کیفیت کی حامل ہوتی ہے نماز میں کھڑے ہوئے بندگی کی پوری کیفیت ان کے بدن پر طاری ہوتی ہے، جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خفیف سا جھکا ہوا سر۔ دبے ہوئے کندھے سمٹا ہوا جسم۔ فروتنی کا ایک

مجسم نمونہ۔ قراءت کا لہجہ بڑا صاف سادہ اور مخصوص سوز و گداز کا حامل ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی ان کے پیچھے نیت باندھتے ہی اچانک ذہنی اور قلبی یکسوئی محسوس کرتا ہے۔ دل و دماغ سے سارے اضطراب و اندیشے اور تفکرات و خیالات دھل جاتے ہیں اور آدمی ہمہ تن اپنے مالک کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس چیز کو میں نے بارہا آزمایا ہے اور کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ مولٰنا کا قراءت کا لہجہ بھی خاص ہے۔ الفاظ ٹھہر ٹھہر کر سادہ طریق سے ادا ہوتے ہیں جن میں مروج قراءت کے پیچ و خم تو بالکل نہیں ہوتے۔ البتہ ہر آیت کا آخری لفظ ذرا کھینچ کر پڑھتے ہیں اور ہلکا سا توقف کر کے آگے چلتے ہیں۔ آواز بھی عجز و بندگی کا اظہار لئے ہوئے ہوتی ہے جس کے سبب مقتدی کا ذہن آواز۔ الفاظ اور ان کے معانی پر جم جاتا ہے اور ہر طرف کی پریشان خیالی سے سمٹ آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی مولٰینا کے پیچھے نماز پڑھی ہے اس کی کیفیت بہت دنوں تک یاد رہی ہے۔

بس یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے جو میں نے اپنے ذاتی مطالعے اور تاثرات و مشاہدات پر مبنی مرتب کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے مولٰینا کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس قلمی خاکے کے نقوش کی ضرور تائید کریں گے۔

(۴)

مولانا مودودی کا پیغام

"مسلمانوں کے نام میرا یہ پیغام ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ادا کریں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ صرف اتنا کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے خدا کو اور اس کے دین کو مان لیا۔ بلکہ جب آپ نے خدا کو اپنا خدا اور اس کے دین کو اپنا دین مانا ہے تو اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جن کا شعور آپ کو ہونا چاہیئے اور جن کے ادا کرنے کی آپ کو فکر ہونی چاہیئے۔ اگر آپ انہیں ادا نہ کریں گے تو اس کے وبال سے نہ دنیا میں چھوٹ سکیں گے اور نہ آخرت میں۔ وہ ذمہ داریاں کیا ہیں؟ وہ صرف یہی نہیں ہے کہ آپ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کریں اور زکوٰۃ دیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ معاملات میں اسلام کے مقرر کئے ہوئے ضابطہ پر عمل کریں۔ بلکہ ان سب کے علاوہ ایک بڑی اور بہت بھاری ذمہ داری آپ پر یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ آپ تمام دنیا کے سامنے اس حق کے گواہ بن کر کھڑے ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں۔ مسلمان کے نام سے آپ کو ایک مستقل امت بنانے کی واحد غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ آپ بندگانِ خدا پر شہادتِ حق کی حجت

پوری کر دیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اور اس طرح ہم نے بنایا تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔

یہ آپ کی امت کا اصلی مقصد وجود ہے جسے آپ نے پورا نہ کیا تو گویا اپنی زندگی ہی اکارت گنوا دی۔ یہ آپ پر خدا کا عائد کیا ہوا فرض ہے کیونکہ خدا کا حکم ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے بنو۔

اور یہ نرا حکم ہی نہیں بلکہ تاکیدی حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔

اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس فرض کو انجام نہ دینے کا نتیجہ کیا ہے۔ آپ سے پہلے اس گواہی کے کٹہرے میں یہودی کھڑے کیے گئے تھے۔ مگر انہوں نے کچھ تو حق کو چھپایا اور کچھ حق کے خلاف گواہی دی۔ اور فی الجملہ حق کے نہیں بلکہ باطل کے گواہ بن کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے

انہیں دھتکار دیا اور ان پر وہ پھٹکار پڑی کہ۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ — ذلت (و رسوائی) اور محتاجی
وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ — (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی۔
مِّنَ اللّٰهِ۔ — اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے

یہ شہادت جس کی ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جو حق آپ کے پاس آیا ہے، جو صداقت آپ پر منکشف کی گئی ہے، انسان کے لئے فلاح و نجات کی جو راہ آپ کو دکھائی گئی ہے، آپ دنیا کے سامنے اس کے حق و صداقت ہونے پر اور اس کے راہِ راست ہونے پر گواہی دیں ایسی گواہی جو اس کے حق و صداقت ہونے کو مبرہن کر دے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجت پوری کر دے۔ یہ شہادت دو ہی طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک قولی شہادت، دوسرے عملی شہادت۔ قولی شہادت کی صورت یہ ہے کہ ہم زبان اور قلم سے دنیا پر اس حق کو واضح کریں جو انبیاء کے ذریعہ سے ہمیں پہنچا ہے سمجھانے اور دل نشین کرنے کے جتنے طریقے ممکن ہیں ان سب کو استعمال کر کے، تبلیغ دعوت اور نشر و اشاعت کے جتنے ذرائع ممکن ہیں ان سب سے کام لے کر، علوم و فنون نے جس قدر مواد فراہم کیا ہے، وہ سب اپنے ہاتھ میں لے کر ہم دنیا کو اس دین کی تعلیم سے روشناس کریں جو خدا نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔ فکر و اعتقاد میں، اخلاق و سیرت میں، تمدن و معاشرت میں، کسبِ معاش اور لین دین میں، قانون اور نظمِ عدالت میں، سیاست اور تدبیرِ مملکت میں اور بین الانسانی معاملات کے تمام دوسرے پہلوؤں

میں، اس دین نے انسان کی رہنمائی کے لئے جو کچھ پیش کیا ہے اسے ہم خوب کھول کر بیان کریں، دلائل اور شواہد سے اس کا حق ہونا ثابت کریں، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے اس پر معقول تنقید کر کے بتائیں کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ اس قولی شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ امتِ مجموعی طور پر ہدایت خلق کے لئے اسی طرح فکرمند نہ ہو جس طرح انبیاء علیہم السلام، انفرادی طور پر اس کے لئے فکرمند رہا کرتے تھے۔ یہ حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ کام ہماری تمام اجتماعی کوششوں اور قومی سعی وجہد کا مرکزی نقطہ ہو۔ ہم اپنے دل ودماغ کی ساری قوتیں اور اپنے سارے وسائل وذرائع اس پر لگا دیں ہمارے تمام کاموں میں یہ مقصد لازماً ملحوظ رہے اور ہم اپنے درمیان سے کسی ایسی آواز کے اٹھنے کو تو کسی حال میں برداشت ہی نہ کریں جو حق کے خلاف شہادت دینے والی ہو۔

رہی عملی شہادت تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں جن کو ہم حق کہتے ہیں۔ دنیا صرف ہماری زبان ہی سے ان کی صداقت کا ذکر نہ سنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے خود ہماری زندگی میں ان کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کر لے۔ وہ ہمارے برتاؤ میں اس شیرینی کا ذائقہ چکھ لے جو ایمان کی حلاوت سے انسان کے اخلاقی معاملات میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود دیکھ لے کہ اس دین کی رہنمائی میں کیسے اچھے انسان بنتے ہیں، کیسی عادل سوسائٹی تیار ہوتی ہے، کیسی صالح معاشرت وجود میں آتی ہے، کس قدر ستھرا اور پاکیزہ تمدن پیدا ہوتا ہے، کیسے صحیح خطوط پر علوم

ادب اور فنون کا نشو و نما ہوتا ہے۔ کیسا منصفانہ، ہمدردانہ و بے نزاع معاشی تعاون رونما ہوتا ہے۔ اور اجتماعی و انفرادی زندگی کا ہر پہلو کس طرح سدھر جاتا ہے سنور جاتا ہے اور بھلائیوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس شہادت کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ہم فرداً فرداً بھی اور قومی حیثیت سے بھی اپنے دین کی حقانیت پر مجسم شہادت بن جائیں، ہمارے افراد کا کردار اس کی شہادت کا ثبوت دے، ہمارے گھر اس کی خوشبو سے مہکیں اور ہماری دکانیں اور ہمارے کارخانے اس کی روشنی سے جگمگائیں۔ ہمارے ادارے اور ہمارے مدرسے اس کے نور سے منور ہوں، ہمارا لٹریچر اور ہماری صحافت اس کی خوبیوں کی سند پیش کرے۔ ہماری قومی پالیسی اور اجتماعی سعی و جہد اس کے برحق ہونے کی روشن دلیل ہو۔ غرض ہم سے جہاں اور جس حیثیت میں بھی کسی شخص یا قوم کو سابقہ پیش آئے وہ ہمارے شخصی اور قومی کردار میں اس بات کا ثبوت پائے کہ جن اصولوں کو ہم حق کہتے ہیں وہ واقعی حق ہیں اور ان سے فی الواقع انسانی زندگی اصلح اور اعلیٰ و ارفع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی عرض کر دوں کہ اس شہادت کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جب کہ ایک اسٹیٹ انہی اصولوں پر قائم ہو جائے اور وہ پورے دین کو عمل میں لا کر اپنے عدل و انصاف سے اپنے اصلاحی پروگرام سے اپنے حُسنِ انتظام سے اپنے امن سے اپنے باشندوں کی فلاح و بہبود سے، اپنے حکمرانوں کی نیک سیرت سے اپنی صالح داخلی سیاست سے، اپنی راست بازانہ خارجی پالیسی سے اپنی شریفانہ جنگ سے اور اپنی وفادارانہ صلح سے ساری دنیا کے سامنے اس بات کی

شہادت دے کہ جس دین نے اس اسٹیٹ کو جنم دیا ہے وہ درحقیقت انسانی فلاح کا ضامن ہے اور اس کی پیروی میں نوعِ انسانی کی بھلائی ہے۔ یہ شہادت جب قولی شہادت کے ساتھ مل جائے تب وہ ذمّہ داری پوری طرح ادا ہو جاتی ہے جو امتِ مسلمہ پر ڈالی گئی ہے، تب نوعِ انسانی پر بالکل اتمامِ حجت ہو جاتا ہے، اور تب ہی ساری امت اس قابل ہو سکتی ہے کہ آخرت کی عدالت میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کھڑی ہو کر شہادت دے سکے کہ جو کچھ حضورؐ نے ہم کو پہنچایا تھا وہ ہم نے لوگوں تک پہنچا دیا اور اس پر بھی جو لوگ راہِ راست پر نہ آئے وہ اپنی کجروی کے خود ذمّہ دار ہیں۔

بس میرا پیغام وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے دلوایا تھا۔

تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا و	آؤ اس امر کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان
بینکم الا نعبد الا اللہ ولا	یکساں ہے اور وہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی
نشرک بہ شیئا و لا یتخذ بعضنا	کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ
بعضا اربابا من دون اللہ	بنائیں ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ بنائے

ہم سب ایک خدا کے بندے ایک رسولؐ کے پیرو اور ایک کتابِ مبین کے ماننے والے ہیں اور ایک ہی قبلہ ہم سب کا مرکزِ رجوع ہے آئیے ہم سب اس بات پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کے سوا اس دنیا میں کسی کی بندگی نہ کریں گے، اس کے قانون کے سوا کسی قانون کی پیروی نہ کریں گے، اور اس کے حکم کے سوا کسی کا حکم اس کی زمین پر نہ چلنے دیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔"

(۵)

خود ان کی زبانی

بچپن:-

[1] میرا بچپن ریاست حیدرآباد کے مشہور شہر اورنگ آباد دکن میں گزرا ہے۔ میرا خاندان تو دہلی کا تھا لیکن میرے والد مرحوم دہلی سے اورنگ آباد چلے گئے تھے۔ اس وجہ سے میری زندگی کے ابتدائی ۱۳، ۱۴ سال اورنگ آباد ہی میں بسر ہوئے جو لوگ ایک ہی جگہ پل کر جوان ہوئے ہیں اور ساری عمر اپنے پیدائشی وطن ہی میں بسے ہیں وہ اس بات کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی محبت ہوتی ہے جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا ہو۔

۱۳، ۱۴ سال کی عمر تک میں وہیں رہا۔ پھر میرا یہ پیدائشی وطن مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ برسوں کے بعد جوانی کی عمر میں جب مجھے ایک دفعہ پھر اورنگ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میرے اوپر عجیب کیفیت گزری۔ جوں جوں شہر قریب آتا جاتا

---

[1] یہ مضمون میں نے مولانا کے مختلف مضامین، مکاتیب اور کتب سے متفرق اقتباسات کو ربط و ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ الفاظ ان کے ہیں۔ ترتیب میری ہے۔ یہ مضمون اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ مولانا کی ذاتی داخلی اور خالص نجی باتیں اور تاثرات کی جھلک بھی اس میں آگئی ہے (ا-گ)

تھا میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی میں محسوس کر رہا تھا کہ ریل بہت سست چل رہی ہے، میرا جی چاہتا تھا کہ ریل پر سے کود جاؤں اور بھاگ کر شہر میں جا پہنچوں، بچپن کی دیکھی ہوئی ایک ایک چیز کو میں پہچاننے کی کوشش کرتا تھا۔ اور میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھینچنے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے۔ جہاں اس کا بچپن گزرا ہو۔

بچپن کی یاد:۔

ایک عجیب بات جو میں نے وہاں جا کر محسوس کی وہ یہ تھی کہ بچپن کی دیکھی ہوئی کوئی چیز بھی اتنی بڑی نہیں رہی تھی جتنی چند سال پہلے تھی۔ سڑکیں، بازار، گلیاں، عمارتیں سب پہلے سے چھوٹی اور کچھ کچھ تنگ تنگ سی ہو گئیں تھیں۔ جن گھروں میں کبھی وہاں یا اکثر جایا کرتا تھا۔ وہ بھی پہلے بڑے بڑے تھے اور اب سکڑ کر بالکل چھوٹے ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ جس چیز کو بھی اپنی یاد کے نقشے سے ملا کر دیکھتا ہوں وہ ہے تو اپنی جگہ پر ہی، مگر پہلے سے چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے۔ آخر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سارا فرق جو مجھے معلوم ہو رہا ہے، دراصل ان چیزوں کے اندر نہیں بلکہ خود میرے اندر ہو گیا ہے۔ جب تک میں بچہ تھا میری نگاہ چھوٹی تھی اور چیزیں بڑی نظر آتی تھیں۔ جب میں بڑا ہو گیا تو میری نگاہ بھی بڑی ہو گئی اور چیزیں اسی لحاظ سے چھوٹی نظر آنے لگیں۔

بچپن کی باتیں:۔

مجھے اپنی چھوٹی عمر کی باتیں بھی اب تک یاد ہیں۔ مجھے اپنی وہ حیرت اب تک یاد ہے جب مجھے پہلی مرتبہ یہ سن کر ہوئی تھی کہ ابا کے ابا کو دادا اور ابا کی اماں کو دادی کہتے ہیں۔ میرا دل کسی طرح یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ ابا بھی کسی کے بیٹے ہو سکتے ہیں

اور نہ میں یہ تصور ہی کر سکتا تھا کہ میرے والد بھی کبھی میری طرح بچے ہوں گے۔ اس نئی معلومات پر میں بہت دنوں تک غور کرتا رہا اور یہ بات بڑی تحقیقات کے بعد میری سمجھ میں آئی کہ جتنے لوگ اب بڑے اور بوڑھے ہیں یہ سب کبھی بچے تھے اور ان کے بھی کوئی ماں باپ تھے۔

اس سے بھی چھوٹی عمر کا اور ایک خیال مجھے اب تک یاد ہے۔ میں اماں اور ابا کے کوئی معنی نہیں جانتا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور میں ان کے پاس کیسے آ گیا ہوں۔ البتہ میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ یہ ہیں بڑے اچھے لوگ۔۔ اپنے والد کو میں دنیا کا سب سے اچھا آدمی اور والدہ کو سب سے اچھی عورت سمجھتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا یا مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لئے پریشان ہوتے تھے۔ اسی لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی جان بوجھ کر بھی خطرے میں ڈالتا تھا۔ اس وقت جو بے چینی میری والدہ اور میرے والد کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ اس سے میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ انہیں میری بہت فکر ہے۔ ان تجربات سے ماں اور باپ کے معنی میری سمجھ میں آئے اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ماں اور باپ اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔

بڑے بھائی

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے ایک بھائی مجھ سے ۴، ۵ برس بڑے تھے۔ مجھے کھانے کی جو چیز ملتی تھی اسے میں فوراً کھا لیتا تھا مگر بھائی سنبھال کر کسی اچھے وقت پر کھانے کے لئے اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح جو پیسے ملتے تھے ان کو

بھی میں فوراً خرچ کر ڈالتا تھا اور بھائی صاحب انہیں جمع کرکے کبھی کوئی اچھی چیز خرید لاتے تھے بس یہ میرے اور ان کے درمیان جھگڑے کی مستقل بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ ان کے حصّہ میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اوّل اوّل تو میں سمجھا کرتا تھا کہ اس طرح میں انہیں شکست دے کر مالِ غنیمت حاصل کرتا ہوں مگر بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ بڑے بھائی کو مجھ سے محبت ہے اور انہیں خود بھی اسی میں مزا آتا ہے کہ میں لڑ بھڑ کر ان سے اپنا حصّہ وصول کر لیا کروں۔ اس طرح میں والدین کے حصّہ میں سے ۷۵ فیصدی کا مالک ہوتا تھا۔ ۵ فیصدی اپنے حساب میں اور ۲۵ فیصدی بڑے بھائی کے حساب میں سے۔ مشہور بات تو یہ ہے کہ "تنگ باش برادرِ خورد مباش" چھوٹا بھائی بننے سے کتا بننا زیادہ بہتر ہے مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔

گھر کی تربیت:۔

میرے والد مرحوم نے میری تربیت بڑے اچھے طریقہ سے کی تھی۔ وہ دہلی کے شرفاء کی نہایت ستھری زبان بولتے تھے۔ انہوں نے ابتدا سے یہ خیال رکھا کہ میری زبان نہ بگڑنے پائے جب کبھی میری زبان پر کوئی غلط لفظ چڑھ جاتا یا کوئی بازاری لفظ میں سیکھ لیتا تو وہ مجھے ٹوک دیتے اور صحیح لفظ بولنے کی عادت ڈالتے یہی وجہ ہے کہ دکن میں پرورش پانے کے باوجود میری زبان بالکل محفوظ رہی۔ بعد میں مجھ کو ہندوستان کے مختلف حصّوں میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا ہے مگر بچپن میں جو زبان پختہ ہو چکی تھی اس پر کسی جگہ کی بولی کا اثر نہ پڑ سکا۔ وہ باتوں کے جیسے

پیغمبروں کے قصے، تاریخ اسلام اور تاریخ ہندوستان کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے اس کا مفید اثر میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے اخلاق کی درستی کا بھی خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایسے بچوں کے ساتھ کبھی نہیں کھیلنے دیا جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ جب کبھی میں کوئی بری عادت سیکھ لیتا تو وہ بڑی کوشش سے اُسے چھڑواتے تھے ایک مرتبہ میں نے ایک ملازم کے بچے کو مارا تو انہوں نے اس بچے کو بلا کر کہا کہ تو بھی اسے مار۔ اس سے مجھے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کبھی کسی زیردست پر نہیں اٹھا۔ وہ مجھے زیادہ تر اپنے ساتھ اپنے دوستوں کی صحبت میں لے جاتے تھے اور ان کے دوست سب کے سب سنجیدہ، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے ان صحبتوں میں بیٹھنے کی وجہ سے میں چھوٹی عمر ہی میں مہذب عادات سیکھ گیا۔ اور بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے لگا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی، والد مرحوم کی اس تربیت کی وجہ سے وہ شرارتوں اور دنگے فساد کے بجائے ظرافت کی شکل میں ڈھل گئی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں مجھ سے بڑی عمر کے لوگ میرے ساتھ بہت دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیونکہ میں شرارتیں کرنے کی بجائے بہت مزے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔

تعلیم:

میرے والد مرحوم نے میری ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا تھا۔ غالباً وہ میری زبان کی حفاظت کے لئے اور مجھے بری صحبتوں سے بچانے کے لئے مدرسے بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ گھر کی اس تعلیم میں مجھ کو بہت سے استادوں سے سابقہ پیش آیا۔ بعض استاد ایسے تھے جنہوں نے مجھے کند ذہن بنانے کی کوشش کی اور ان سے

کے اثر سے مجھے خود اپنے اوپر ہی شک ہونے لگا کہ شاید میں کچھ پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض استادوں نے مجھے اس سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کی جتنا میں اپنی عمر کے لحاظ سے پڑھ سکتا تھا۔ البتہ بعض استادوں نے مجھے بہت اچھی تعلیم دی اور مجھے جو کچھ حاصل ہوا وہ ان ہی کا فیض تھا۔ مجموعی طور سے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ گھر کی یہ تعلیم میرے لئے مدرسے کی بہ نسبت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ پانچ چھ سال کی اس تعلیم میں مجھ کو اتنا علم حاصل ہو گیا جتنا دوسرے بچوں کو آٹھ سال میں ہوتا ہے بلکہ جب مجھ کو گیارہ سال کی عمر میں آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا تو اکثر مضمونوں میں میری معلومات اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ تھیں۔ حالانکہ میں اپنی آٹھویں کلاس میں سب سے چھوٹی عمر کا طالب علم تھا۔

میری ابتدائی تعلیم میں ایک خرابی ایسی تھی جس کو بعد میں میں نے بری طرح محسوس کیا۔ وہ خرابی یہ تھی کہ عام دستور کے مطابق مجھے بھی سب سے پہلے بغدادی قاعدہ پڑھا کر قرآن مجید پڑھوایا گیا۔ یہ غلطی عام طور پر مسلمان اس زمانے میں بھی کرتے تھے اور آج تک کئے جا رہے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ بچہ دنیا کی اور ساری چیزیں تو سمجھ کر پڑھتا ہے۔ مگر صرف قرآن ہی کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ بس اس کے الفاظ پڑھ لینے کافی ہیں اس غلط طریقہ کی وجہ سے مجھے بے سمجھے قرآن پڑھنے کی ایسی عادت پڑی کہ آگے چل کر جب میں نے عربی زبان پڑھ لی۔ اس وقت بھی برسوں تک قرآن کو بغیر سمجھے پڑھتا رہا۔ ۲۱ برس کی عمر میں مجھ کو پہلی دفعہ اپنی اس غلطی کا احساس ہوا اور میں نے قرآن کو سمجھنے کی کوشش شروع کی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مسلمان بچوں کو اس غلطی سے بچایا جاتے اور انہیں قرآن

اس وقت پڑھایا جائے جب وہ کم از کم اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن کا ترجمہ ساتھ ساتھ پڑھ لیں۔

مدرسہ

اب میں کچھ تھوڑا سا حال اپنے مدرسے کا بیان کرتا ہوں۔ ۱۱ برس کی عمر میں جب مجھ کو ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے میل جول کا موقع ملا۔ کیونکہ اس سے پہلے تک تو میں زیادہ تر بڑوں کی صحبت ہی میں رہا کرتا تھا۔ مدرسے میں اوّل اوّل تھوڑے دنوں میں اجنبی رہا۔ پھر میں نے مدرسے کی اس شریف ٹولی سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے جس میں سنجیدہ اور شوقین طالب علم شامل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے محض اپنی ظرافت کے ذریعہ سے شریر ٹولی کے بھی دو تین سرغنوں کو دوست بنا لیا تھا۔ میں ان کی شرارتوں میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ مگر مذاق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے میں نے ان کو رام کر لیا تھا۔ اس طرح میں شریف ٹولی کا دوست بھی رہا اور شریر ٹولی سے بھی تعلقات نہیں بگڑے۔ استادوں میں سے اکثر میرے اوپر بہت مہربان تھے۔ خصوصاً ایک استاد تو ایسے شفیق بن گئے کہ آج تک ان کے خاندان سے میرے تعلقات قائم ہیں۔ اور ان کے صاحبزادے کو میں اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ مدرسے ہی میں مجھ کو پہلی مرتبہ مضامین لکھنے اور تقریری مباحثوں میں حصّہ لینے کا موقع ملا۔ اس سے مجھ کو احساس ہوا کہ مجھ میں زبان اور قلم سے کام لینے کی کچھ صلاحیّت ہے۔ مدرسے کی زندگی میں چند مہینے ہی گذارنے کے بعد مجھے اس سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ چھٹی کا دن مجھ کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور جب لمبی چھٹیاں آتی تھیں تو پہلے ہی سے ہم چند لڑکے آپس میں یہ پروگرام طے کر لیتے

تھے کہ روزانہ ایک جگہ جمع ہوا کریں گے مل کر کچھ مطالعہ کیا کریں گے اور مل کر ہی تفریح بھی کریں گے۔

کھیل کود:۔

کھیل سے مجھے ابتدائی عمر میں کم دلچسپی تھی جب کچھ ہوش سنبھالا تو بنوٹ کے فن سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میری والدہ صاحبہ کے خاندان میں یہ فن بہت مقبول تھا۔ خصوصاً میرے ماموں اس کے بہت بڑے ماہر تھے میں نے اپنے خالہ زاد بھائیوں سے یہ فن سیکھا اور کچھ مدت تک بس یہی میرا کھیل رہا۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد مجھے فٹ بال اور کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر صرف تفریح کے لئے اس میں شریک ہوتا تھا۔ اچھا کھلاڑی میں کبھی نہیں بن سکا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء۔ ۱۷ سال کی عمر میں آپ نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ روزنامہ تاج (جبل پور) مسلم اور الجمعیتہ دہلی کے ایڈیٹر رہے۔ اس دور میں مشہور علمی کتاب الجہاد فی الاسلام لکھی۔ ۱۹۳۳ء میں حیدر آباد دکن سے ترجمان القرآن جاری کیا اور ۱۹۳۸ء تک آپ سیکولر جمہوری اسٹیٹ اور متحدہ قومیت کے نظریات کے خلاف مسلسل جہاد کرتے رہے اور بتدریج احیائے اسلام کو اپنا نصب العین زندگی بنا لیا۔

کانگرس:۔

وہ لوگ جو صرف ہندوستانی ہیں، یا پہلے "ہندوستانی" اور پھر سب کچھ ہیں تو ان سے مجھے کوئی سروکار ہی نہیں ہے وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں اور میں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں۔ ان کی منزل مقصود دوسری ہے اور میری منزل مقصود دوسری ان کو صرف ہندوستانی کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے۔ عام اس سے کہ مسلمان

رہیں یا نہ رہیں اور مجھے وہ آزادی درکار ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنی زوال پذیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں۔

"۱۹۳۷ء میں یکایک یہ خطرہ سامنے آگیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظامِ حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں ان کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی رابطۂ عوام کی تدبیروں سے، اور اپنی وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعے سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان اور امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو زیادہ پریشان کن جس چیز نے بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ با اثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا۔ اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہو گا۔ لہٰذا اس خطرے کا سدِ باب کرنے کے لئے میں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۱۹۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۱۹۳۹ء کے آغاز میں شروع کیا۔ ان مجموعوں میں میرے پیشِ نظر صرف یہ چیز تھی

کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کر دیں۔ اس لئے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کو اس جمہوری لادینی نظامِ حکومت سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا۔"

مسلم لیگ:۔

"میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ اس نئی تحریک کے دور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی ہے جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا میرے نزدیک یہ صورت حال اسلام کے لئے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں، تو ان کے اس طرح زندہ رہنے اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کمبخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے، حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور

کلکتہ کے دولتمند مسلمان انگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے"۔

مقصدِ حیات :-

"میں ایک نو مسلم ہوں خوب جانچ اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لئے فلاح و صلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ انسان پر انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لئے بحیثیت انسان کے شرف و عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور امان ہو"۔

(۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال مرحوم کی دعوت پر مولانا پنجاب میں منتقل ہو گئے)

تشکیل جماعت :-

"میں نے اور میرے ہم خیال لوگوں نے کامل تین سال اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں جو بڑی بڑی جماعتیں اس وقت قائم ہیں وہ سب یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک اپنے نظام اور پروگرام میں ایسی تبدیلی کرے جس سے اسلام کی یہ ضرورت پوری ہو جائے اور ایک نئی جماعت بنانے کی حاجت باقی نہ رہے مگر

افسوس کہ ہمیں اس کوشش میں پوری ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ ان لوگوں کو جمع کریں جو موجودہ جماعتوں کے طرزِ عمل سے غیر مطمئن اور صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے کے خواہشمند ہیں چنانچہ شعبان ۱۳۶۰ھ (اگست ۱۹۴۱ء) میں ہم نے ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورہ سے "جماعت اسلامی" قائم کی۔"

اسلام کا شعور:

"ایک وقت تھا کہ عام مسلمانوں کی طرح میں خود بھی روایتی اور نسلی مذہبیت کا قائل اور اس پر عمل پیرا تھا جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اس طرح محض ما الفینا علیہ اٰباءنا کی پیروی ایک بے معنی چیز ہے۔ آخرکار میں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف توجہ کی، اسلام کو سمجھا اور جان بوجھ کر اس پر ایمان لایا۔ پھر آہستہ آہستہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کی جب اللہ تعالٰے نے قلب کو اس طرف سے پوری طرح مطمئن کر دیا تو جس حق پر خود ایمان لایا تھا اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس مقصد کے لئے ۱۳۵۲ھ میں "ترجمان القرآن" جاری کیا۔ ابتدائی چند سال الجھنوں کو صاف کرنے اور دین کا ایک واضح تصور پیش کرنے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد دین کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کرنے کے لئے پیشقدمی شروع کی۔ دین کو تحریک کی شکل میں جاری کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری زندگی میں دینداری محض ایک انفرادی رویّہ کی صورت میں جامد و ساکن ہو کر نہ رہ جائے بلکہ ہم اجتماعی صورت میں اس نظامِ دینی کو عملاً نافذ و قائم کرنے اور مانع و مزاحم قوتوں کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لئے جدوجہد

بھی کریں" ادارہ دار السلام" کا قیام اس سلسلہ کا پہلا قدم تھا۔ ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۶ء) میں یہ قدم اٹھایا گیا۔ اور اس وقت صرف چار آدمی رفیق کار بنے۔ اس چھوٹی سی ابتدا کو اس وقت بہت حقیر سمجھا گیا، مگر الحمدللہ کہ ہم بددل نہ ہوئے اور اسلامی تحریک کی طرف دعوت دینے اور اس تحریک کے لئے نظری حیثیت سے ذہن ہموار کرنے کا کام لگاتار کرتے چلے گئے۔ اس دوران میں ایک ایک دو دو کر کے رفقاء کی تعداد بڑھتی رہی ملک کے مختلف حصوں میں ہم خیال لوگوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بھی بنتے رہے اور لٹریچر کی اشاعت کے ساتھ ساتھ زبانی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ آخر کار تحریک کے اثرات کا گہرا جائزہ لینے کے بعد محسوس ہوا کہ اب جماعت اسلامی کی تاسیس اور تحریک اسلامی کو منظم طور پر اٹھانے کے لئے زمین تیار ہو چکی ہے اور یہ وقت دوسرا قدم اٹھانے کے لئے موزوں ترین وقت ہے چنانچہ اسی بنیاد پر ایک اجتماع منعقد کر کے تحریک کی بنیاد ڈال دی گئی"۔

انفرادی حیثیت ختم:-

"میرا کام آپ کو ایک جماعت بنا دینے کے بعد پورا ہو جاتا ہے۔ میں صرف ایک داعی تھا، بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور میری تمام مساعی کی غایت یہ تھی کہ ایسا نظام جماعت بن جائے۔ جماعت بن جانے کے بعد میں آپ میں کا فرد ہوں اب یہ جماعت کا کام ہے کہ اپنے میں سے کسی اہل تر آدمی کو اپنا امیر منتخب کرے اور پھر یہ اس امیر کا کام ہے کہ آئندہ اس تحریک کو چلانے کے لئے اپنی صوابدید کے مطابق ایک پروگرام بنائے اور اسے عمل میں لائے۔ میرے متعلق کسی کو غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ جب دعوت میں نے دی ہے تو آئندہ اس تحریک کی رہنمائی کو بھی

میں اپنا ہی حق سمجھتا ہوں ہرگز نہیں، نہ میں اس کا خواہش مند ہوں، نہ اس نظریہ کا قائل ہوں کہ داعی کو ہی آخر کار لیڈر بھی ہونا چاہیئے، نہ مجھے اپنے متعلق یہ گمان ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کا لیڈر بننے کی اہلیت مجھ میں ہے اور نہ اس کام کی بھاری ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ حماقت کر سکتا ہے کہ اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر لادے جانے کی خود تمنا کرے"۔

میری تمنا:۔

"میری غایت تمنا اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی نظامِ جماعت کے ماتحت ایک چپڑاسی کی خدمت انجام دینا بھی میرے نزدیک اس سے زیادہ قابلِ فخر ہے کہ کسی غیر اسلامی نظام میں صدارت اور وزارتِ عظمٰی کا منصب مجھے حاصل ہو"۔

امارتِ جماعت:۔

"میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا، نہ سب سے زیادہ متقی، نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے تفضیلت حاصل تھی۔ بہرحال جب آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کارِ عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اب اللہ سے دُعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔ میں اپنی حدِ وسع تک انتہائی کوشش کروں گا کہ اس کام کو پوری خدا ترسی اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ چلاؤں میں قصداً اپنے فرض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ اور خلفاء راشدین کے نقشِ قدم کی پیروی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ تاہم اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو اور آپ میں سے

کوئی محسوس کرے کہ میں راہِ راست سے ہٹ گیا ہوں تو مجھ پر یہ بدگمانی نہ کرے کہ میں عمداً ایسا کررہا ہوں۔ بلکہ حسنِ ظن سے کام لے اور نصیحت سے مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔ آپ کا مجھ پر حق ہے کہ میں اپنے آرام و آسائش اور اپنے ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمہ داریوں کو ترجیح دوں۔ جماعت کے نظم کی حفاظت کروں، ارکان جماعت کے درمیان عدل اور دیانت کیساتھ حکم کروں، جماعت کی طرف سے جو امانتیں میرے سپرد ہوں ان کی حفاظت کروں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دل و دماغ اور جسم کی تمام طاقتوں کو اس مقصد کی خدمت میں صرف کردوں جس کے لئے آپ کی جماعت اٹھی ہے۔ اور میرا آپ پر یہ حق ہے کہ جب تک میں راہِ راست پر چلوں آپ اس میں میرا ساتھ دیں۔ میرے حکم کی اطاعت کریں، نیک مشوروں سے اور امکانی امداد و اعانت سے میری تائید کریں اور جماعت کے نظم کو بگاڑنے والے طریقوں سے پرہیز کریں۔ مجھے اس تحریک کی عظمت اور خود اپنے نقائص کا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ وہ تحریک ہے جس کی قیادت اولوالعزم پیغمبروں نے کی ہے اور زمانۂ نبوت گذر جانے کے بعد وہ غیر معمولی انسان اس کو لے کر اٹھتے رہے ہیں جو نسلِ انسانی کے گل سرسبد تھے۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں۔ بلکہ میں تو اس کو ایک بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کارِ عظیم کے لئے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائض امارت کی انجام دہی کے ساتھ برابر تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر آدمی اس کا بار اٹھانے کے لئے مل جائے۔ اور جب میں ایسے

آدمی کو پاؤں گا تو خود سب سے پہلے اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ نیز میں ہمیشہ ہر اجتماعِ عام کے موقع پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پا لیا ہے تو وہ اسے اپنا امیر منتخب کرے اور میں اس منصب سے بخوشی دست بردار ہو جاؤں گا۔ بہر حال میں انشاء اللہ اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستے میں سدِ راہ نہ بننے دوں گا اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں گا کہ ایک ناقص آدمی اس جماعت کی رہنمائی کر رہا ہے اس لئے ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ کامل آئے اور یہ مقام جو آپ نے میرے سپرد کیا ہے ہر وقت اس کے لئے خالی ہو سکتا ہے۔ البتہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اگر کوئی دوسرا اس کام کو چلانے کے لئے نہ اُٹھے۔ تو میں بھی نہ اٹھوں، میرے لئے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے میرا مرنا اور جینا اس کے لئے ہے۔ کوئی اس پر چلنے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو بہر حال مجھے تو اسی راہ پر چلنا ہے اور اسی راہ میں جان دینا ہے۔ کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھونگا کوئی ساتھ نہ دے گا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تن تنہا اس سے لڑنے میں بھی باک نہیں ہے۔"

میرا دینی فہم:-

"میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن اور سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے۔ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسول ؐ نے کیا کیا۔"

فقہی مسلک :-

"میرا مسلک یہ ہے کہ ایک صاحبِ علم آدمی کو براہِ راست کتاب و سنت سے حکمِ صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اس تحقیق و تجسس میں علمائے سلف کی ماہرانہ آراء سے بھی مدد لینی چاہیئے۔ نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرنی چاہیئے کہ آئمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب و سنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ پھر جو چیز حق معلوم ہو اسی کی پیروی کرنی چاہیئے۔"

میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔

نظریۂ ادب :-

"معاش کے لئے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لئے اینٹیں ڈھولے، ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے، یہ کام محض معاش کے لئے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریۂ و مسلک پر کرنا ہو گا۔"

اربابِ جفا پیشہ کو اطلاع :-

میں نے اپنی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سُن کر، سوچ کر، سمجھ کر اور مشاہدہ و تجربہ کر کے میرے

ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے۔ میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں جن کی پشت پر برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے دلائل ہیں میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے اور ان پر میں پورے قلبی و دماغی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں۔ اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے۔ اور ان کو قلب و دماغ کے متفقہ فیصلہ کے ساتھ رد کر چکا ہوں۔ میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں رہے ہیں، بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصب العین کی طرف کھینچا ہے جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے، جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاق حق اور ابطالِ باطل کی اس جد و جہد میں مبتلا کر دیا ہے جس میں میں خود مبتلا ہوں۔ اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصد زندگی ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی ذلیل سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفا خانہ امراض دماغی ہے اور اگر اس نے یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آکر میں اپنا ضمیر اس کے ہاتھ رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راشن کئے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا۔ تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دل صداقت کے لئے تو ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری رائے کو علمی عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے لیکن میرا ایمان و ضمیر کوئی قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے۔ اس کی کوشش پہلے

ہم نے اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدا اور اس کے دین کے لئے کیا۔ اور جس پر ہم ابدی زندگی میں اجر پانے کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ اس کی پاداش میں بندوں کی کسی انتقامی کارروائی کو ہم ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کریں اور اس ذرا سی اذیت پر جو ہمیں پہنچ رہی ہے مضطرب ہونے لگیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بندگان نفس کی بہ نسبت بندگانِ حق کو اگر دوگنے اور چوگنے مصائب و شدائد سے بھی سابقہ پیش آئے تو ان کی پیشانی پر بل نہ آنا چاہیئے۔"

ایک مستقل عارضہ:۔

"جس روز میں گرفتار ہوا تھا اس سے ۵، ۶ روز پہلے مجھے محسوس ہوا کہ ایک پتھری گردے سے مثانے میں منتقل ہو چکی ہے۔ چنانچہ میں نے ہیں کر پینے کی دوا اور جو شاندے کا استعمال فوراً شروع کر دیا جس سے پتھری بالکل مثانہ میں آ کر اڑ گئی اور پیشاب رک رک کر آنے لگا، جو اس بات کی علامت تھی کہ اب پتھری خارج ہوا چاہتی ہے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں وہ تاریخ آ گئی جو خدا نے میری گرفتاری کے لئے مقرر کی تھی۔ اس حالت میں ظاہر ہے کہ نہ ہیں کر پینے کی دوائیں استعمال ہو سکتی تھیں اور نہ جو شاندے کا اہتمام ہو سکتا تھا۔ اس لئے دوائیں چھوڑ چھاڑ کر پولیس کے ساتھ ہو لیا۔ لائلپور جیل میں تین چار روز پیشاب بے حد تکلیف سے آتا رہا۔ بلکہ ایک دن تو بالکل ہی رک گیا تھا۔ اس وقت اگر دوا مل جاتی تو غالباً اسی وقت پتھری خارج ہو جاتی۔ مگر دوا نہ ملنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور تکلیف جاتی رہی۔ اس وقت پتھریاں پھر اخراج کی طرف مائل ہیں۔ مگر خدا کی مرضی کچھ اور معلوم ہوتی ہے اور غالب بہرحال اسی کی مرضی کو ہونا ہے۔"

عزیمت:۔

"بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطور خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا۔"

تنقید کا مسلک:۔

"میں نے اپنی پوری پبلک لائف میں گالیاں کھائی تو بہت ہیں مگر الحمد للہ کہ کبھی گالی دی نہیں۔ میں نے اصولاً جس کی رائے اور پالیسی کو صحیح سمجھا اس کی تائید کی ہے اور جس کی بھی رائے یا پالیسی سے مجھے اتفاق نہیں رہا ہے اس پر بے خوف تنقید کی ہے مگر نہ میں تملق سے ملوث ہوا ہوں۔ اور نہ بدزبانی سے شخصی طور پر میں نے ہمیشہ ان لوگوں کا احترام ملحوظ رکھا ہے جن سے قومی یا دینی معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ میں صرف ایماندارانہ اور بامقصد تنقید کا قائل ہوں اور خدا اور رسول کے سوا کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا خواہ وہ کوئی بھی ہو۔"

بچوں کی تربیت:۔

"میں نے اس لئے بچوں کو ملاقات کے لئے جیل میں لانے سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کے ذہن پر یہاں کے ماحول کا بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ مگر اب غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہیں یہ جگہ ضرور دکھانی چاہیئے۔ کیا عجب کہ کل جو نسل اٹھنے والی ہے وہ موجودہ نسل سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی ہو اور اس کے مقابلے میں ان

لوگوں کو ہم سے بھی زیادہ سخت جد وجہد کرنی پڑے۔ میں اپنی اولاد کو عیش کے لئے نہیں پالنا چاہتا بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لئے پالنا چاہتا ہوں۔"

کبر کا الزام :-

"نہ میں کوئی رئیس آدمی ہوں اور نہ پیشہ ور لیڈر۔ میرے مکان پر کبھی دربان و پاسبان نہیں رہے۔ ہر وقت ہر شخص سے آزادانہ ملتا رہا ہوں البتہ یہ ضرور ہے کہ موجودہ زمانہ کی عام بگڑی ہوئی فضا میں کسی شخص کا بدگمانیوں سے بچنا مشکل ہے اور بدگمانی کرنے میں بندگانِ خدا حق بجانب بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب میرے پاس تشریف لائیں اور میں مکان پر موجود نہ ہوں، یا بیمار ہوں یا کسی عذر صحیح کی بنا پر باہر نہ آ سکتا ہوں اس صورت میں جو عذر کیا جائے اس پر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ عذر نہیں بہانہ ہے۔ لوگوں کو آئے دن ایسے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے کچھ شکایت نہیں اگر وہ کسی کے صحیح عذر کو بھی نہ ملنے کا بہانہ سمجھیں۔"

میرا فن :-

"مجھے ارواح خبیثہ اور جنون اور شیاطین کے بارے میں نہ تو کچھ علم ہی حاصل ہے اور نہ ان چیزوں کے دفع کرنے کے طریقے ہی جانتا ہوں۔ میری واقفیت صرف ان ارواح خبیثہ اور شیاطین تک محدود ہے جو خود انسانوں میں موجود ہیں اور آج تک جو کچھ سیکھا اور عمل کیا ہے وہ بھی انہی کو دفع کرنے کے لئے ہے۔"

میرا حاصل مطالعہ :-

"میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں جنہوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے کیونکہ میدان کے مقابلہ سے جی چرانا

اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرماں روائی کے لئے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے اور جن کے لئے حقیقت وصداقت کا روشنی میں آجانا خطرے کا حکم رکھتا ہے اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لئے "سیفٹی" قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولھے پر کبھی نہ چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ یہ چیز عقل کے خلاف ہے، قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور ہزارہا برس کے تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر جینے والے تھوڑی دیر کے لئے چاہے کتنا ہی زور باندھ لیں بہرحال وہ دیر تک نہیں جی سکتے"

---

(۶)

خلقِ خدا کی نظر میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی گذشتہ ربع صدی سے اس راہ پر چل رہے ہیں جس پر چلتے ہوئے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوا کرتا ہے جو راہ اس معمورۂ ہستی پر سب سے زیادہ کٹھن ہے، جس پر اللہ کے سب سے زیادہ پُرعزم بندے حقِ بندگی ادا کرنے کے لئے تاریخ کے ہر دور میں چلتے رہے ہیں اور جس سے زیادہ پُرخار وادی اس دنیا کی اس زندگی میں اور کوئی نہیں ہے۔ یہ راہ عشقِ الٰہی کی راہ ہے جیسے مطلوب اعلیٰ وارفع ہے ویسے ہی آزمائشیں کٹھن اور جگر گداز ہوتی ہیں۔

مولانا مودودی نے ملّتِ اسلامیہ کے کروڑوں افراد کے درمیان پکار کر کہا

"آؤ ہم سب صرف اسی ایک اللہ کی بندگی کریں۔ اسی کے حکم پر چلیں، اسی کو مالک الملک کہیں اور اسی کا قانون دنیا میں نافذ کریں جو ہم سب کا مالک اور واحد اِلٰہ ہے۔"

یہ آواز سن کر زمانے کے سمندر میں ایک معمولی لرزش بھی پیدا نہ ہوئی۔ ملت کے اجتماعی شعور نے سوچا ایسی آوازیں اٹھتی ہی رہتی ہیں اور پھر چند دن کی معمولی یا غیر معمولی تگ و تاز سے مسلمانوں کو ادھر ادھر بھٹکانے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ انہی کی طرح یہ بھی کوئی آواز ہوگی۔ سننے والوں نے ایک مدہوشی کے عالم میں یہ آواز سنی اور پھر ایک گہری غفلت میں گم ہو گئے۔ طاغوتِ وقت جس کی حاکمیت کو یہ آواز

کھُلا کھُلا چیلنج دے رہی تھی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ اس قسم کی آوازیں تو مسلمان قوم کے لیڈری پیشہ حضرات کا وطیرہ بن گئی ہیں جن کے پیچھے کوئی عزیمت، کوئی استقلال کوئی حوصلہ اور کوئی دم خم نہیں ہوتا۔ اگر کچھ کرو تو پھر ہم بھی جانیں گے کہ ان بازوؤں میں کتنی طاقت ہے۔ چنانچہ طاغوتِ وقت نے بھی اس آواز کو نظر انداز کر دیا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ زمانے کے نقار خانے میں آواز کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی کردار کی قدر و قیمت ہوتی ہے، عمل ہی میں طاقت ہوتی ہے۔ اسی میں وزن ہوتا ہے۔ اسی میں حرکت ہوتی ہے۔ اسی سے دنیا متاثر ہوتی ہے، اور یہی سلطنتِ عالم کا چلتا ہوا سکہ ہے۔

لیکن جس نے پکار لگائی وہ کوئی گم کردہ راہ مسافر نہ تھا۔ وہ تو رحیل کارواں بلکہ ایک قافلہ سالار تھا۔ اس کے قافلہ کی رفتار سے تو راستے ہموار ہونے والے تھے۔ اس کے قدموں کی چاپ سے تو بھولے بھٹکے راہ پانے والے تھے۔ اس کے بتائے ہوئے راستے پر تو انسانی نسلوں کو چلنا تھا۔ وہ تو زمانے کا رخ پھیرنے کا عزم لے کر اٹھا تھا۔ وہ تو اپنی صلیب خود اپنے کندھے پر اٹھا کر اس سفر پر روانہ ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اس راہ پر بڑھتا رہا اور اکا دکا مسافر اس کی رفاقت اختیار کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ زمانے کی شاہراہ پر اس کے گرد ایک بھیڑ جمع ہوتی ہوئی نظر آئی

یہ وقت تھا جب کئی برسوں کے بعد طاغوت وقت جاگا۔ افسوس کہ وہ طاغوت خود امتِ مسلمہ کے اندر سے پیدا ہوا تھا۔ آخر وہ کون سا مسلح ہے جسے مارنے کے لئے اس کی اپنی ہی قوم میں سے کچھ بدبخت ہاتھ بلند نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس نئے

قافلہ کی رفتار اور انداز دیکھ کر اقتدارِ وقت نے کسی رہزن کی طرح اچانک اس قافلے پر عجلت سے حملہ کیا۔ تاکہ اسے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی تباہ کر کے رکھ دے۔

یہی وقت تھا کہ جب طاغوتِ وقت نے بھی جانا کہ یہ آواز بے حوصلہ غیر مستقل مزاج اور کسی موقع پرست آدمی کی آواز نہ تھی بلکہ ایک قوت تھی جو اپنا راستہ خود ہموار کرنے، اپنی منزل پر خود پہنچنے اور اپنی راہ خود چلنے کا داعیہ لے کر اٹھی تھی اور جو منزل پر پہنچنے سے پہلے کسی دوسری دلچسپی میں نہیں الجھا کرتی اور ملت نے بھی جان لیا۔ کہ یہ باتیں کہنے والا شخص ان لوگوں سے علیحدہ کردار کا آدمی تھا جو اس قسم کی بولیاں روز بول بول کر اس پر منڈلایا کرتے تھے۔

طاغوت نے حملہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ اگر کوئی تھا تو اسی قافلہ راہِ حق سے تھا چنانچہ اس نے دنیا کے چوراہے پر پھانسی گاڑی اور اس شخص کو پھانسی پر لٹکا دینے کی سعی نامشکورہ تک کر ڈالی لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس زبردست پشت پناہ نے جو زمین و آسمان کا خالق ہے اس پھانسی کو ایک عظیم الشان مینار بنا دیا اور اس مردِ خدا کو اس مینار پر کھڑا کر دیا۔ تاکہ ساری دنیا والے دیکھ لیں کہ وہ کتنا عظیم الشان تھا۔ اس کا حوصلہ کتنا بلند تھا۔ اور اس کا عزم کتنا ارفع تھا اور اس طرح خدا نے اس کے لئے رفعِ ذکر کا سامان پیدا کر دیا چنانچہ جو لوگ اسے جانتے تھے وہ جان گئے۔ جو اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے ان کے دل اس کی عظمت اور محبت سے معمور ہو گئے اور جو لوگ اسے نظر انداز کرتے تھے وہ خود اس کے رفعِ ذکر کا سبب بن گئے۔

چنانچہ بے شمار صاحبانِ علم و دانش اور اربابِ ادب و صحافت نے اس

کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اور اس کی دعوت کی عظمت کا اعتراف کیا ہے
یہ بیشتر اقتباسات اس وقت کے اظہارِ خیالات میں سے لیے گئے ہیں لیکن بہت
سے اقتباسات ایسے ہیں خصوصاً علماء کرام کی ایک بڑی تعداد کے جو دوسرے مختلف
اور متفرق اوقات میں اعترافِ حقیقت اور جذبۂ محبت و رفاقت کے تحت لکھے
گئے تھے۔ میرے محدود ذرائع کی موجودگی میں جو کچھ مجھے میسر آسکا ہے اس کو میں نے یہاں
تین عنوانات کے تحت مرتب کر دیا ہے۔

اربابِ علم و دانش کی آراء

الشیخ محمد البشیر الابراہیمی الجزائری

"آپ ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ میں نے کم ہی ایسے باکمال دیکھے ہیں
بلکہ آپ چند ممتاز خصوصیات کے لحاظ سے فردِ واحد ہیں جس کی نظیر میں اس زمانہ
کے علماء میں نہیں پاتا۔ مثلاً حق کے مقابلہ میں نہایت سخت، مداہنت سے کوسوں
دور، اور راہِ حق میں ابتلاء و محن کے وقت صبر و ثبات کے پیکر مجسم حکام وقت
کے تقرب سے متنفر، خوشامد و تملق تو دور کی بات ہے۔ پاکستان اور ہندوستان
کے جن فضلاء سے میں متعارف ہوا ہوں یا جن کے علم و فضل کے متعلق میری غائبانہ
معلومات ہیں، آپ ان میں سب سے زیادہ تفقہ فی الدین رکھنے اور اسلام کے تاریخی و
تشریحی حقائق پر بصیرت رکھنے والے ہیں۔ آپ معلومات کے سمندر، رہنما و فقیہ
سنج اور بلا کے ذہین ہیں، روشن خیال تدبیر کے بادشاہ اور روحانیت کے صاف و

شفاف آئینہ ہیں مسائل حاضرہ کو اسلامی اصول پر تطبیق دینے میں ماہر اور استنباط کی بے پناہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں ایک مستقل جدید طرز استدلال کے موجد ہیں شریعت کے مزاج شناس اور اس کے بنیادی مقاصد کے رمز آشنا ہیں اور جزئیات میں بلا ضرورت الجھنے سے محترز، باریک بین بھی اور پیکر یقین ہیں جس کی جھلک آپ کے اعمال و کردار میں بصورت عزم و ثبات نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

آپ قرآن و حدیث پر کامل عبور اور کتب دینیہ میں ماہرانہ دست گاہ اور تطبیق اور استنباط پر قدرت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ علوم جدیدہ میں بھی مہارت رکھتے ہیں، موجودہ تہذیب کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے بہترین تجزیہ اور میزانِ عدل پر موازنہ کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ تنگ نظر نہیں کہ ان کے فوائد سے منکر ہوں، لاعلم، یا سطحی معلومات کے حامل نہیں کہ ان ظلمتوں اور فریب کاریوں میں مبتلا ہو جائیں۔ اس معاملہ میں آپ کا موقف اور مطمع نظر نہایت ہوشمندانہ ہے۔

علامہ مودودی اپنے پہلو میں ایسا دل رکھتے ہیں جو مسلمانوں کی موجودہ پستی و زبوں حالی کے درد سے تڑپتا رہتا ہے اور ان کے شاندار ماضی کے عشق میں وارفتہ ہے آپ نظام اسلامی کے داعی و علمبردار ہیں آپ کا ایمان ہے پوری بصیرت اور عالمانہ تحقیق و دقتِ نظر کے ساتھ ایمان کہ انسانی زندگی کا عادلانہ اور کامیاب ضابطہ حیات اسلام اور صرف اسلام ہے، کیونکہ اسلامی نظام ہی ایسا نظام ہے جو عدل و قسط کا پیکر ہے، یہی نظام بشری رجحانات، ذاتی مصالح، نسلی

قومی اور گروہی عصبیتوں اور طبقاتی مفاد سے منزہ ہے، اسلامی حکومت کا نظریہ آپ کے اسی فکر و بصیرت اور شرح صدر کا نتیجہ ہے۔

تصنیف و تالیف کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ کتابیں حجم کے لحاظ سے چھوٹی ہونی چاہئیں تا کہ ان کا پڑھنا آسان اور پھیلنا عام ہو سکے اور اسی انداز کی انہوں نے تقریباً اپنی تمام کتب تصنیف کی ہیں جو مستقل موضوعات پر ہیں اور دیکھنے میں کتابچے اور پمفلٹ ہیں مگر اپنے معانی و مضامین کے لحاظ سے ایسے کوزے ہیں جن میں دریاؤں کو بند کیا گیا ہے۔

ہم اس واقعہ کے اظہار پر مجبور ہیں کہ مودودی ہی کی وہ واحد شخصیت ہے، جو پاکستان میں مطلوبہ اسلامی دستور کے وضع و ترتیب پر قدرت رکھتی ہے اور وہی اتنی دقّتِ نظر اور مہارت رکھتے ہیں۔ کہ اس دستور کو کتاب و سنت شریعت کے مقتضاء تشریع اسلامی کے مقاصد عامہ اور امت کے متفق علیہ اصولوں سے مستنبط اور منطبق کر سکیں۔

مودودی کی شخصیت کسی ایک ملک اور کسی ایک خطۂ زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ دنیا کے سارے مسلمانوں کو فیض رسانی کے لئے عالم اسلام کی ایک امانت ہے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی

"صاحب ترجمان القرآن کا تعارف ناظرین سے کرانا تحصیل حاصل ہے ان کی دقتِ نظر، نکتہ سنجی، بہترین خدمت دین کا ذکر ان صفحات میں بار بار آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دورِ حاضر کے فتنوں کے سدِ باب میں ابوالاعلیٰ صاحب

کا سینہ خاص طور پر کھول دیا ہے۔ اور تجدد زدہ گروہ کے حق میں ان کے قلم کی ایک ایک سطر آبِ حیات ہے۔ طبقہ علماء میں مولانا کی ذات اس حیثیت سے بہت ہی بلند و ممتاز ہے۔ وہ صحیح معنوں میں مفکرِ ملت ہیں۔"

مولانا مناظر احسن گیلانی

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ان کی سلیم فطرت، متوازن دماغ، گہری نظر پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ وہ ایک خداداد سلیقہ سے سرفراز ہیں۔ مسائل میں ان کی نظر محیط اور ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ بحث کا مشکل سے ہی کوئی ایسا پہلو باقی رہ جاتا ہے جسے ان کے قلم نے تشنہ چھوڑا ہو۔ طرزِ ادا دل نشین طریقہ تعبیر دل آویز۔ اس کے ساتھ ان کی فطرت کی بلندی کی شہادت تو متعدد بار ادا کر چکا ہوں خود خاکسار نے مولانا عبدالباری کی رفاقت میں مولانا سے جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری کی طرف ایک دفعہ نہیں بار بار توجہ دلائی لیکن جس وقت ان کے مالی ذرائع قریباً صفر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ مولانا نے ہم لوگوں کے مشورے کو مسترد فرمایا غنائے قلب کے مقامِ رفیع پر جو اپنے قدم استوار کر چکا ہو اور ذہنی اور دماغی اور تحریری و انشائی معقولیت سے ان خداداد خصوصیتوں کا مالک ہو۔ زیادہ عرض کرنے کی تو جرأت نہیں کرتا لیکن میں اتنا عرض کر دوں کہ حق تعالیٰ نے مودودی کیساتھ جو غیر معمولی فیاضیاں فرمائی ہیں اور ایمان کی جو راسخ قسم کی روشنی کم از کم مجھے ان کے سینے میں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے محمد رسول اللہ پر بے اتھاہ اور بے لاگ اعتماد کی دولت سے وہ سرفراز فرمائے گئے ہیں نیز انہی کے ساتھ مختلف قسم کی اچھی اچھی قابلیتوں کے شباب عاملین ان کے ارد گرد جمع ہو گئے ہیں۔ ان تمام ایمانی و علمی و ذہنی قوتوں کے ساتھ الدعوت

الی سبیل اللہ کو نصب العین بنا کر اگر وہ کھڑے ہو جائیں گے اور اردو انگریزی، ہندی زبانوں میں کچھ دن یہی کام کیا گیا تو ممکن ہے کہ قبول کرنے میں لوگ جلدی نہ کریں۔ لیکن اسلام جن فطری سوالوں کا جواب ہے۔ کم از کم قلوب میں ان سوالوں کے شعلے تو انشاء اللہ بھڑک اٹھیں گے۔"

مولانا قاری محمد طیب

مولانا مودودی نے اسلامی اجتماعیات کے بارے میں نہایت مفید اور قابل قدر ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اس دورِ خلط و اختلاط اور تلبیس و التباس میں جس بے جگری سے انہوں نے اسلامی اجتماعیات کا تجزیہ اور تنقیح کر کے جماعتی مسائل کو صاف کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ میں انہیں اسلامی اجتماعیات کا ایک بہترین سیاسی مفکر سمجھتا ہوں اور اجتماعیات کی حد تک انہیں ایک بہترین اسلامی لیڈر مان کر ان کی تقریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

مولانا ابوالحسن علی ندوی

"ان کا اسلوبِ تحریر، محکم استدلال، اصولی و بنیادی طریقِ بحث اور سب سے بڑھ کر ان کی سلامتِ فکر ہماری افتادِ طبع اور ذہنی ساخت کے عین مطابق تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا قلم اپنی خداداد قدرت و قابلیت کے ساتھ ہمارے بے زبان ذہن و ذوق کی ترجمانی کر رہا ہے۔ وہ وقت کبھی نہیں بھولتا جب ندوہ کے مہمان خانہ کے سامنے جو دارالعلوم کی مسجد کے پہلو میں ہے ہم چند دوستوں نے محرم ۵۶ھ کے ترجمان القرآن کے اشارات پڑھے تھے جن میں آنے والے طوفان کی خبر دی گئی تھی۔ یہ مولانا کا وہ ولولہ انگیز مضمون تھا جس کی باز گشت عرصہ تک سنی جاتی رہی۔

ہم سب لوگوں نے مولانا کی فراست، خطرہ کی صحیح نشان دہی اور قوتِ تحریر کی دل کھول کر داد دی۔ اس کے بعد بھی مولانا کے جو مضامین شائع ہوتے رہے ہمارا ذہن و ذوق ان کو اچھی طرح ہضم کرتا رہا۔"

مولانا محمد منظور نعمانی

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی خدمات اور حسنات میں جس چیز کی اس عاجز کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر ہے وہ یہ ہے کہ ہزاروں بلا مبالغہ ہزاروں ایسے نوجوان ہوں گے جو مغربی تعلیم اور اس کی تعلیم گاہوں کی الحاد پرور فضا کے اثرات سے تشکیک اور بے یقینی کی بیماری میں مبتلا ہو کر اسلام سے بالکل نکل چکے تھے یا نکل جانے والے تھے اور اس حال میں مرجانے کی صورت میں بلاشبہ جہنم میں خدانخواستہ ان کا ٹھکانہ ہونے والا تھا لیکن مولانا مودودی کی تحریروں نے اور جماعت اسلامی کی دعوتی سرگرمیوں نے ان کو نہ صرف پھر مسلمان بنا دیا بلکہ ان میں سے بہت سوں کا تعلق دین سے اتنا گہرا ہو گیا اور ان کی عملی زندگی میں دین کا ایسا رنگ آ گیا کہ بہت سے پشتینی اور موروثی دیندار ان سے سبق لیں اور عبرت حاصل کریں۔"

پروفیسر الفریڈ اسمتھ

"مولانا مودودی نے عصرِ حاضر کی اسلامی فکر پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اور ان کی جماعت پاکستان کی نمایاں ترین طاقتوں میں سے ایک ہے۔ اس تحریک نے بنفسہٖ جو لٹریچر پیدا کیا ہے وہ بہت ضخیم اور وسیع ہے۔ یہ لٹریچر زیادہ تر اردو زبان میں چھپا ہے۔ تاہم اس کے عربی اور انگریزی تراجم بھی روز افزوں سرعت کے ساتھ میسر آنے لگے ہیں۔ مودودی صاحب کا نمایاں ترین امتیاز ہی یہ معلوم

ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے خیالات کو آہستہ آہستہ اور بڑے تسلسل سے ایک مربوط اور پرکشش نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مودودی صاحب عصرِ حاضر میں اسلام کے متعلق بڑے منظم اور با اصول انداز میں سوچنے والے مفکر معلوم دیتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو ایک نظام میں ڈھالنے کے جدید رجحانات کو پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے۔ مودودی صاحب پہلے آدمی ہیں جو اسلامی قانون کو زمانۂ حاضر کا ایک مثبت اور قابلِ عمل نظام بنا کر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو ایک نظامِ حیات کی صورت میں پیش کیا ہے جس نے آج سے صدیوں پہلے بعد میں آنے والے ہر زمانہ میں بنی نوعِ انسان کو پیش آنے والے مختلف مسائل کے متعین جوابات فراہم کر رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں جو ہر نئی صبح کے ساتھ انسان کو اپنے مسائل کا خود ہی حل ڈھونڈنے کے لئے ایک نیا خدائی علم عطا کرنے کا ایک نیا جھنجھٹ مول لیتا ہو۔ جس نظامِ فکر کو انہوں نے بتدریج استوار کیا ہے۔ اس کا ماخذ اسلام کا ابتدائی عہد ہے جو گویا اس نظام کی عمارت کی اساس فراہم کرتا ہے ساتھ ہی انہوں نے کافی حد تک جدید نظریات اور افکار سے بھی استفادہ کیا ہے اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں مودودی صاحب اپنے روایت پسند کٹر قسم کے ہمعصر علماء سے بہت مختلف نظر آتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کے ذہنی اور سیاسی انتشار کے زمانے میں انہوں نے ذہین لوگوں کو اور عوام کی ایک خاصی تعداد کو متاثر کیا ہے اور اخلاقی بزاج کے طوفان میں انہوں نے اپنے مرحومہ نصب العین کے لئے بڑے جوش

خلوص اور قربانی کا عملی ثبوت دیا ہے۔

پاکستان کے مخصوص حالات کو دیکھا جائے تو اس بات کو کوئی معمولی درجہ نہیں دیا جا سکتا کہ گوناگوں بدعنوانیوں اور عام بددیانتی کے شکار اس ملک کے اندر کم از کم ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جو ان اصولوں کی جن پر وہ ایمان رکھتا تھا بڑے دھڑلے سے اشاعت کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قول و فعل کو سچا رنگ دینے کی اخلاقی جرأت و ہمت سے بھی مالامال تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ پاکستان کی اعلیٰ قیادت میں سے جو لوگ بھی مودودی صاحب کے نظریات سے متاثر ہوتے وہ ان محدودے چند افراد میں سے تھے جن کی حب الوطنی اور دیانت پر کوئی حرف زنی نہیں کر سکتا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یونیورسٹی یا اعلیٰ جماعتوں کے جو طلباء ان کے نظریات سے متاثر ہوئے وہ ان مٹھی بھر نوجوانوں میں سے تھے جو اپنے اعتقادات اور خیالات پر پوری شدت سے اپنی روزانہ زندگی میں بھی عامل تھے جس کے ساتھ وہ اپنا ذہنی رشتہ وابستہ کر چکے تھے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی

"میں اس وقت ایک نوجوان لیکن ایک بحرِ ذخّار کا تعارف آپ حضرات کے سامنے کرانے کے لئے کھڑا ہوں۔ مولانا مودودی صاحب سے علمی دنیا اچھے طور پر واقف ہو چکی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اس دور کے متکلم اسلام اور ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ یورپ سے الحاد و دہریت کا سیلاب جو ہندوستان میں آیا تھا۔ قدرت نے اس کے سامنے بند باندھنے کا انتظام بھی ایسے ہی

مقدّس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا ہے، جو خود یورپ کے قدیم وجدید خیالات سے نہایت اعلیٰ طور پر کما حقّہٗ واقفیت رکھتا ہے، پھر اس کے ساتھ ہی قرآن وسنّت کا اتنا گہرا اور واضح علم رکھتا ہے، کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر اس کی روشنی میں تسلّی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحدوں اور دہریوں نے اس شخص کے دلائل کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ اور یہ بات واضح طور سے کہی جا سکتی ہے کہ مودودی صاحب سے ہندوستان اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی بہت سی توقعاتِ دینی وابستہ ہیں۔"

بیگم مولانا مودودی[1]

"میں کئی پشت سے دلّی جیسے شہر میں رہنے کی وجہ سے شہری زندگی کی عادی تھی جب مولانا حیدر آباد سے دار الاسلام منتقل ہوئے تو میری زندگی کے لئے ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ گاؤں کا سادہ گھر نہ بجلی نہ نل نہ دوسری سہولتیں۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔

ایک دفعہ ہمارے پاس لکڑی نہ تھی۔ مولانا صبح ناشتہ کر کے دفتر چلے گئے میں حیران بیٹھی تھی کہ کیا کروں۔ گھر آئے تو کہا کہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا لکڑی نہیں ہے۔ آپ نے کہا بس اتنی سی بات کے لئے پریشان ہو یہ کہا اور ہاتھ میں کلہاڑی اٹھا کر باہر چلے گئے۔ گھر کے سامنے بغیر چری لکڑی پڑی تھی خود جا کر پھاڑنے لگے

---

[1] یہ اقتباس محض مولانا مودودی کی زندگی کی ایک داخلی جھلک پیش کرنے کیلئے دے دیا گیا ہے۔ (ا، گ)

ابھی انہوں نے ایک دو ہاتھ ہی مارے تھے کہ آس پاس کے کئی آدمی دوڑے ہوئے آئے اور آن کی آن میں لکڑی کا ڈھیر لگ گیا۔

اسی طرح ایک روز پانی بھرنے والا کسی وجہ سے پانی نہیں لایا۔ گرمی سخت تھی۔ مولانا گھر میں آئے تو میں پریشان بیٹھی تھی۔ پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے کہا پانی نہیں ہے۔ سنتے ہی دو بالٹیاں اٹھا کر کنوئیں پر پہنچ گئے اور پانی بھرنا شروع کیا۔ لوگ دیکھتے ہی دوڑ پڑے اور ذرا سی دیر میں پانی ہی پانی تھا۔ مولانا کا طرزِ عمل گھریلو زندگی میں ان تعفوا اقرب للتقویٰ ولا تنسوا الفضل بینکم رہا ہے، جو لوگ اپنی خانگی زندگی میں اصلاح اور مسرت چاہتے ہیں، انہیں چاہیئے کہ وہ خود حدود اللہ کے مستقل مزاجی سے پابند ہوں اور آپس میں تجارتی لین دین کا معاملہ کرنے کی بجائے احسان سے کام لیں۔"

ملک غلام علی

"مولانا کے ساتھ چند ماہ رہ کر ہی میں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ آپ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ مولانا کی خدمت میں تھوڑا ہی عرصہ رہ کر میں نے یہ واضح طور پر محسوس کر لیا کہ وہ اپنے باطن میں اپنے ظاہر سے بھی اور اپنی خلوت میں اپنی جلوت سے بھی زیادہ بہتر و برتر ہیں۔ ان کا دل اسلامی محبت و اخوت اور انسانی دلسوزی و شفقت کے گہرے جذبات سے بھر پور ہے۔"

مولانا امین احسن اصلاحی

میں مودودی صاحب کو ایک بڑا اور بہت بلند آدمی سمجھتا تھا۔ ایسے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں۔ مگر آج تک میں ان کو اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا جتنا وہ آج بڑے

ہو گئے تھے۔ مجھے اس کا کبھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے ان کے لئے ایک ایسی سعادت محسوس کر رکھی ہے کہ وہ اس کے دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزارہا ہستیوں میں سے چن کر ایک اونچے مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔"

آغا شورش کاشمیری

"مولانا جس مقام پر کھڑے ہیں۔ اب امتداد زمانہ کی گردشیں بھی انہیں اس مقام سے اتارنے پر قادر نہیں اور نہ ان کی علمی وجاہت اور دینی شاہت اتنی ارزاں ہیں کہ ہر کہ ومہ انہیں کانچ کی شیشیاں سمجھ کر کلوخ اندازی سے توڑ سکتا ہے۔ مولانا مودودی کے بارے میں ہمارے خیالات ہمیشہ سے والہانہ رہے ہیں۔ آج کے لوگ نہ جانیں یا ان پر بہتان تراشی کر کے اپنے نامۂ اعمال کو گندہ کر لیں لیکن وہ دن ضرور آئے گا کہ جب یہ دنیا انہیں اسلام کے محسنوں میں شمار کرے گی اور وہ اس صف میں نظر آئیں گے جہاں ہمارے بڑے بڑے دینی اکابر کھڑے ہیں۔"

نعیم صدیقی

"مولانا مودودی کے وسیع لٹریچر کے مطالعہ کو نکلئے تو آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ کہ ایک آدمی اتنا زیادہ مصروف آدمی۔ پچاس برس کی عمر میں اتنا ٹھوس علمی اور معیاری لٹریچر اتنی ضخامت کے ساتھ مرتب کر ڈالتا ہے۔ یہ لٹریچر اسلام کے بارے میں ایک انسائیکلوپیڈیائی علم کا مظہر ہے۔"

ڈاکٹر محمد عطاالرحمن

"مجھے اس شخص کے متعلق بڑی غلط فہمی تھی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے یہ

یہ تو علامہ ابن تیمیہ کا رنگ ہے۔ تعجب ہے کہ اس قحط الرجال کے زمانے میں اور وہ بھی ہندوستان میں ایسا شخص کیونکر پیدا ہوا۔ یہ شخص عملاً جب اس کام کو کریگا تو اس کی مخالفت شد و مد سے کی جائے گی۔ کیونکہ دنیا میں اہلِ حق کے ساتھ ہمیشہ یہی برتاؤ ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ لوگ ان کو قتل کر دیں۔

موسیو رشید احمد ایم۔ اے

"چودہ سال قید با مشقت۔ کیا تمہارا یہ فرسودہ اور طاغوتی نظام چودہ سال تک زندہ بھی رہ سکے گا جس پمفلٹ کے تحریر کرنے کے جرم میں مولانا کو سزائے موت اور سزائے قید سنائی گئی۔ وہ بدستور بازار میں فروخت ہوتا رہا۔ شاید یہ بھی جمہوریت کی کوئی نئی تعبیر ہے۔ اب موسیو مودودی پاکستان ہی کے نہیں عالمِ اسلام کے ہیرو ہیں۔ مستقل کردار اور بے داغ کردار مودودی کی خصوصیت ہے۔"

پروفیسر محمد عثمان ایم۔ اے

"سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے جہاں ہزاروں شاید لاکھوں ناواقف دین لوگوں نے واقفیت اور آگاہی حاصل کی ہے اور ان میں اسلام کی محبت اور رغبت پیدا ہوئی ہے۔ وہاں عملی طور پر ان کے اصولوں کو برتنے کا شعور اور شوق بھی بیدار ہوا ہے اور ان سے متاثر لوگ بالعموم جھوٹ فریب بدمعاملگی، بے حیائی، بددیانتی، رشوت، سود اور اسی قبیل کی دوسری اخلاقی اور معاشرتی قباحتوں سے بڑی حد تک بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔"

محمد اکرم ملک پامسٹ

"ہاتھ دیکھنے سے پہلے مودودی صاحب کے متعلق میرا یہ قیاس نہایت قوی تھا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک بلند پایہ انشاء پرداز اور ادیب ہیں۔ ان کی سائنٹفک اور عملی صلاحیتوں کے متعلق میری معلومات محدود تھیں مگر ہاتھ کے ذریعے جو تعارف مجھے ان کی شخصیت سے ہوا ہے۔ اور جو تغیر میرے قیاسات میں بعد ازاں واقع ہوا ہے اسے میں فقط لفظِ حیرت سے تعبیر کر سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر محمد یٰسین زبیری

"مولانا مودودی اسلام کے ان مشاہیر میں سے ہیں جن کا سکہ تمام دنیا مانتی ہے مسلمانوں کو آیندہ کئی صدیوں تک اسلامیات کا ایسا اسکالر نہیں مل سکے گا۔ ان کے عملی کارنامے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون پاکستان میں بھی ایسا بیش بہا ذخیرہ ہیں جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ حکومت اس کی بجائے کہ ایسی شخصیت سے فائدہ اٹھائے اس کے فیض کو روک رہی ہے۔"

شیخ سلطان احمد لکھنؤ والے

"مولانا مودودی کے صبر و ضبط اور سکون و اطمینان کا جب بھی میں نے کوئی اندازہ لگایا تو وہ ہمیشہ اس سے کچھ زائد ہی نکلے۔ وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے داعی اور مقتدر رہنما ہیں اور اول روز سے اس ملک میں اسلامی دستور و قوانین شرعیہ کے نفاذ کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔ مولانا کے خیالات اور طریق کار سے چاہے کوئی اختلاف کرے لیکن بحیثیت ایک جید عالمِ دین، بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مصنف اور نامور لیڈر کے مسلمانوں کے دلوں میں ان کا جو مقام اور احترام ہے۔ اس سے کوئی انکار

نہیں کر سکتا۔"

مولانا عبدالقدوس بہاری

"میں اپنے مسلمان بھائیوں، علمائے کرام، وکلاء اور زعمائے قوم سے خدا اور رسول کے نام پر اپیل کرتا ہوں۔ کہ اس بے مثال مفکرِ اسلامی بے نظیر ادیب اور علمی اللہ قومی سرمایہ کو بچانے میں ایک لمحہ ضائع نہ ہونے دیں اور فوراً ہر ممکن آئینی جدوجہد جاری کر دیں۔"

مولانا عامر عثمانی

"مولانا ہی وہ شخص ہیں جن کی ذہانت، انشاء پردازی، فہمِ دین اور بے انداز خلوص و شوق نے نہ صرف پاکستان کو بلکہ تمام دنیائے اسلام کو ایک ایسا عظیم الشان لٹریچر دیا کہ اگر کوئی قدردان ہو تو اس کے صلہ میں ہفت اقلیم بھی کم ہیں اور اس زاویہ نظر سے اگر دیکھا جائے کہ انہوں نے جدید علم و سائنس سے مسلح غالب و قوی مغرب کے قائم کردہ مضبوط محاذِ علم و فن کے مقابلہ میں اسلام کا محاذ قائم کیا۔ اس اسلام کا جو اپنوں کی غفلت اور غیروں کی سطوت کے آگے زنگ آلود تلوار بنا پڑا تھا۔ اس اسلام کا جس کے آب مصفا میں اشجارِ باطل کے ٹڈی دل گلے سڑے پتے اور گندگی کے انبار آمیز ہو گئے تھے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پیش کردہ لٹریچر کا ایک ایک صفحہ موتیوں سے تولنے کے قابل ٹھہرے گا۔"

سید حسن ریاض

"مولانا مودودی اس عہد کے وہ عالم ہیں جنہیں علومِ اسلامیہ میں تبحر حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ علومِ عہدِ حاضرہ میں بھی معقول دستگاہ ہے اور براہِ راست انگریزی

زبان کی وساطت سے سوشل سائنس، پولیٹیکل سائنس اور ایکونامکس میں ان کا مطالعہ وسیع ہے اور تحقیقی فکر و نظر کے ساتھ یہی وجہ ہے کہ تمدنی مسائل میں ان کی رائے متوازن ہوتی ہے۔ تمدنی ہم نے وسیع معنی میں کہا جو سیاست اور معاشرت سب پر حاوی ہے یقیناً ان کی آراء سے دونوں گروہوں کو وحشت ہوتی ہے ان کو بھی جن کا علم محض علوم اسلامی تک محدود ہے اور ان کو بھی جن کا علم محض اس قدر علوم حاضرہ پر مشتمل ہے جتنا کہ سرکاری ملازمت اور کاروباری زندگی کے لئے ضروری ہے۔ سب سے زیادہ وہی لوگ ان کی آراء سے وحشت کے ساتھ بیزار ہوتے ہیں جن کی اسلامی یا مغربی تعلیم محدود ہے۔ دائرہ فکر تنگ ہے اور معاملات زندگی پر محض خود غرضی کے ساتھ یا پراگندگی کے ساتھ سوچتے ہیں۔

مودودی کا اصلی جرم اسلام پسندی ہے، حق گوئی ہے اور بیباکی ہے۔ یہ آئین جواں مرداں ہمارے حکمرانوں کو بالکل پسند نہیں ہے۔"

محمد یعقوب طاہر

اے مردِ خدا میں تیری ہمت کے تصدق
ہر لب پہ ہے فریاد تو ہر چشم ہے گریاں
ابلیس کے ہر شر سے خدا تجھ کو بچائے
وہ کون ہے چھلنی نہیں جس کا یہاں سینہ

○

رزمی امروہوی

حرفِ برہنہ کہہ کے سرِ بزم کافری
رسم قلندری کو کیا تازہ آپ نے

راہِ خدا میں جان کی بازی لگائی ہے
یہ دور ہے یزید تو شبیر آپ ہیں
ٹھہری نہ جس کے سامنے تہذیبِ نو ذرا
سچ پوچھئے وہ سیلِ جہاں گیر آپ ہیں
چشمِ حق بیں اندریں عصرِ جدید
ہمسرِ سیّد ابوالاعلےٰ نہ دید
فکرش از صدق و یقین ندیں قباست
کارِ او احیائے دینِ مصطفےٰ است

○

رشدی القادری

اک عطیہ تیری ہستی یعنی تیری ذات ہے
اس صدی میں عظمتِ اسلام کی سوغات ہے

○

ماہر القادری

تری فکرِ رسا نے خاک کے ذروں کو چمکایا
کہ تو سچ مچ فلک سے چاند تارے توڑ کر لایا
تری فطرت میں ہے سنجیدگی بھی استقامت بھی
مسرت میں نہ اترایا، مصائب میں نہ گھبرایا
ترے سودو زیاں کا ہے رضائے دوست پیمانہ
کہ تو نے ہر قدم پر عشرتِ باطل کو ٹھکرایا

○

اربابِ ادب وصحافت کی آراء

ایڈیٹر چراغ راہ کراچی

"مولانا مودودی ان لیڈروں کی طرح نہیں ہیں، جو کسی ہنگامی تحریک اور وقتی حالات کے سبب لوگوں میں مقبول اور مشہور ہو جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک داعیٔ حق کی ہے۔ وہ ایک مشن نصب العین اور پیغام کو لے کر اٹھے ہیں۔ ان کی بلند پایہ اور بے مثل تحریروں نے۔ ان کی عالمانہ تقریروں نے۔ ان کے قول وفعل کی صداقت نے ان کے خلوص وایثار نے اور ان کے کردار نے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ بلکہ دلوں میں گھر بنایا ہے۔"

ایڈیٹر جہانِ نو کراچی

"مودودی محض ایک گوشت پوست کا انسان نہیں ہے وہ اس ملک کے قلب کی دھڑکن ہے۔ وہ اس ملّت کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ وہ اس قوم کے لئے پہاڑی کا چراغ ہے۔ وہ امید کی کرن ہے۔ وہ پیغامبرِ بہار ہے۔ وہ تمنائے دِل ہے۔ وہ شمعِ آرزو ہے۔ وہ نشانِ منزل ہے۔ آنیوالے اخلاقی انقلاب کا داعی اور رہنما ہے وہ ایک اصول ہے۔ ایک تحریک ہے۔"

منبر الشرق قاہرہ

"مصر کی ساری دینی جماعتیں مولانا مودودی کو ایک مخلص عالم اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں صفِ اوّل کا ایک جلیل القدر مجاہدِ صادق سمجھتی ہیں۔"

ایڈیٹر الدعوۃ قاہرہ

"مولانا مودودی کی سزائے موت۔ محض ایک فردِ بشر کی موت کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اسلام کی تلواروں میں سے ایک تلوار کو توڑ دینا۔ اسلام کی آوازوں میں سے ایک آواز کو خاموش کر دینا اور اسلام کے وقار و اعزاز کو مٹا دینا ہے۔ آہ وہ حرکت جس پر دشمنانِ اسلام مسرت کے شادیانے بجائیں گے۔"

ایڈیٹر السجل بغداد

"علامہ ابوالاعلیٰ مودودی۔ وہ مردِ حق آگاہ جس کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ کہتا ہے "کہ میرا رب اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

ایڈیٹر سیاست جدید کانپور

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی! آپ کو ہمارا اسلام۔ آپ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لئے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ ہمیں آپ کی جماعت سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اختلاف کے باوجود ہم کو اس کا اعتراف ہے۔ کہ آپ رسولؐ پاک کی اُمّت کی راہبری کے لئے پھانسی کے تختے پر چڑھ سکتے ہیں۔ آپ جب ملک العلّام کے پاس جائیں اور آپ سے سوال کیا جائے۔ کہ آپ پر کس گناہ کے سبب ظلم کیا گیا تو آپ یہ ضرور کہیئے گا کہ آپ کے حبیب پاک کو خاتم النبیّین ثابت کرنے کے جرم میں مجھے تختۂ دار تک پہنچایا گیا۔ مولانا مودودی! آپ کو ایک دور افتادہ ہندوستانی مسلمان کا سلام قبول ہو۔"

ایڈیٹر نئی دنیا دہلی

"مولانا مودودی جن کا پاکستان ہی میں نہیں پاکستان کے باہر بھی ایک خاص حلقہ

ہے۔ اور ہزار نظریاتی اختلاف کے باوجود ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے"۔

ایڈیٹر روشنی بنگلور

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا وجود مسلمانوں کے لئے ایک متاع گراں مایہ اور ان کا پاکیزہ لٹریچر ملّتِ اسلامیہ کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ان کی مجتہدانہ بصیرت اور ان کے مذہبی اجتہاد نے دنیائے اسلام میں ایک انقلاب برپا کر رکھا ہے ملّتِ اسلامیہ کا ہر صاحبِ فکر مسلمان ان کی دعوت و تحریک سے بے حد متاثر ہے"۔

"ان کی دعوت۔ ان کا خطاب۔ ان کا اجتہادی استدلال۔ ان کا تدبّر۔ ان کا تبحر علمی ان کی طبیعت کا رجحان۔ دینی مسائل اور احکام شریعت میں ان کی بالغ نظری ان کا تدبر فی القرآن۔ تمسک بالکتاب۔ ان کا تفکّر فی الحدیث اور تفقہ فی الدین ان کا سنجیدہ اور معقول طرزِ بیان اسلامی تعلیمات کا صحیح آئینہ دار ہے۔ اسرارِ شریعت اور احکامِ دین کی اصل روح پر انہیں لاجواب بصیرت حاصل ہے۔ قلم و زبان پر بھی انہیں بے نظیر قدرت حاصل ہے۔ ان کی کوثر میں دھلی ہوئی تحریر کی جولانیاں۔ تحقیقاتی موشگافیاں۔ ان کا رسوخ فی العلم۔ ان کی وسیع النظری، دور اندیشی۔ ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت۔ ان کا بلند کردار۔ ان کی اعلیٰ فراست اور ان کا معیارِ فضیلت غیر معمولی اور حیرت انگیز ہے"۔

"اپنے قلم اور زبان سے ملّتِ اسلامیہ کی انہوں نے جو خدمت کی ہے۔ وہ ناقابلِ فراموش ہے"۔

ایڈیٹر الکلام بمبئی

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو کون نہیں جانتا کہ موصوف

کی زندگی تمام ریاکاریوں سے پاک ہے۔ آپ نے ذاتی عزو وقار کے لئے اسلام کو کبھی بھی ڈھال نہیں بنایا۔ آپ نے اپنی قلم اور زبان کی ساری طاقت ہمیشہ خدائی احکام کی تبلیغ، باطل کی سرکوبی اور اسلام کے اصولیات کی ترویج میں صرف کی ہے۔

ایڈیٹر الانصاف الہ آباد

" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان سے اس " لامذہبیت " کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو مذہب کے پردے میں ہو رہی ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ ایک طویل عرصے سے کوشاں ہیں۔ انہوں نے لیاقت علی خان مرحوم کے زمانے میں ایک قرارداد مقاصد (Objective Resolution) پاس کروانے پر زور دیا اور اس میں کامیاب ہوئے جس کا مقصد پاکستان کو نام کی نہیں بلکہ کام کی اور خالص اسلامی ریاست بنانا ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے " اسلامی دستور " کا مطالبہ اٹھایا۔ پاکستانی عوام کو اس دستور کی خاطر متحد کیا۔ پاکستان کے علماء کو متحد کیا پاکستان کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو جھنجوڑا اور پوری طاقت سے ایک آواز اٹھائی۔ جس کے اثر سے پاکستان کی حکمران جماعت نے کچھ دب کر جدید دستوری سفارشات پیش کر دیں۔

ایڈیٹر نئی روشنی کراچی

" مولانا مودودی کو سزائے موت کا حکم سن کر کمیونسٹوں کے گھر میں گھی کے چراغ جل رہے ہیں۔ کیونکہ کمیونسٹ یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا مودودی اور ان کی جماعت کی موجودگی میں پاکستان میں کمیونزم نہیں پھیل سکتا۔"

ایڈیٹر ہفت روزہ کمنٹ کراچی

" مولانا کا شمار پاکستان کے چوٹی کے

مفکرین، مصنفین اور مقررین میں ہوتا ہے۔ بعض دوسرے نکات بھی غور کرنے کے قابل ہیں۔ صوبائی فرقہ وارانہ۔ اور جغرافیائی رجحانات پاکستان کے حق میں سخت مضر اور مہلک ہیں۔ مولانا مودودی اور ان کی جماعت لائقِ تعریف ہے کہ انہوں نے ان تمام چیزوں سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھا۔"

ایڈیٹر وطن گجراتی کراچی

"مولانا مودودی کوئی معمولی شخصیت نہیں بلکہ ایک جلیل القدر عالم اور عالمِ اسلامی کی دماغی پونجی ہیں۔

مولانا مودودی علماء کے اس طبقہ سے نہیں ہیں۔ جن کو تنگ نظر اور متعصب ملا کہہ کر کچھ مغرب زدہ پڑھے لکھے جاہل جو تھوڑی سی انگریزی پڑھ کر اپنے آپ کو بڑا اہلِ علم سمجھتے ہیں۔ گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ مولینا مودودی اُن جلیل القدر علماء میں سے ہیں جنہوں نے جیل کی تاریک کوٹھڑیوں اور پھانسی کے تختہ پر بھی اسلام کی خدمت انجام دی ہے۔"

ایڈیٹر جھنکار کراچی

"مولانا کی قابلیت۔ علمیت اور ذہانت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اسلام کی جو خدمت اب تک کی ہے اور کرتے رہے ہیں وہ اپنی جگہ مسلّم ہے۔"

ایڈیٹر ماہنامہ مشیر کراچی

"آپ پاکستان میں مطالبۂ نظامِ اسلامی کے علمبردار ہونے کے علاوہ عصرِ جدید کے ان روشن خیال اور ترقی پسند علمائے حق میں سے ایک ہیں۔

جو اس الحاد و ظلمت کے زمانہ میں اسلام کو اس کے حقیقی معنوں میں ایک نظام حیات کی حیثیت سے نہ صرف پاکستان میں بلکہ ساری دنیا میں بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس مقدس نصب العین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں۔ آپ اپنی دینی بصیرت اور علوم دینی میں ایک جید عالم کی حیثیت سے صرف پاکستان کے عوام ہی میں احترام و عقیدت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی وہ اپنے علم و فضل اور دینی بصیرت کی وجہ سے ایک خاص وقار اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔"

ایڈیٹر مسلم گجرات سورت

• سید ابوالاعلیٰ مودودی کوئی معمولی مُلّا مولوی نہیں ہیں۔ وہ موجودہ اسلامی دنیا کے مفکر اور مدبر ہیں۔ وہ اسلام کی تبلیغ اور احیاء کے ایک مخصوص، ممتاز اور اچھوتے طریقہ کے موجد ہیں۔ وہ یقیناً الاخوان المسلمون کے رہنما حسن البنا شہید کے ہم درجہ رہنما ہیں۔ ان کی اعلیٰ شخصیت کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کرنے کے لئے ان کے خیالات سے متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ ان کے کسی مخالف کے لئے یہی کافی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی تنظیم اور اسلام کے احیاء کے سلسلہ میں ٹھوس تجاویز پیش کیں اور دل نشین دلیلوں کی طاقت سے اپنے مشن کے لئے ایک فعال جماعت تیار کر لی ہے۔ اس حقیقت کا ان کے مخالفین کو بھی سوائے اعلیٰ طبقہ کے منافق افراد کے۔ اقرار ہے۔"

ایڈیٹر ہفت روزہ منصف کراچی

• مولانا نے ایک سو سے زیادہ کتابیں اسلام کے مختلف موضوعات پر

لکھی ہیں۔ ہر کتاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اور ہر کتاب معترضین شعائر اسلام کے لئے ایٹم بم ہے۔ آپ اسلام اور شعائر اسلام کے دالہ و شیدا ہیں آپ ایک صلح پسند عالم ہیں۔ ڈھیلے اور استنجا کے مسئلوں پر ڈنڈے بازی کرنے والے مولوی نہیں ہیں۔ آپ کی متعدد تقریریں اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اس وقت جب کراچی میں دستور ساز اسمبلی کے اجلاس ہو رہے تھے مولانا نے آرام باغ اور جہانگیر پارک میں بڑی معانی خیز اور شاندار تقریریں کیں تھیں۔ جن کا ہر جملہ امن و صلح کا ضامن تھا۔ مولانا مودودی کی تقریر جذباتی اور وقتی نہیں ہوتی بلکہ ایک حقیقت۔ ایک صداقت اور ایک مفید نتیجہ کی حامل ہوتی ہے۔"

ایڈیٹر روزنامہ پاسبان ڈھاکہ

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے ان کی خدمات ابھی کسی سے پوشیدہ نہیں مولانا کی اسلام پسند فطرت کا معترف غیر سرکاری حلقے کے علاوہ سرکاری حلقہ بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ حلقہ مولانا کے بعض خیالات سے متفق نہیں۔"

ایڈیٹر روزنامہ ستارہ ڈھاکہ

"مولانا مودودی کی حیثیت پاکستان میں ایک بلند پایہ جید عالم دین کی ہے۔ سیاسی طور پر ان سے اختلاف ہی سہی جہاں تک۔ ان کے عالم دین ہونے کا سوال ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور اس لحاظ سے ہر مسلمان ان کی قدر کرتا ہے۔ عالم دین نائب رسولؐ ہوتا ہے۔ اور مسلمان جانتے

ہیں کہ ایک عالم دین کی بے حرمتی دین کی بے حرمتی ہے۔"

الجمعیت سرحد پشاور

"حضرت مولانا مودودی صاحب نے مسلم لیگ تحریک کی وہ خدمات کی ہیں جو کسی اور سے نہ ہو سکتی تھی۔ جداگانہ قومیت کا مدلل تصور انہوں نے ہی مسلمانوں کو دیا اور مسلمانوں نے علیحدہ قومیت کے لئے دلائل مولانا مودودی سے ہی حاصل کئے۔ آپ اسلام کی تعلیمات کے موجودہ وقت میں سب سے بڑے داعی، مفکر اور عالم ہیں۔"

ایڈیٹر نوائے سندھ حیدرآباد

"مولانا جلیل القدر عالم دین اور سنجیدہ اور متین طبیعت کے مالک ہیں اور ان کے متبعین اور معتقدین کا حلقہ وسیع ہے۔"

ایڈیٹر آفتاب حیدرآباد

"مولانا مودودی کی سزا کسی ایک جماعت کے سیاسی لیڈر کی سزا نہیں بلکہ ملک کے جید عالم دین کی سزا ہے جس کو لوگ پارٹی کی سطح سے بلند ہو کر محسوس کر رہے ہیں۔

"یہاں کے مسلم لیگی جماعت اسلامی والے وکلاء، ڈاکٹرز، زمیندار اور تاجر سب اس محور کے گرد جمع ہو گئے کہ اسلامی آئین کے سب سے بڑے مجاہد مولانا مودودی کو ختم نہ ہونے دیا جائے۔

ایڈیٹر قاصد کوئٹہ

"مولانا مودودی موجودہ اسلامی دنیا کی واحد شخصیت ہیں جنہوں نے اس وقت

میں از سرِ نو اسلامی نظامِ حیات کی وہ عالمگیر انقلابی تعبیر پیش کی ہے جس سے یورپ کی ڈیموکریسی کے پرستار اور روس کی اشتراکیت پر ایمان رکھنے والے دونوں خائف ہیں لیکن جو حقیقت میں عین منشائے الٰہی اور مقصدِ قرآنی کے مطابق ہے، جسے بروئے کار لانا اور نافذ کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے بلکہ جس کے بغیر مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ مولانا پاکستان میں نظامِ اسلامی کے سب سے بڑے داعی ہیں۔ اسلامی دستور کی اس تعبیر کو جو قرآن و سنت کی روشنی میں آپ نے پیش کی ہے، علمی اور عقلی طور پر جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اسلام حاکمیت الٰہی کی اساس پر اجتماعی عدل کا قیام چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے اس نظریۂ سیاسی سے بندوں کی خدائی پر خواہ وہ اشتراکیت کی صورت میں ہو یا مغربی جمہوریت کے بھیس میں ضرب کاری پڑتی ہے اور یقیناً وہ طبقہ اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتا جو مختلف خوش نما پردوں میں اپنی خدائی قائم کرنا چاہتا ہو۔"

ایڈیٹر دشمن کوئٹہ

"مفکرِ اعظم اور اسلام کے فلسفیِ اعظم کے متعلق ایک من گھڑت مقدمہ گھڑ کر ایک دردناک سزا کا مستوجب ٹھہرایا جانا انتہائی ظلم و زیادتی اور ڈھٹائی ہے۔"

ایڈیٹر کائنات بہاولپور

"مولانا مودودی اور ان کے ساتھ بعض علماء بالکل ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے اسوۂ حلم و تقویٰ کے مقلد ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کا علم و تقویٰ پاکستان کی مذہبی نیز دینی روایات کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔

مولانا مودودی ایک عدیم المثال مفکر اور بے نظیر اہل علم ہیں ان کی سیاست

سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے علم کی جلالتِ شان اور ان کا تقویٰ و طہارت ہر آدمی کے نزدیک مسلم ہے۔"

ایڈیٹر ستلج بہاولپور

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے علمبردار ہیں میاسیاست پاکستان میں مولانا کا ایک منفرد مقام ہے اور وہ عصرِ حاضر کے آئین سازوں کے مدمقابل آئینِ اسلامی کی تحریک کے سب سے بڑے قائد ہیں وہ اس طریقِ حیات کے علمبردار ہیں جو موجودہ برسرِ اقتدار گروہ کی زندگی سے متصادم ہے۔ مولانا مودودی کے نعرے کا اثر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ میدانِ سیاست میں اس کا کوئی توڑ نہیں۔"

ایڈیٹر الامام بہاولپور

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سزائے موت سن کر بڑی حیرت ہوئی ہے۔ ایک ایسے جید عالم کو جس کا دامن غیر آئینی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں سے بالکل پاک ہے سزائے موت دینے کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ حکومت کو مذہبی تقاضوں کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں۔ وہ نہ خود مذہبی تقاضوں کو پورا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ بلکہ جو شخص حزم و احتیاط کے ساتھ بھی آئینی حدود میں رہ کر اس بارے میں کام کرتا ہے یا کرے گا حکومت اسے موت کے گھاٹ اتارنے پر تل چکی ہے۔ اگر ایسے جید عالم کو جو ایک بلند کردار رکھنے والی جماعت کے قائد بھی ہیں۔ ایسے ناپاک طریقہ سے سزائے موت دی جا سکتی ہے تو پھر یہاں ایک عام شہری کے مال و جان کی حفاظت کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔"

ایڈیٹر الہام بہاولپور

"جہاں تک مولانا مودودی کی ذات کا تعلق ہے بے شک وہ دنیائے اسلام کے ایک بلند پایہ عالم اور دورِ حاضر کے بہت بڑے مجتہد ہیں وہ واقعی بیک وقت بہترین مفکرِ اعلیٰ فلسفی کامیاب سیاست دان، بلند پایہ ادیب اور پختہ کار صحافی ہیں اور میری نظروں میں وہ پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد اسلام کو جدید تقاضوں کی روشنی میں سمجھا اور پھر ایک نئے ڈھنگ اور نئے انداز کے ساتھ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور مجتہدانہ مساعی سیاست و وزارت کی نذر ہو کر رہ گئیں، مگر مولانا مودودی ان منتشر حالات کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور مجتہدانہ صلاحیتوں سے ان افکار کو ایک ٹھوس اور منظم تحریک میں بدل دیا۔ انہوں نے نظامِ حیات کے ہر پہلو پر اسلام کی روشنی میں غور کیا اور اپنے منطقی اور عقلی دلائل و براہین سے اسلام کی ہمہ گیری اور وسعت کو دنیا سے تسلیم کرایا۔ انہوں نے دستورِ اسلامی پر سب سے زیادہ لٹریچر لکھا اور ہزاروں لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ حقیقت میں اسلامی دستور کے سامنے دنیا کے تمام دساتیر ہیچ ہیں۔ اور ان تمام دستوروں میں بہت حد تک اسلام ہی کے اصولوں کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔"

ایڈیٹر رفیق بہاولپور

"سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک اعلیٰ خاندان کے فرد ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے ان ہزاروں، لاکھوں اکمو ڈرل افراد کو جو بے دین ہو چکے تھے عقلی

دلائل سے راہِ راست پر لانا ابوالاعلیٰ کا وہ کارنامہ ہے جسے تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ پارٹیشن کے بعد ہم نے بچشمِ خود دیکھا کہ مولانا مودودی ایک طویل مدت تک والٹن کیمپ میں رہے اور جب تک رہے اپنی جیب سے ہزاروں خانماں برباد مہاجروں کو کھانا کھلاتے رہے۔ پہننے کے کپڑے اور رضائی و لحاف کی تقسیم کے علاوہ اپنی جماعت کے ڈاکٹروں طبیبوں سے بیکس و بے بس مہاجرین کے علاج کرواتے رہے اور اس خدمتِ خلق میں اپنے ہزاروں لاکھوں روپے قربان کر دیئے۔ باوجود اس کے کہ آپ انڈیا میں لاکھوں کروڑوں کا اثاثہ اور پراپرٹی (جائداد) چھوڑ کر آئے تھے۔ لیکن آپ نے اپنے پاکستان میں مہاجرین کی اکاموڈیشن (آباد کاری) کے پیشِ نظر ایک انچ زمین الاٹ نہیں کروائی، بلکہ اچھرہ لاہور میں آج تک کرائے کے مکان میں رہے۔ کیا آپ ہی علامہ اقبال کے خصوصی احباب میں سے نہیں ہیں؟ جنہیں علامہ اقبال مرحوم نے بطورِ خاص لاہور میں بلوا کر پٹھان کوٹ میں قیام پر مجبور کیا تھا تاکہ مسلمان قادیانیت کے نجس و مکروہ عزائم سے محفوظ رہ سکیں۔ کیا آپ انڈیا بھر کے وہ واحد لیڈر نہیں ہیں جن کی جدوجہد نے ان ہزاروں اور لاکھوں بی اے اور ایم، اے کی اعلیٰ ڈگریوں کے مالک حضرات کو دوبارہ مسلمان بنایا جو کمیونزم اور دہریت کے پھندوں میں بری طرح پھنس چکے تھے پارٹیشن سے پہلے تک ان کی ہندوستان بھر میں انتہائی عزت تھی۔ پاکستان کے اربابِ اقتدار نے ان کے نعرہ اسلام کو اپنے حق میں دو دھاری تلوار سمجھتے ہوئے انہیں مُلا مُلا کہہ کر پبلک میں رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔

موجودہ زمانہ میں پوری سچائی کے ساتھ (علماء میں سے) اسلام کو صرف مولانا مودودی ہی نے پبلک کے سامنے پیش کیا ہے اور اپنی عملی تفسیر سے سب کے لئے اسلام کو سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ وہ ایسے مفکر ہیں جن کی ساری زندگی شرافت و اخلاق کا زندہ نمونہ ہے جو پاکستان کے ایسے جید عالم ہیں جو انگریزی، عربی، فارسی اُردو کے علاوہ بعض دیگر یورپی زبانوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔"

ایڈیٹر سائینٹک ڈھاکہ

"مولانا مودودی جیسے باشعور و ماہر اصحاب اللہ تحریک اسلامی کے سرکردہ قائدین نے راست اقدام کے جنون سے باہر رہ کر عوام کو اس سے بچانے کی کوشش کی مگر حکومت کی جلائی ہوئی آگ اتنی تیز اور سازش اتنی گہری تھی کہ مولانا مودودی جیسے اسلامی لیڈروں کی ہزار کوششوں کے باوجود عوام کو اس آگ سے دور رکھنا ممکن نہ ہوا۔"

ایڈیٹر مجلہ الصابر الجزائر

"مودودی کی شخصیت کسی ایک ملک اور کسی ایک خطۂ زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ دنیا کے سارے مسلمانوں کو فیض رسانی کے لئے عالم اسلام کی ایک امانت ہے۔"

انجمنیں اور ادارے

مسلمانان انگلستان

"پاکستان کی ترقی و استحکام و خوش حالی کے لئے جو لوگ سب سے زیادہ کام

کر سکتے ہیں۔ ان میں ان علماء و مفکرین کی خدمات کی از حد ضرورت ہے جن میں تفقہ فی الدین کے ساتھ ساتھ یہ بھی صلاحیت ہو کہ وہ اسلامی اصول و احکام کو موجودہ زمانے کے احوال و ضروریات پر منطبق کر سکیں۔ اسی قسم کے ذی علم اور اصحاب بصیرت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا شمار ہوتا ہے۔"

مسلمانانِ انڈونیشیا

"مودودی صاحب دنیائے اسلام کی امانت ہیں۔ مولانا صاحب کی اگر پاکستان کو ضرورت نہیں تو دنیائے اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔ ہم انڈونیشیا کے مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے خیالات کی آج مسلم دنیا کو اشد ضرورت ہے۔"

پاکستان مجلس تمدن مشرقی پاکستان

"مولانا مودودی کو سزا نہیں دی جا سکتی مشرقی پاکستان آپ کے ساتھ ہے۔ اللہ ہم سب کی مدد کرے۔"

ہائیڈز اینڈ اسکنز مرچنٹس ایسوسی ایشن کراچی

"موجودہ زمانے میں مولانا صاحب کی شخصیت مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑے مفکرِ اسلام اور مفسرِ قرآن کا درجہ رکھتی ہے تعلیم یافتہ طبقہ میں مولانا نے جس طرح سے اسلام کو پیش کیا ہے۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔"

(۷)

دعوت، مشن اور اس کے اثرات

سید احمد شہیدؒ بریلوی کی دعوتِ جہاد و نفاذ نظامِ اسلامی کے خلتے کے بعد برِصغیر ہند و پاکستان میں دعوتِ اسلامی کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کی تحریک پان اسلامزم بھی مسلمانوں کی رگوں میں حرارت کا ایک شعلہ بھڑکا کر سرد ہو چکی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بلند بانگ دعوت بھی چند ایام تک مسلمانوں کو گرمانے کے بعد رخ بدل گئی تھی۔ علامہ اقبال اپنی دھیمی دھیمی آنچ سے مسلمان نوجوان کو سرگرمِ عمل کرنے کی سعی میں مصروف تھے۔ لیکن بظاہر کسی منظم دعوت کسی منضبط پیغام اور کسی مدلل اور دلنشین پکار کے اٹھنے کے امکانات دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی پکار نے جھنجوڑا تھا لیکن مسلمان عالمِ وحشت و حیرانی میں بے سمجھ کی طرح ہر پکار پر کان کھڑے کرتا چند قدم اس کے ساتھ چلتا اور پھر افسردہ دل ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ لوگ جو ایک دینی دعوت کے متمنی اور اقامتِ دین کے شیدائی تھے۔ انہیں اب یہ راستہ ویران اور ان کی امیدیں افسردہ نظر آتی تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ شاید امام مہدی سے پہلے اب اس دعوت کا علم کوئی لے کر اٹھنے کی ہمت نہ کر سکے گا۔

اک مردِ خدا اٹھا

لیکن مولانا مودودی نے ہمت کر ڈالی۔

"ترجمان القرآن" کے تشویشناک مالی حالات کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسری کی پیشکش اور انتہائی گریڈ کے مقابلے میں مولانا مودودی کے برادر بزرگ کے ۴ گھنٹے تک سمجھانے اور قوم کی پست ہمتی اور پست خیالی کی حالت بتانے کے باوجود اس افہام و تفہیم کے جواب میں مولانا مودودی نے کہا۔

"اب وقت ضائع کرنے کا وقت نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری آواز میں خلوص ہوا تو میرا جذبہ ناکام نہ جائے گا۔"

ان کے بھائی کا کہنا ہے کہ تقریباً ۴ گھنٹے تک اس موضوع پر ان کی مودودی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ اس دوران میں مودودی صاحب کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ۔

"حالات بہت نازک ہو چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو سیلاب آنے والا ہے وہ ۱۸۵۷ء کے انگریزی اقتدار کے سیلاب سے بھی کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوگا۔ مسلمانوں کو اس کے خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اپنی ہمت کے مطابق میں ان کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔"

چنانچہ مولانا مودودی نے اپنی قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کر لیا۔

"ترجمان القرآن" کے ذریعے مولانا مودودی نے تقریباً ۱۹۳۳ء سے تعمیر افکار و اصلاح کردار کا کام شروع کر دیا۔ یہ ایک دیرپا، جاں گسل، صبر آزما اور جگر دوز کام تھا جو انہوں نے برسوں تک جاری رکھا۔ مالی مشکلات کے سنگین مراحل آئے لیکن وہ ہمت و جرأت اور صبر و توکل کے ساتھ اس مشکل ترین راستے پر چلتے رہے۔ سب سے پہلے ایک طویل عرصے تک انہوں نے باطل کے پیدا کردہ نظام فکر اور مقبول

اقبال ؒ حاضر و موجود پر سخت ترین تنقیدیں کر کے اس کا کھوکھلا پن نمایاں کیا جو لوگ اس نظام مکر پر مطمئن تھے انہیں غیر مطمئن کیا جو غیر مطمئن تھے ان کے سامنے مثبت لائحہ عمل رکھ کر انہیں یکسو کیا جو یکسو ہو گئے ان میں اپنے اپنے ماحول میں فکر و عمل کی اصلاح کا شعور پیدا کر کے انہیں اصلاحِ احوال اور تبدیلی حالات پر تیار اور آمادہ کیا اور جو آمادہ ہو گئے انہیں ایک نظم و ضبط کے تحت سلیقے اور تندہی سے منظم کام کرنے اور اجتماعی نتائج پیدا کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔ یہ کام وہ مدت تک کرتے رہے۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وطنی اور ملکی حالات نئے نئے تقاضے لے کر ان کے چاروں طرف منڈلاتے رہے۔ فوری علاج کے مطالبے اٹھتے رہے لیکن وہ پہاڑ کی طرح گرد و پیش سے بے نیاز مسلم قوم کی اصلاح کے ایک ہی پروگرام "قرآن کو ہاتھ میں لو۔ اپنی زندگی پر آزماؤ اور ساری دنیا پر چھا جاؤ" پر پیہم عمل کرتے رہے۔ ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ اسلام محض بطور فلسفہ حیات کے اپیل نہیں کر سکتا۔ وہ تو نظامِ زندگی ہے جب تک اس کا نمونہ زندگی میں منظر پر نہ آئے گا زبانی جمع خرچ کرتے رہنے سے اسلام کی کوئی خدمت نہ ہو سکے گی۔

قبرستان سے زندوں میں

علامہ اقبال کے اس مشورے پر کہ جو دعوت آپ پیش کر رہے ہیں۔ یہ کسی [illegible] ریاست سے اٹھنا سود مند نہیں ہے۔ انگریز والئی ریاست کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا سکتا ہے اس لئے غلامی در غلامی کے ماحول سے نکل کر آپ کا انگریزی علاقے میں آ جانا بہتر ہے۔ چنانچہ ان کی دعوت پر مولانا ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن سے منتقل ہو کر پنجاب تشریف لے آئے اور ادارہ دارالاسلام قائم کر کے اپنے مشن اور دعوت کے لئے

مساعی کو تیز تر کر دیا۔

پنجاب کا ماحول اپنی سرکار پرستی کے باوجود مولانا کی دعوت اور مشن کے لئے بڑی حد تک سازگار رہا۔ یہاں لوگوں میں تجسس کا مادہ تھا ہر نئی شے کی ماہیت جاننے کی طلب بھی تھی اسلام سے پُرجوش لگاؤ تھا اور سیاسی شعور بڑی حد تک حیدر آباد دکن کے مقابلے میں زیادہ بیدار تھا۔ اگرچہ انگریز پنجاب کو ہی اپنے لئے سب سے زیادہ محفوظ خطہ سمجھتا تھا اس لئے کہ اسے یہاں سے فوج کیلئے عمدہ گیہوں اور عمدہ جوان ملتے تھے لیکن قوی جسم، عموماً قوی دماغ اور قوی جذبات بھی رکھتے ہیں اس لئے یہاں کے لوگوں نے مولانا کی دعوت پر زیادہ توجہ دی اور تجسس و تفتیشِ احوال کا سلسلہ فوراً شروع ہو گیا۔ چنانچہ بقول مولانا مودودی۔

"میں نے اچانک محسوس کیا کہ قبرستان سے منتقل ہو کر زندہ انسانوں کی بستی میں آگیا ہوں جو مجھ سے میرا مقصد، پروگرام لائحہ عمل اور طریق کار پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے اور اطمینان حاصل ہونے پر تعاون کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں"

پنجاب آکر مولانا نے اپنے مشن کا آغاز مبارک پارک پونچھ روڈ لاہور سے کیا اس مقام کو یہ تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ فرنگیت اور دہریت کے خلاف عملی اور فکری، نظریاتی اور علمی جہاد کا آغاز یہیں سے ہوا۔ مولانا کی دعوت خالص اصولی اور اسلامی دعوت ہے وہ عصبیتوں اور جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔ ان کے پیش نظر اسلام کے متعین اصول ہیں، جو ان کو مانے، مان کر انہیں اپنے اوپر نافذ کرے۔ نافذ کر کے ان کے سامنے تعاون کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ وہ ان کا ساتھی ہے چاہے وہ معاشرے میں کسی پست ترین مقام کا آدمی بھی کیوں نہ ہو اور جو ان اصولوں سے

منحرف ہو۔ انہیں اپنے اوپر نافذ کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ اس کی طرف سے بے نیاز ہیں چاہے وہ معاشرے میں کسی بلند ترین مقام پر ہی فائز کیوں نہ ہو۔

دعوتِ اصلاح

مولانا کی دعوتِ اصلاح کا پروگرام چار نکات پر مشتمل ہے۔

- تطہیر و تعمیر افکار
- اصلاح ذات
- اصلاح معاشرہ
- اصلاحِ نظامِ حکومت

کام کی ابتداء سب سے پہلے افراد کے خیالات و افکار کی اصلاح سے ہوتی ہے جو بالآخر ذات کی اصلاح کے قوی داعیہ پر منتج ہوتی ہے اور جب فرد فرد اس ذہنی انقلاب سے متاثر ہونے لگے تو یہ ایک عام رو چل پڑتی ہے جس کی تکمیل صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب نظامِ حکومت بھی اس اصلاحی کام میں معاون و مددگار ہو۔ مزاحم و مخالف نہ ہو۔ اس لئے اقتدارِ مملکت کی اصلاح فرد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلامی انقلاب کے اصلاحی پروگرام کا بنیادی پتھر ہے۔ یہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقِ اصلاح کا لازمی جزو ہے جس کے بغیر اصلاح کا تصور محض سراب ہے

لیکن یہ طریقِ کار چونکہ صبر طلب اور مشکل ہے۔ اس لئے فوری نتائج کے طالب اور جلد باز لوگ اس راہ پر تھوڑی دور چل کر نکل بھاگتے ہیں جیسے کہ مولانا نے خود ایک موقعہ پر اپنی قوم کی اس بے صبری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

کسی ہنگامی کام کے لئے سینے پر گولی کھا لینا ان کے لئے آسان ہے لیکن

کسی صبر طلب کام کے لیے چند ماہ تک بھی کسی ضابطے میں کس کر کام کیے چلے جانا ان کے لیے سخت مشکل ہے۔ ان کی مثال جنگلی گھوڑے کی سی ہے۔"

صدا بہ صحرا

چنانچہ مولانا نے ۱۹۳۳ء سے لیکر ۱۹۴۱ء تک انفرادی حیثیت سے شدید ترین مشکلات میں سے گزرتے ہوئے نو سال تک ابتدائی تطہیر و تعمیر افکار کا کام کیا۔ یہ شدید صبر آزما مرحلہ تھا جب ان کے ساتھ کوئی ایک ساتھی بھی نہ تھا۔ نہ وسائل تھے۔ نہ ذرائع، نہ اسباب میسر تھے اور نہ رفقائے کار۔ یہ گویا کالے کوسوں کا قافلہ تھا جو تنہا، پیدل اور خطرات کے جنگلات اور مزاحمتوں کے پہاڑوں میں سے ہو کر طے کرنا تھا۔ منزل دور اور ناپید تھی۔ حالات کے وسیع ناپیدا کنار سمندر میں اپنی ٹوٹی پھوٹی کشتی پر ایک پرانی دنیا سے نئی دنیا تک کا سفر تھا۔ پتوار ٹوٹے ہوئے اور تختے اکھڑے ہوئے تھے۔ بس ایک بازوؤں میں قوت، سینے میں عزم اور مالک کائنات کا سہارا تھا اور یہ سارا کام جس قوم کے اندر ہو رہا تھا وہ ایسے کٹھن، کڑوے کسیلے اور مشکل کام کے لیے چند افراد بھی اپنے اندر سے۔ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم نظر آتی تھی۔ سات سال تک بادیہ پیمائی کے بعد راہِ حق کے اس مسافر کے ذاتی تجربات کا حال یہ تھا۔

"جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنوں مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتا رہا ہوں۔ ان کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں۔ ان کی دھن میری دھن سے الگ ان کی گرویدگیوں کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جدا۔ ان کی روح میری روح سے نا آشنا۔ ان کے کان میری زبان سے بیگانہ۔ یہ دنیا کوئی اور

دنیا ہے جس سے میری فطرت مایوس نہیں۔"

لیکن بالآخر یہ صحرائے اعظم طے ہوا اور ۹ سال کی جگر کاوی کے بعد وہ منزل آئی۔ جب مولانا نے اپنے ہم خیال لوگوں کو ہندوستان کے ہر گوشے سے آواز دی پہلی بار کروڑوں کی آبادی میں سے کل ۷۵ افراد جمع ہوئے جنہوں نے ۲۶ اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو مولانا کے ساتھ رفاقت اور ہم مقصدیت کا عہد کر کے اجتماعی طور پر اس دعوت اور مشن کو اٹھانے، پھیلانے اور قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ جس دعوت اور مشن کو مولانا تنہا لئے چلے آرہے تھے۔ یہ خالص تنقید اور تبلیغ و تلقین کا مرحلہ تھا۔ اور خطاب خالص مسلمانوں کے صاحب فکر و فہم طبقے سے تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء تک صرف ۶ سال کے مختصر عرصے میں ملک کے طول و عرض میں ہر بڑے شہر میں مولانا کی دعوت اسلامی سے متاثر لوگوں کے تبلیغی حلقے منظم ہو گئے۔ تقسیم کے وقت لاکھوں متاثر افراد کے علاوہ وہ لوگ جنہوں نے اس اصلاحی دعوت کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے اپنے سارے معاملات کو خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق انجام دینے۔ طاغوت سے کلی طور پر اجتناب کرنے اور کفر و باطل کی عدالتوں سے جہاں غیر الٰہی قوانین کی عمل داری تھی، کلی عدم تعاون کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ان کی تعداد بھی سوا چھ سو سے زائد ہو چکی تھی۔ ہفتہ وار تبلیغی اجتماعات اور اصلاحی تبلیغی حلقے جابجا قائم تھے جو نوجوانوں میں اسلام کا صحیح شعور پیدا کرنے میں مصروف تھے اور سچی دینداری کی لگن پیدا کر کے مسلمانوں میں دین کے لئے تن من دھن لگا دینے کا داعیہ پیدا کر رہے تھے۔

چومکھی لڑائی

مولانا مودودی نے خالص اسلامی نظام حیات کی سربلندی کے لئے جو قلمی

اور لسانی جہاد شروع کیا وہ بعد میں بڑی بڑی آزمائشوں اور ابتلاؤں کی صورت میں بدل گیا۔ اس جہاد کے خصوصی چار محاذ تھے۔

- ہندوستان میں متحدہ قومیت کے نظریہ کے خلاف محاذ
- مغربی تہذیب کے غلبے اور استیلا کے خلاف محاذ
- مسلمانوں کے اندر غیر اسلامی طرزِ فکر کی حامل قیادت کے خلاف محاذ
- جمود پسند مذہبی تصورات کے خلاف محاذ

ان چاروں محاذوں پر انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف کام کیا اور مسلسل جوکھی لڑائی جاری رکھی۔ چونکہ مغربی تہذیب کا استیلا، ہندوؤں سے بھی بڑھ کر مسلمانوں پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس لیے مولانا نے مغربی تہذیب کے خلاف اپنے زوردار قلم سے زبردست علمی اور فکری محاذ قائم کیا۔ وہ مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے مقابلے میں اسلام کی الٰہی تہذیب کے علمبردار ہونے کے سبب مغربی تہذیب کے ہر ہر جزو کے ناقد رہے۔ انہوں نے اس کے نظامِ معاشرت پر اس کے نظامِ معشیت پر اس کے نظامِ اخلاق و سیاست و حکومت پر اس کے نظامِ تمدن پر ہر زاویے سے زبردست تنقید کی اور سائنس کی جدید ایجادات کو دیکھ کر جو لوگ خوفزدہ ہو رہے تھے اور مشینوں کی گھر گھراہٹ میں اپنا دین و ایمان کھو رہے تھے ان کے مرعوب ذہن کے متزلزل استدلال کے پلٹے چیں کی کمزوریاں کھول کھول کر بیان کیں اور حقیقتاً یہ ثابت کر دیا کہ مغربی تہذیب کے ساتھ مشینی قوت کے سوا کچھ نہیں ہے اور وہ انسان کی مشکلات کا کوئی حل معاشی بحران اور وقفے وقفے کی عظیم جنگوں کے سوا نہیں رکھتی۔ جن لوگوں نے ان کا لٹریچر دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کا استدلال

کتنا بھرپور، وزنی، باوقار، سنجیدہ اور ٹھوس ہوتا ہے جس میں مرعوب ذہن نہیں بلکہ ایک بالاتر ذہن کام کرتا ہے جو ایک گھٹیا چیز کے مقابلے میں اپنی بڑھیا چیز کو پیش کرتے ہوئے پوری طرح مطمئن ہے۔

متحدہ قومیت کا دامِ فریب

کانگرس نے جب متحدہ قومیت کے نعرے سے ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنے دامِ فریب میں پھانس کر آزادی کے ذریعے ایک ایسی مغربی جمہوریت انگریز سے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جس میں آزادی صرف اکثریت کو ملتی ہے اور اقلیت صرف اکثریت کے رحم و کرم پر اس کی غلام ہوتی ہے تو مسلمانوں کے جداگانہ مفادات کی محافظ مسلم لیگ کے پاس حقیقتاً کوئی ٹھوس استدلال نہ تھا جس سے وہ متحدہ قومیت کے یورپی تصور قومیت کو توڑ سکے۔ یورپ کا تصور نیشنلزم (NATIONALISM.) ہندوستان کے سب باشندوں کو ایک قوم قرار دیتا تھا اور ہندو اس تصور سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس پر مزید ستم ظریفی یہ کہ اسے مسلمانوں کے اندر سے بھی بہت سے فضلاء اس تصورِ متحدہ قومیت کے حامی مل گئے تھے اور مسلم لیگ کے پاس جداگانہ قومیت کے حق میں کوئی ٹھوس استدلال اس لئے نہ تھا کہ اس کی صفوں میں بھی زیادہ تر وہی لوگ تھے جو اگرچہ مسلمانوں کے جداگانہ مفادات کے مبلغ و داعی تھے لیکن ان کے پاس بھی قومیت کا یورپی نظریہ تھا جس کے سبب مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا اصلاحی تصور اور اس کے حق میں ٹھوس استدلال ان کے پاس موجود نہ تھا۔ یہ موقعہ تھا جب مولانا مودودی نے کانگرس اور اس کے متحدہ قومیت کے تصور پر اپنی دو مشہور

کتب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ دوم اور "مسئلہ قومیت" کے ذریعے زبردست چوٹ لگائی عقلی اور دینی دلائل کیساتھ یہ پہلا حملہ تھا جو متحدہ قومیت کے تصور پر ہوا جس کا توڑ بڑے بڑے فضلاء کے پاس بھی نہ تھا۔ مولانا مودودی کی ان کتب نے جداگانہ تصور قومیت کو مسلمانوں کے اندر دینی اور مذہبی استدلال کے ساتھ زبردست پھیلایا اور کانگرس کے ساتھ مسلمانوں کے دینی عناصر کے استدلال کو زبردست دھکا لگایا اس کے بعد کانگرس دن بدن مسلمانوں کی طرف سے مایوس ہوتی چلی گئی اور اس نے محسوس کر لیا کہ مسلمان قوم اب زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی کہ ؎

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ

اس کے بعد کانگرس میں جو مسلم زعماء بھی گئے وہ کسی ٹھوس استدلال کی بناء پر نہیں بلکہ اپنی بات کی پچ کی بناء پر رہ گئے۔ یہ کتابیں مسلم لیگ کی جداگانہ قومیت کی مہم میں ایک طویل عرصے تک مضبوط بنیاد کا کام دیتی رہی ہیں اور کبھی زمانہ تھا کہ مسلم لیگ کا کوئی پڑھا لکھا لیڈر ان کتب کے مطالعے کے بغیر اپنا سیاسی کام نہ کر سکتا تھا۔

اسلامی پاکستان کے لئے اسلامی تنظیم

کانگرس کی مسلمانوں کی طرف سے مایوسی کے بعد مسلم لیگ نہایت سرعت سے مضبوط ہوتی چلی گئی اس لئے کہ جداگانہ قومیت کا تصور مسلمانوں کے دل کی آواز تھا اور مسلمان عوام بہت جلد مسلم لیگ کے گرد جمع ہو کر ایک علیحدہ مسلم ریاست کے نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے یکسو ہو گئے۔ لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں کی اس تنظیم میں بھی وہی عناصر ادپر نظر آتے تھے جو تہذیب مغرب سے متاثر

اور اس کے نظریات کے حامل تھے جن کے نزدیک ترقی کا وہی معیار تھا جو تہذیب مغرب بناتی تھی جو وہی سیاست جانتے تھے جو تہذیبِ مغرب کا نظامِ سیاست سکھاتا تھا اور دینی عناصر کا زور بہت دبا ہوا تھا، یہ بات آئندہ وجود میں آنے والی اسلامی ریاست کے لیے بری ثابت ہو سکتی تھی۔ جیسے کہ حقیقتاً بعد میں ثابت ہوئی اور حالات نے اسے ثابت کر دیا اس لیے کہ متحدہ قومیت کے جال سے نکل کر ایسی مسلم قومیت کے الجھاوے میں پھنس جانا جو اسلامی نہیں بلکہ مغربی تصورِ قومیت لیے ہوئے ہو اور جس میں اسلامی رجحانات دبے ہوئے ہوں، آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے کے مترادف تھا، یہ خطرہ بھی کچھ کم نہ تھا، مولانا مودودی نے حتی المقدور کوشش کی کہ مسلم لیگ اسلامی تنظیم جماعت اور مقصدِ تنظیم کے ان اسلامی اصولوں کو اپنا لے جو آگے چل کر پاکستان میں خالص اسلامی ریاست برپا کرنے میں نظری طور پر مملاً ثابت ہو سکتے تھے لیکن ایسا نہ ہوا اور بالآخر مولانا مودودی نے اسلامی ریاست کو وجود میں لانے کے لیے ایک ایسے گروہ کی تنظیم کا خود بیڑہ اٹھایا جو تقسیم کے بعد اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے دونوں ملکوں کے مسلمانوں کو گرنے اور بھٹکنے سے حتی المقدور بچانے کی کوشش کرے۔

"جب تقسیم ہند مسلمانوں کی آخری قومی پالیسی قرار پا گئی جس کے نتیجہ میں لازماً آدھے مسلمان یرغمال کے طور پر ہندو قوم پرستی کے حوالے ہو جانے والے تھے اور بقیہ آدھے مسلمانوں کو ایک ایسی قومی ریاست میسر آنے والی تھی جس کا ایک اسلامی ریاست میں تبدیل ہونا کم از کم اس کے لیڈروں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے سخت مشتبہ نظر آتا تھا۔ ان حالات میں ہم نے یہ ضروری سمجھا

کہ مسلمانوں کے اندر یہ مٹھی بھر افراد ایسے موجود ہیں جنہوں نے ہماری دعوت کو سمجھا اور دل سے قبول کیا ہے۔ انہیں لے کر جلدی سے جلدی منظم کر لیا جائے اور ان کی تربیت کا کام شروع کر دیا جائے تاکہ ایسا گروہ تیار ہو جائے جو ایک طرف قومی اغراض سے بالاتر ہو کر خالص اقامت دین کی سعی کرے گا اور دوسری طرف ان حالات کا مقابلہ کر سکے جو تقسیم ہند کی جدوجہد کے نتیجہ میں پیش آتے نظر آ رہے تھے۔"
(تاریخ و لائحہ عمل ۱۴)

یعنی اس تنظیم کا مقصد وحید جہاں اعلائے کلمۃ الحق تھا وہاں وقت کا ایک بہت بڑا تقاضا یہ بھی تھا کہ تقسیم کے نتیجہ میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو ہمت و جرأت دلائے اور انہیں دین و ایمان کے تقاضے بتائے اور انہیں ان کے اصل مقام سے گرنے نہ دے جو ہندو قوم پرستی کی زبردست یلغار کے نتیجے میں ہونے والا تھا۔ دوسری طرف پاکستان میں خالص اسلامی ریاست کے لئے جدوجہد کرے اگر پاکستان کی تحریک کے سربراہ کار یہاں ایک خالص اسلامی نظام حیات نافذ کرنے کی دیانت دارانہ کوشش کریں تو ان کی رفاقت ان کی خدمت اور انہیں علمی اور عملی تعاون مہیا کرنے کی سعی کرے اور اگر اپنے عمومی مزاج کے پیش نظر دوسرا رخ اختیار کریں تو عوام میں اسلامی نظام کا تصور اور مطالبہ ابھار کر انہیں اسلامی نظام کے قیام پر آمادہ و مجبور کرے اور ساتھ ہی ساتھ مذہب کے قدیم جمود پسند تصور کی بجائے زندہ اور متحرک ہمہ پہلو تصور دین کی شکل میں پیش کیا جائے۔

چنانچہ تقسیم کے بعد جماعت اسلامی کا جو حصّہ ہندوستان میں رہ گیا وہ علیحدہ ایک اصلاحی تنظیم کی صورت میں منظم ہو گیا اور وہ آج تک وہاں اپنا متعین فریضہ ادا

کررہا ہے اور جو پاکستان میں آیا اس نے یہاں عوام میں اسلام کا شعور، اسلامی قانون کی وضاحت و تشریح اسلامی دستور کا تصور اور مطالبہ پیدا کرکے یہاں اسلامی نظام حیات کے لئے زمین ہموار کرنے کی پوری کوشش کی۔

پاکستان میں

پاکستان میں مولانا مودودی کی دعوتِ اسلامی نے جو کام کیا اس سے یہاں کے عوام یا خواص بے خبر نہیں ہیں۔

تقسیم کے بعد فوری مسئلہ برباد مہاجرین کی آمد اور ان کی فوری امداد کا تھا چنانچہ مولانا مودودی نے اپنے حلقۂ فکر کے ساتھیوں کے مشورہ سے کیمپوں میں مہاجرین کی امداد کا پروگرام بنایا جو کئی ماہ تک جاری رہا اور جس کی یاد آج بھی ہزار دل دلوں میں موجود ہے۔ دوسرا مرحلہ عوام میں سیاسی شعور کی بیداری اور اسلامی ریاست کے لئے عوام کے اندر زمین تیار کرنا تھا چنانچہ مولانا نے ملک کے گوشے گوشے میں دورہ کرکے عوام میں اسلامی نظام کا مطالبہ اور اس کی تڑپ پیدا کی۔ یہ کام ایک اسلامی مفکر اور محقق کے لئے جان جوکھوں کا کام تھا لیکن انہوں نے اسے پاکستان میں ملتِ مسلمہ کا اپنے اوپر حق اور خدا کی طرف سے عائد شدہ فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ اس سے اگرچہ ان کے علمی کام اور مقام کو دھکا لگا لیکن یہ ان کے ضمیر کی سب سے بڑی پکار اور وقت کا سب سے بڑا تقاضا تھا جو انہوں نے پورا کیا جس کے نتیجے میں ملک میں اسلامی نظام کا ایک ہمہ گیر مطالبہ اٹھ کھڑا ہوا اور مولانا مودودی کے لئے بھی ابتلاء و آزمائش کا میدان کھل گیا اسی کا نتیجہ ہے کہ جب مارشل لاء کی حکومت نے اصلاحِ قوانین کے لئے ایک قانون کمیشن مقرر کیا تو اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں باقاعدہ اس امر کا اعتراف

کہا کہ :-

"اسلامیانِ پاکستان کی طرف سے وقتاً فوقتاً انفرادی طور پر بھی اور تنظیموں کے ذریعے بھی یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ ہمارے قوانین کی جانچ پڑتال اس ملک کے اہل علماء اور جماعتوں سے اس مقصد کے لئے کرائی جائے کہ ہماری کتابِ قانون میں ایسی دفعات موجود نہ رہیں جو قرآن و سنت کے احکامات سے متصادم ہوں۔ پورے ملک میں جہاں جہاں بھی ہم گئے ہمارے روبرو پیش ہونے والے گواہوں نے ایسے ہی مطالبات ہمارے سامنے رکھے۔"

اور یہ اعتراف اسی اسلامی نظامِ حیات کی تڑپ کا نتیجہ ہے جو مولانا مودودی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی جدوجہد نے عوام میں پیدا کی ہے۔

اسلامی نظامِ حیات

اسلامی قانون

اسلامی دستور، اور

اسلامی ریاست

کی تشریحات کے پیہم تقاضوں نے مولانا کو ان موضوعات پر مسلسل مضامین لکھنے۔ افہام و تفہیم کرنے، تقاریر کرنے، اعتراضات و سوالات کے جوابات دینے کے ایک لامتناہی سلسلے میں مصروف رکھا جس کے نتیجے میں اسلامی نظامِ ریاست کے بیشتر گوشے ایک ایک کر کے سامنے آتے چلے گئے اور جیسے جیسے اعتراضات وارد ہوتے رہے، ویسے ویسے ہی معترضین کے لئے فرار کا میدان تنگ ہوتا چلا گیا۔

ساتھ ہی ساتھ مولانا کی دعوت اور مشن سے متاثرین کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا چلا گیا چنانچہ ایک اندازے کے مطابق مولانا کے قائم کردہ اسلامی نظامِ جماعت کے معیار پر پورے اترنے والے ڈیڑھ ہزار سے زائد افراد اور ان سے دلچسپی اور ہمدردی رکھنے والے اندازاً ۲ لاکھ کے لگ بھگ پورے ملک میں پائے جاتے تھے جو مختلف مقامی شہری جماعتوں، تحصیلی ضلعی اور حلقہ وار نظم میں مربوط و منسلک تھے اور پورے ملک میں ایک آواز پر ایک پروگرام لے کر اٹھ سکتے تھے۔ ہفتہ وار درس، تربیتی ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ اجتماعات کے ذریعے جابجا اسلامی اخلاق و عمل کی تربیت دی جاتی تھی اور اسلامی تعلیمات کا چرچا کیا جاتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ پختہ جمے ہوئے افکار و اعتقادات کو کوئی قوت بھی دل و دماغ سے کھرچ کر زائل نہیں کر سکتی خصوصاً ایسے افکار جن کا تعلق آدمی کے ایمانیات سے ہو۔[1]

خدمتِ خلق

دوسری طرف خدمتِ خلق کے میدان میں بھی مولانا مودودی نے ایک حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا۔ اپنے مشن سے وابستہ لوگوں کی مدد سے ملک میں جابجا خدمتِ خلق کے ادارے قائم کر کے ہر نوع کی پبلک خدمت انجام دینے کا اہتمام کیا۔

ا۔ مزدوروں کے لئے لیبر ویلفیئر کمیٹیاں جو تعاون، مصالحت اور قانونی حقوق بذریعہ عدالت دلوانے کے اصول پر آجروں اور اجیروں میں کام کر رہی قائم کیں۔ ان کمیٹیوں نے مزدوروں

---

[1] اس جگہ دیئے گئے اعداد و شمار کا تخمینہ ۱۹۵۷ء کی جماعت اسلامی کی شائع کردہ رپورٹوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ (ا۔ گ)

کے غصب شدہ حقوق عدالتی کارروائی کے ذریعے کروڑوں روپے کی شکل میں دلوائے
۲۔ خواتین میں اسلامی شعور پیدا کرنے کے لئے ملک میں جابجا پچاس سے زائد خواتین کے حلقے قائم کئے اور ان کے لئے وسیع لٹریچر اور جرائد کی اشاعت کا بندوبست کیا۔
۳۔ طلباء میں اشتراکی اور ملحدانہ سرگرمیوں کے مقابلہ میں اسلامی نظریات پھیلانے کے لئے اچھے اسلامی اخلاق کے نمونے پیش کئے اور ان کی مدد سے ہر بڑے تعلیمی ادارے میں اسلامی اخلاقیات کے پابند طلباء کو مسلمان طلباء میں اسلامی تعلیمات کا ذوق پیدا کرنے کے لئے آمادہ کیا۔
۴۔ مساکین کی عبتی امداد کے لئے قربانی کی کھالوں کی مدد سے جو متفرق طور پر ضائع ہو جاتی تھیں منظم کر کے ملک بھر میں ساٹھ سے زائد قائم شفاخانے، دس گیارہ گشتی شفاخانے سوا سو سے زائد طبی امدادی مراکز قائم کر دیئے گئے۔ جہاں سے لاکھوں مریضوں کو مفت طبی امداد ملنے لگی، اور سیلابوں کے زمانے میں پبلک کے تعاون سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مختلف مقامات پر مہینوں تک امدادی کام سرانجام دیئے۔ اس کے علاوہ مختلف شہروں میں تعلیمی ادارے بھی قائم کئے تاکہ نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ مناسب دینی تعلیم بھی طلباء کو دی جا سکے۔
۵۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں تعلیم عام کرنے کے لئے ایک سو سے زائد تعلیم بالغاں کے سنٹر بھی قائم کئے۔ پانچ سو سے زائد عوام کے لئے دینی دارالمطالعے، اس کے علاوہ شخصی ملاقاتیں اتنی بڑی تعداد میں کئے جانے کا انتظام کیا کہ ماہانہ دس ہزار سے زائد ملاقاتیں کی جاتیں، جن کے ذریعے دعوت اسلامی کو پھیلایا اور سمجھایا

لٹریچر

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی نے جو اسلامی لٹریچر تیار کیا ہے وہ ہیرے جواہرات میں تلنے کے قابل ہے۔ ہیرے اور جواہرات انسانوں کے گلے میں چمک کر دکھا کر فنا ہو جاتے ہیں لیکن مودودی صاحب نے جو لٹریچر تیار کیا ہے وہ انسانوں کے سینوں میں اسلام کی مستقل شمع روشن کر دیتا ہے جو پھر کبھی نہیں بجھتی۔ یہ انسان سازی کا کام ہے جو مودودی صاحب گذشتہ ربع صدی سے انجام دے رہے ہیں! اور ایسے لٹریچر کے ذریعے انہوں نے ایک عظیم خاموش انقلابی جدوجہد شروع کر رکھی ہے جس کا توڑ نہ جیل ہے نہ پھانسی ہے اور نہ ڈنڈا ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف کے زور سے لاکھوں دلوں میں اسلام کی گہری محبت اور روشنی پیوست کر دی ہے اور ان کی زندگیوں کا رخ بدل دیا ہے۔ انہوں نے لٹریچر کی اس چھلنی سے کروڑوں کی آبادی میں سے چھانٹ چھانٹ کر کام کے آدمی نکالے ہیں جن کو وہ اپنے مشن کے لئے کام میں لا سکتے ہیں۔ انہوں نے مدت سے قائم شدہ جمود توڑا ہے اور منجمد، افسردہ اور بے مقصد دلوں کو متحرک، پرجوش اور با مقصد بنایا ہے۔ انہوں نے ہزاروں آدمیوں سے غلط کاروبار چھڑوائے ہیں، ضمیر کے خلاف ملازمتوں سے نکلوایا ہے۔ رشتے اور رابطے جو مقصدِ زندگی کی راہ میں حائل تھے۔ انہیں تڑوایا ہے اور اپنے انقلابی قلم اور مشن کی قوت سے دلوں میں اسلام کے لئے گہرا جذبۂ محبت و ایثار و قربانی پیدا کر دیا ہے اور یہ کام انہوں نے اپنی ساری زندگی کا سرمایہ اس میں کھپا کر سرانجام دیا ہے۔ ان کے سیاہ بال آج سفید ہو گئے ہیں اور مضبوط دانت اب بقول ان کے بیروں کی طرح جھڑ رہے ہیں

لیکن ان کی کمر میں اب بھی اتنا کس بل ہے کہ اسلامی نظام کی جدوجہد کے لئے بڑی سے بڑی رکاوٹ سے لڑ جائیں اور دین و ایمان جس اقدام کا مطالبہ کریں عقل و ضمیر کی روشنی میں اس کے لئے اپنا سب کچھ نثار کر دیں۔ ان کی اب تک ۲۳ سے زائد تصانیف ہیں جن میں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی۔ تفہیم القرآن سے لے کر ۴۸ صفحات پر مشتمل "اسلام کا نظریۂ سیاسی" تک شامل ہیں۔ ان کی کتب کے بار بار کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں جن کی تعداد لاکھوں تک جاتی ہے۔

چند اہم خصوصیات

مولانا مودودی کی دعوت اور مشن کی بعض خصوصیات نہایت اہم ہیں۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک منجمد قدیم نسلی مذہب کی بجائے ایک انقلابی نظریۂ حیات اور ایک تحریک کی صورت میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے انہوں نے سب سے بڑا استدلال خود اسلام کے نظام فکر کے اندر سے اندرونی شہادت کے طور پر فراہم کیا ہے۔ قرآن کی ولولہ انگیز آیات اس انقلابی تصور دین پر گواہ ہیں۔ حضورؐ کی پوری زندگی اس پر شہادت ہے۔ صحابہ کرام کی جدوجہد اس پر گواہ ہے اور خلافت راشدہ کا درخشاں دور اس پر گواہ ہے۔ مولانا مودودی نے قوت بیان اور لچھے دار الفاظ کے تانے بانے کے زور سے بات بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہیغل پا افتادہ حقائق کو جنہیں صدیوں کے انحطاط نے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا، جھاڑ پونچھ اور نکھار کر امت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ چونکہ امت کے دل کی آواز ہے اس لئے اس کے خلاف دلیل سے کوئی بات کرنا مشکل ہے۔ مخالفت کے لئے دائیں بائیں ہاتھ پاؤں مارے

جا سکتے ہیں لیکن ٹھوس دو ٹوک بات کر کے اسے رد کرنا حقائق کو جھٹلانا ہے جو کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی کی مخالفت جس جس گوشے سے بھی ہوئی ہے۔ کوئی معیاری، علمی، فکری استدلال مخالفت نہیں بلکہ بالعموم گھٹیا، پوچ ذاتی شخصی اور الزامی مخالفت ہوئی ہے جو خود اپنی کمزوری پر آپ گواہ ہوتی ہے۔ یہ بات بہرحال اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مولانا مودودی کی خشک دعوت کا چہرہ ان کے اعلیٰ ادبی میار نے بہت کچھ نکھار اور مکمل بنایا ہے۔ یہ اسی خوبی کا حقیر سا حصہ ہے جس کا دعوٰے قرآن پاک نے اپنے لئے بڑے پیمانے پر کیا ہے۔

اس دعوت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اسلام کے چہرہ کو بالکل نکھار کر پیش کر دیا ہے۔ اسلام کے گوشے گوشے پر روشنی ڈالی ہے اسے موجودہ حالات پر منطبق کر کے دکھایا ہے۔ موجودہ سائنسی دور کے مذہب پر تمام ممکن اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسلامی نظام کا ایک مکمل فکری اور علمی محل تیار کر دیا ہے جس کی اینٹ اینٹ اور چوکھٹ چوکھٹ اپنی اپنی جگہ فٹ، متناسب اور موزوں لگی ہوتی ہے۔ کوئی حصہ نامکمل اور ادھورا نہیں ہے اور وہ اپنے قاری کی انگلی پکڑ کر اسے اسلامی نظامِ حیات کے اس محل کا گوشہ گوشہ دکھا دیتے ہیں۔ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی، قانونی، تمدنی، تعلیمی، زرعی، صنعتی، اخلاقی غرض زندگی کے تمام گوشوں میں اسلام کی پالیسی کو وہ استدلال سے بیان کرتے ہیں اور سمجھنے والوں کے الجھا دینے والے دور کر کے انہیں یقین و عمل کی آخری منزل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ اسلام کے جدید تقاضے کیا ہیں اور جدید دور کے اسلام سے کیا تقاضے ہیں۔ ان سوالات کا مفصل جواب مولانا مودودی دیتے ہیں۔ وہ کمیونزم کو بھی استدلال کے زور سے غلط نظریہ ثابت کرتے

ہیں۔ وہ سرمایہ داری کو بھی مہلک ترین تصورِ حیات بیان کرتے ہیں۔ وہ فاشزم۔ سوشلزم، لبرلزم غرض سارے ہی ازموں کو بنی نوعِ انسان کے لئے انتہائی مہلک نظریے سمجھتے ہیں اور ان کا یہ سمجھنا کسی کٹ ملا کا سا سمجھنا نہیں ہے جو محض تعصبات کی بنا پر ہر جدید کو رد کرتا ہے اور نہ ہی ان کا یہ سمجھنا کسی "یورپی کٹ مسٹر" جیسا سمجھنا ہے جو ہر قدیم کو تعصبات کی بنا پر رد کرتا ہے بلکہ ان کی ہر بات مدلل، جامع اور افہام وتفہیم کا وسیع دامن اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذہین طبقہ ان سے بہت متاثر ہوا ہے اور اگر اب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالے بغیر اسے اپنانا مشکل ہے یا جدید دور کا یہ چیلنج ہے کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے یا یہ کہ جب تک اسلام جدید سائنسی دور کے سوالات کے مدلل اور تشفی بخش جوابات نہ دے اس کی زندگی مشکل ہے تو ایسا شخص سوائے اپنی جہالت کے اظہار کے اور کوئی نئی بات نہیں کہتا اس لئے کہ مولانا مودودی نے جدید دور کے ان جدید تقاضوں کا تسلی بخش جواب اپنے لٹریچر میں جا بجا پیش کر کے اسلامی نظامِ حیات کی عمارت کا وہ مکمل ترین نقشہ پیش کر دیا ہے کہ اگر کسی معمار میں دیانت اور ارادہ خلوص اور قربانی کا جذبہ ہو تو وہ اس نقشے کے مطابق پوری اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مولانا مودودی نے یہ بات حتمی طور پر ثابت کر دی ہے کہ اسلام کوئی پوجا پاٹ کا مذہب نہیں ہے کہ سیاست اس سے آزاد ہو بلکہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اسلام کی گرفت سے آزاد اور باہر ہو۔ اسلام پورا نظامِ زندگی ہے اور سیاست اس زندگی کا ایک شعبہ ہے جب تک اس شعبے کو اسلام کے تابع نہ کیا

جائے ...... ادخلوا فی السلم کافۃ کا صحیح تقاضا پورا نہیں ہوتا۔

اس دعوت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کوئی اندھی بہری قوت نہیں ہے جو زور یا فتوے، یا کسی عقیدت کے بل پر آگے بڑھتی چلی گئی ہے بلکہ یہ سب سے پہلے مخاطب کے فہم کو مطمئن کرتی، اس کے ضمیر کو بیدار کرتی۔ اور اس کے جذبات کو اپیل کرتی ہے۔ ان تینوں پہلوؤں سے متاثر کرنے کے بعد وہ مخاطب کو اپنے پیغام کے لیے فتح کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس کی طرف آتا ہے وہ ذہن سے قائل ضمیر سے مطمئن اور دل سے متاثر ہو کر آتا ہے۔ پھر اسے کام کرنے کے لئے اکسانے، ابھارنے، قائم رکھنے اور اس مشن کے لئے جدوجہد کرنے والی کسی خارجی اکساہٹ کی زیادہ ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اس کا اپنا دل و دماغ اور ضمیر اسے کام پر ابھارتے اور تیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بھی دعوت کو اختیار کرتے ہیں، وہ اسے اپنی دعوت، اپنا نصب العین اور اپنا مقصد زندگی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں، ان کے نزدیک یہ کوئی عارضی سیاسی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے لیے یہ دین و ایمان کا معاملہ عقیدے کا مسئلہ اور آخرت کی زندگی کا عین تقاضا ہوتا ہے اور انہیں اس سے باز رکھنے کے لئے کوئی قوت، زور یا دھونس اور دھاندلی کافی نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ ان کو ذہنی طور پر اس دعوت سے منحرف کر دیا جائے۔

مولانا مودودی کی دعوت اسلامی نے ہماری ملکی زندگی میں گزشتہ برسوں میں نمایاں اثرات چھوڑے ہیں جن میں سے ہر ہر اثر اپنی بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے مولانا مودودی نے انتخابات کے اندر صالح نمائندگی کا تصور

پیش کیا۔ اس سے پہلے یہ تصور چلا آرہا تھا کہ ہر وہ شخص جو دھاندلی اور غنڈہ گردی میں بڑے بڑے غنڈوں کو مات دے جائے وہی نمائندہ عوام ہو۔ اس طرح قوم کا بدترین عنصر چھٹ کر اوپر آجاتا تھا لیکن مولانا مودودی نے سیاسی زندگی کو پاکیزہ کرنے کے لئے یہ تصور پیش کیا کہ امیدواری کا طریقہ ختم کیا جائے اس لئے کہ امیدوار اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے بہت کچھ غلط اور اخلاق سے فروتر حرکات کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں صالح نمائندے کی چند اخلاقی صفات پیش کر دی جائیں جو دیکھ کر ووٹر بے لاگ طور پر اپنا ووٹ استعمال کریں۔ یہ تصور نمائندگی، سیاست کو پاکیزہ کرنے کے لئے بہترین طریقہ کار ہے۔ بشرطیکہ عوام میں اس کا کلی شعور پیدا کر دیا جائے اور حکومت کے انتخابی قوانین اس تصور کے نفاذ کے لئے قانونی پوزیشن کو مضبوط کریں۔ یہ وہ پہلا تصور ہے جو جمہوریت کے اس دور میں پاکستان سے بلند ہوا ہے ورنہ یورپ اور امریکی جمہوریتیں تک اس گندے طریق نمائندگی کے سبب سے بے شمار قسم کی بے ضابطگیوں اور اخلاقی گراوٹوں میں مبتلا ہیں اور وہ جمہوریت کی یہ گراں قیمت ادا کر رہے ہیں کہ سیاسی سازشیں دھڑے بندیاں، رشوتیں، چالبازیاں اور وزارتوں کے بعد دوست نوازیاں چلتی رہتی ہیں۔

دوسرا اثر مولانا مودودی نے یہاں کی سیاست پر ڈالا ہے۔ ہماری سیاست یورپ کی سیاست کا چربہ ہونے کے سبب ہر طرح کے گندے کھیلوں کا نمونہ بنی چلی آتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ ایک شریف آدمی کا کیا کام ہے کہ وہ سیاست کے گندے کھیل میں حصہ لے۔ خود مولانا مودودی کے ضرورت سے زیادہ ذہین اور عقل مند بہی خواہوں نے ان کو بار بار یہی مشورہ دیا کہ وہ اپنی مقدس ہستی

کو اس گندے کھیل سے محفوظ رکھتیں اس لیے کہ اس سے ان کے وقار اور مقام کو صدمہ پہنچتا ہے لیکن مولانا نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیاست میں بھی راست روی، راست گوئی، حق پرستی، وفاداری اور اصول پر استقامت ممکن ہے اور یہ انہوں نے گزشتہ برسوں میں اپنے عمل سے کر کے بھی دکھایا ہے۔ نتیجۃً اب بڑے بڑے جغادری پرانے لیڈر بھی یہی خدا پرستی اور اصول پرستی کی بولیاں بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں جن کا سبق مولانا مودودی نے بازارِ سیاست میں دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے لوگوں کی ان بولیوں کا مفہوم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کھوٹوں پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔

حق گوئی اور اس پر استقامت اور قید و بند اور پھانسی کے پھندے اور موت کے مقابلے میں بھی اپنے اصول پر قائم رہنا۔ یہ وہ مثال ہے جو مولانا نے بے اصول سیاست کی اس وادی میں پیش کی ہے جس کا تصور بھی اس وادی کے دوسرے راہبر یا لیڈر اپنے ذہن میں نہیں رکھ سکتے۔ مولانا مودودی کی اس دعوت نے یہاں کے ادب پر بھی اثرات ڈالے ہیں۔ مولانا خود ایک بہت بلند پایہ ادیب ہیں اور ان کا ادب ہی ایک ایسی چاشنی ہے۔ جس کی مدد سے آدمی ان کی کتب کا جو خشک ترین موضوعات پر ہوتی ہیں۔ نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کر جاتا ہے ان کے ادب کے زور سے ہمارے اردو ادب میں پاکیزہ تعمیری اور اخلاقی ادب کی ایک رو چل پڑی ہے جو کبھی تعمیری ادب کہلاتی ہے۔ کبھی اسلامی ادب لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے قلم نے پورے میدانِ ادب و صحافت کو متاثر کیا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے اثرات کے تحت بے شمار نئے نئے لکھنے والے انہیں کے نظریۂ حیات کی نمائندگی کرتے ہوئے سامنے آ گئے ہیں۔ نئے نئے رسائل و جرائد ان کے

نکتۂ نظر کے حامل نکلنے لگے ہیں اور نئے نئے شعرا اپنی دلفریب پاکیزہ نظموں، غزلوں اور شعروں کے ساتھ بزم شعر و ادب میں غزل خواں نظر آتے ہیں۔ اسلامی ادبی تصورات کی ایک رو ہے جو پوری فضا میں چل پڑی ہے اور جسے ملک کا ہر شخص محسوس بھی کرتا ہے اور اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔

مولانا کی دعوت نے جدید و قدیم دونوں طبقات کے تصورِ دین پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے۔ جدید ذہن اسے ایک زائدانہ ضرورت زندگی کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتا تھا قدیم ذہن اسے رسومات کا پختہ لگا بندھا ضابطہ سمجھتا تھا جس سے سرِ مو تجاوز و انحراف انسان کو دوزخ کے گڑھے میں ڈالنے کے لئے کافی تھا۔ مولانا مودودی نے دین کے ان دونوں تصورات کو درست کر کے اعتدال پر قائم کر دیا ہے۔ دین اسلامی زندگی کا نام ہے اور اسلامی زندگی وہ ہے جو حضورؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ بس یہی نجات کا سیدھا راستہ ہے کہ اسی زندگی کو بالفعل قائم و نافذ کیا جائے۔

طلباء جو مدت سے نئے نظامِ تعلیم کے پیدا کردہ اثرات کے تحت ایک سرکش اور لاپرواہ گروہ ہے۔ مولانا کی دعوت نے ان کو بھی متاثر کر کے محتاط ذمہ دار اور اسلامی کردار کا حامل و مبلغ بنا دیا ہے۔ چنانچہ ہزار در ہزار طلباء اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں نہ صرف ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہیں بلکہ وہی سانچے لے کر وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی اس میں ڈھالنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

علماء کرام پر بھی اس دعوت کے بہت بہتر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ پہلے فرقہ وارانہ تصورات اور مسائل کا بڑا چرچا اور شور و غوغا تھا۔ اسلامی زندگی کا کوئی ایک مستقل لائحہ عمل نہ تھا۔ مولانا مودودی نے اسلامی نظام کے مطالبے کے

ذریعے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی. چاہے علما اپنی انفرادیت پسندی کے سبب مستقل طور پر ایک پلیٹ فارم پر نظر نہ آئیں لیکن اللہ نے ان کو اتنی توفیق ضرور دی کہ جب کبھی دین کا اجتماعی تقاضا سامنے آیا وہ فوراً یکجا ہو گئے اور اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں جیسے اہم ترین اور انقلابی کام کو جسے اسمبلی کے روشن خیال حضرات برسوں میں نہ سلجھا سکے، چند دنوں میں مرتب کر کے متفقہ طور پر پیش کر دیا۔

اس کے علاوہ بھی جب کبھی دین کا اجتماعی تقاضا سامنے آیا۔ دین کی آبرو کا مسئلہ درپیش ہوا تو وہ سب ایک ہو گئے اور انہوں نے اس پرانی کہاوت کو واقعی ختم کر دیا کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوتی ہے بلکہ اب تو یہ نئی کہاوت چل گئی ہے کہ "دو وزیروں میں وزارت حرام ہوتی ہے" یا "دو مسٹروں میں رشوت حلال ہوتی ہے"۔ مولانا مودودی نے اس محاذ پر جو خدمات انجام دی ہیں اس کا اعتراف چاہے کوئی کرے یا نہ کرے لیکن اسلامی تقاضوں کو اولیت کا رتبہ دینے اور تمام اختلافات کو وقتی طور پر پس پشت کر دینے کا جذبہ یقیناً ان کا پیدا کردہ ہے اور اگر یہاں ان کی اس خدمت کا اعتراف کرنے والا کوئی نہ ہوا تو آخرت میں ان کا ثواب ان کے مالک کے پاس انشاء اللہ ضرور ہی محفوظ ہوگا۔

مولانا مودودی کی دعوت نے اخلاق، دیانت اور امانت کے تقاضوں کو بھی بہت نمایاں کیا ہے اور یہ عام احساس پیدا ہو گیا ہے کہ اصل قابلِ قدر چیز یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان قیمتی صفات سے عاری ہوتے ہیں وہ بھی اس کا مظاہرہ کرتے اور اس کی نصیحت کرتے اور اسی کا بار بار وعظ کرتے نظر آتے ہیں

خدمتِ خلق کا رجحانِ عام بھی مولانا مودودی کے کئے ہوئے کام کا نتیجہ ہے۔ آج جو ہر طرف خدمتِ خلق کا تھوڑا بہت جذبہ پایا جاتا ہے وہ اس بات کا لازماً مرہونِ منت ہے کہ مولانا مودودی کے مشن کے علمبرداروں نے ملک میں خدمتِ خلق کا نہایت شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے۔ بے غرض خدمت، بے لاگ خدمت، بے اندازہ خدمت یہ کام اس سے پہلے زیادہ تر انہیں لوگوں نے کیا جو مولانا مودودی سے کسی نہ کسی طور متاثر تھے اور آج خود امدادی (Self Help) کے ذریعے جو خدمت کا جذبہ عوام میں پایا جاتا ہے اُسے بہت کچھ وہاں سے غذا ملتی رہی ہے۔

سب سے بڑا اثر ملک کے اندر عوام و خواص میں قانون کی پابندی۔ آئین پسندی اور امن و امان کے جمہوری ذرائع سے کام کرنے کا جذبہ ہے جو مولانا مودودی نے پیدا کیا ہے۔ وہ خود بڑے آئین پسند اور قانون کے پابند آدمی ہیں اور انہوں نے برسوں تک یہی تربیت یہاں کے عوام کو دی ہے۔ وہ ہر کام جمہوری ذرائع اور افہام و تفہیم اور دلیل کی قوت سے کرنے کے قائل ہیں۔ ڈنڈے کی دلیل کو نہ وہ تسلیم کرتے ہیں نہ پیش کرتے ہیں، نہ اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں نہ اسے کسی معقول سوسائٹی میں پیش کرنے کے قابل سمجھتے ہیں۔ انہوں نے برسوں تک اپنے قلم و زبان سے اپنے مشن کے ماننے والوں اور اپنی دعوت کے علمبرداروں کو جمہوریت، مساواتِ قانون و آئین کی پابندی کا سبق دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو تبدیلی جن ذرائع سے آتی ہے، انہیں ذرائع سے اس کا ردِ عمل ابھرتا ہے۔ پستول کے زور سے لایا ہوا انقلاب کبھی دیرپا اور عوام میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی عوام اس پر مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ ہی یہ گارنٹی ہو سکتی ہے کہ اسے اسی پستول کی دلیل سے نہ ہٹا دیا جائے گا اس لئے یہ

لازم ہے کہ عوام کے شعور کے اندر سے ایک تبدیلی ابھرے۔ ان کی رائے سے وہ تبدیلی بروئے کار آئے۔ ان کے ضمیر کی آواز سے وہ ہم آہنگ ہو اور ان کی خواہشات سے وہ برسرِ اقتدار آئے۔ جب ایسی کوئی تبدیلی کسی معاشرے میں برپا ہو تو پھر اس کی حفاظت کے لئے سنگینوں کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ عوام کے دل و دماغ اور بیدار ضمیر ہی اس کی حفاظت کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

موافقین

مولانا مودودی کی اس دعوت کے بے شمار موافقین ہماری ملت میں پائے جاتے ہیں ان لوگوں کے علاوہ جو ان گنت تعداد میں ملک کے طول و عرض میں معلوم و نامعلوم مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا موافق عنصر خود پوری قوم کا اجتماعی ضمیر ہے جو ایک مدتِ دراز سے خلافتِ راشدہ کی بحالی کے لئے اس کے انتظار میں کشمکش کرتا چلا آرہا ہے۔ جو لوگ اس نظامِ حیات کو لانے کا پختہ وعدہ کرتے ہیں ان کے سلسل پر بھروسہ کرتا اور ان کے لئے جان و مال کی بازی لگا دیتا ہے اسلام کے لئے کام کرنے والوں کو اچھا سمجھتا، اس کی راہ میں مر جانے والوں کو شہید تصور کرتا اور انہیں مرنے کے بعد رحمۃ اللہ کہہ کر یاد کرتا ہے۔ مولانا کی دعوت کی جڑیں ملت کے قلب و ضمیر کی اسی گہرائی میں پیوست ہیں جنہیں آسانی سے اکھاڑا نہیں جا سکتا۔ دوسرا موافق عنصر دنیا بھر کے مسلمانوں کے اندر اسلامی نظام کے لئے ابھرتا ہوا شعور ہے، جو دن بدن بڑھ رہا ہے اور اس کے مطالبے کی مختلف آوازیں مختلف انداز سے ہر چہار طرف سے آرہی ہیں۔ تیسرا موافق عنصر علمائے امت اور انبیائے کرام کا کیا ہوا کام اور اس کام کے لئے مسلمانوں کے اندر احترام کا گہرا جذبہ ہے جسے زمانہ کبھی بھول نہیں سکتا اور جس کے احترام سے ہر انسان کی گردن

جھک جاتی ہے۔ چوتھا عنصر خود اس کے لیے کام کرنے والوں کا اعتماد، خلوص اور اس کی کامیابی کا قوی بھروسہ ہے جو یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے فرشتے جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی مدد کے لیے بھڑکتی چتا میں ہاتھ بڑھائے تھے جو بدر میں لڑنے والوں کے پہلو بہ پہلو آکر لڑے تھے۔ وہ بہرحال اس دعوت کے معاون و مددگار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ دعوت خود اللہ کو بھی اس زمین پر سب سے زیادہ محبوب کام ہے جس کے لیے وہ اپنے محبوب ترین بندوں کو اٹھا کر کھڑا کرتا رہا ہے۔ ایسے ہی یقین کی حمایت میں مولانا مودودی اپنے مشن اور اپنی دعوت کے لیے زندگی کی آخری سانس تک کام کیے چلے جانے کا داعیہ لئے کام کئے چلے جا رہے ہیں اور ان کی نگاہیں اسی کی مدد پر جمی ہوئی ہیں جس کا یہ کام ہے

(۸)

بین الاقوامی شخصیت

مولانا مودودی ایک بین الاقوامی مشن کے داعی ہیں وہ ایک فرد کی اصلاح سے لیکر ایک ریاست کی اصلاح تک۔ اور پھر پوری بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود ورہنمائی کا پروگرام رکھتے ہیں اس طرح اپنے پیغام کی نوعیت کے اعتبار سے وہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں احیائے اسلام کے لیئے جو کام انہوں نے کیا ہے اور اس سلسلے میں جن جن مراحل سے وہ گزرے ہیں۔ اس چیز نے انہیں اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے دنیا کی چند نمایاں ترین شخصیتوں میں لاکھڑا کیا ہے۔ وہ چند خصوصیات یہ ہیں۔

انہوں نے اسلام کو دنیا کے دوسرے غالب نظاموں کے مقابلے میں ایک جامع نظام حیات کے طور پر اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا ایک ایک گوشہ نہ صرف واضح اور منقح ہوکر سامنے آگیا ہے، بلکہ دوسرے نظاموں کے مقابلے میں اس کی مدلل برتری بھی ثابت ہوگئی ہے۔ اور اس کام میں دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا پورا ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی متعدد تصانیف ہیں جو انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی اور جدید مسائل کو اسلامی نکتہ نگاہ سے حل کرتی ہیں۔ ان تصانیف کے تراجم متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور مزید ہو رہے ہیں۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ریاست کے جدید ترین نظم

مملکت کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لئے اسلامی دستور کا ایک واضح نقشہ مرتب کیا۔ اور نہ صرف یہ علمی کام کیا بلکہ جس ملک سے ان کا تعلق ہے وہاں انہوں نے اس دستور کے نفاذ کے لئے ایک زبردست جمہوری مہم چلائی۔ جو کم و بیش ۸، ۱۰ سال تک جاری رہی۔ جس کے دوران اس موضوع سے متعلق انہوں نے ہر شبہ کا ازالہ کیا۔ ہر اعتراض کا جواب دیا۔ اور ہر گوشہ کو واضح کیا اس مہم کے سبب ملک کے عوام میں اسلامی دستور کا شعور بہت گہرا ہو گیا اور یہ دو حرفی بات ان کے دلوں میں اتر گئی کہ اسلامی دستور وہ ہے۔ جو کتاب و سنت پر مبنی ہو۔ اس دستوری مہم کی بازگشت مختلف اسلامی ممالک میں بجا بجا سنی گئی۔ اور اس کی روشنی میں دیگر مسلم ممالک کے اسلام پسند عناصر نے بھی انہیں خطوط پر اپنے ممالک میں دساتیر بنوانے کی کوششیں کیں۔

ان کی تیسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس مہم کے دوران انہیں اپنے ملک کے ارباب اقتدار کو بھی بار بار متوجہ کرنا پڑا جس کے نتیجے میں انہوں نے مولانا کو راستے سے ہٹانے کے لئے کبھی جیل کے دروازے کھولے اور کبھی پھانسی کے پھندے لٹکائے اس بے غرض بے لاگ اور خالص فی سبیل اللہ جدوجہد کے نتیجے میں وہ اپنے ہی آزاد ملک میں آزادی کا نصف حصہ جیلوں میں گزار آئے اور انہیں ایک ایسا پمفلٹ لکھنے پر موت کی سزا سنائی گئی جو پمفلٹ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا اور پھیلتا رہا اور جس کے حرف حرف سے ملت کے افراد کو اتفاق تھا جو دیگر کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اسے پڑھ کر لوگ حیران رہ گئے کہ اس میں موت کی سزا کے لئے کون سی بات تھی۔ اس سزا پر ملت مسلمہ کا ضمیر ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ ہر چہار طرف سے بیدار ہو کر چیخ پڑا اور اس کے نتیجے میں ملک کے باہر سے بھی بیشمار لوگوں نے اس سزا پر احتجاج کیا۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے مختلف اسلامی ممالک کے دورے کئے کبھی فریضۂ حج کی ادائیگی کے سلسلے میں تشریف لے گئے کبھی اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن کے لئے ارض القرآن کا دورہ کیا اور کبھی مدینہ اسلامی یونیورسٹی کے اجلاس تاسیس میں شرکت کے لئے گئے۔ اور ان دوروں کے دوران انہیں مختلف شخصیتوں سے واسطہ پیش آیا۔ وہاں اپنے اثرات چھوڑے۔ تقاریر کیں۔ پیغامات دیئے اور اسلامی نظریۂ حیات کے داعی کی حیثیت سے جابجا ان کا گرمجوشی سے استقبال ہوا۔

پھر یہ خصوصیت بھی ہے کہ ان کے علمی، دینی، معاشرتی اور سیاسی کام پر جابجا تحقیقات شروع ہو گئیں۔ بیرونی ممالک کے ارباب علم ونظر نے مولانا کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے پیغام کو جاننے کے لئے باقاعدہ ریسرچ کرنے اور اپنے آدمی متعین کر کے ان کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔

پھر یہ خصوصیت کہ مولانا کی تصانیف یا ان سے متاثر افراد جابجا مختلف ممالک میں پہنچے اور وہاں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مولانا کے مشن کی تبلیغ کی جس کے سبب جابجا ان کا تعارف ہوا اور ان کے مشن کے اثرات پھیلے۔

یہ ساری خصوصیات ان کی شخصیت کو بین الاقوامی شخصیت بنانے کے لئے بہت کافی ہیں ان میں سے اگر ایک ایک خصوصیت کا بھی سرسری سا جائزہ لیا جائے۔ تو شائد یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ ان مختلف خصوصیات کی حامل کوئی ایک شخصیت بھی اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ چاہے شہرت۔ قوت اور اقتدار میں ان کا پایہ آسمان کے بادلوں سے بھی کیوں نہ لگتا ہو اور نعروں میں جھنڈے

ہوتے ان کے میزائل فضائی کروں سے بھی آگے کیوں نہ نکل گئے ہوں۔

بین الاقوامی مشن کا علمبردار

سب سے پہلے مولانا کی حیثیت ایک بین الاقوامی مشن کے علمبردار کی ہے۔ بلاشبہ انہوں نے کام کا آغاز اپنے ملک سے کیا ہے لیکن ان کا پیغام دنیا کے لیے مکمل اسلام کی دعوت ہے۔ ان کے نزدیک سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ہلاکت خیز نظریئے ہیں اور ان کے ذریعے دنیا پر پے در پے جنگوں کے بادل منڈلاتے اور بموں کی بارش برساتے رہیں گے۔ امن عالم کا انحصار صرف اسلام اور اس کے نفاذ پر منحصر ہے اس عالمی برادری پر منحصر ہے جو اخوت اسلام کے ذریعے ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کے سبب وجود میں آتی ہے اور جس کے درمیان زبان، رنگ، نسل، لباس، غذا، پہاڑ، دریا، سمندر کوئی چیز بھی حائل نہیں ہو سکتی۔ جب تک دنیا میں عدل نہ ہوگا، جو اسلام کا لازمی تقاضا ہے۔ امن قائم نہ ہوگا۔ چنانچہ اردن ریڈیو پر نئے سال پر انسانیت کے نام ایک ریڈیائی پیغام نشر کرتے ہوئے مولانا مودودی نے کہا۔

"دنیا کے لوگوں کو نئے سال میں کوشش کرنی چاہیئے کہ جو کچھ کوتاہیاں دنیا کے اندر امن اور عدل کے قیام کے سلسلے میں پچھلے زمانوں میں ہوتی رہی ہیں۔ آئندہ ان کی تلافی کی جائے۔ لیکن یہ بات تمام دنیا کے انسانوں کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیے اور خصوصاً دنیا کی طاقتور قوموں کو سے ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ کوئی امن عدل کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں ظلم ہوتا رہے اور حق داروں کے حق غصب ہوتے رہیں۔ اور پھر بھی امن قائم ہو سکے ایسی حالت میں جو متوازن امن بظاہر قائم رہتا ہے وہ محض ظالم کی قوت اور

مظلوم کی کمزوری کے باعث رہتا ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ مظلوم کو جب بھی سر اٹھانے کا موقع ملے گا، وہ لازماً اپنے حق کے لئے لڑ کر رہے گا۔ نیز یہ بھی سنت اللہ میں سے ہے کہ ظالموں کے درمیان کبھی اتفاق و اتحاد نہ ہو سکے گا اور وہ باہم ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہیں گے۔ "وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ"

چنانچہ اس وقت نظامِ سرمایہ داری کے سب سے بڑے نمائندے اگر کینیڈی اور میکملن ہیں اور اشتراکیت کی نمائندگی سب سے زیادہ اگر خروشچیف اور ماؤزے تنگ کرتے ہیں تو اسلامی نظامِ حیات کے ایک بہت بڑے نمائندے مولانا مودودی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظریات ریاستوں کی صورت میں قائم ہیں جن کی پشت پر بڑی بڑی ریاستوں کی قوت اور سرمایہ اور فوجیں ہیں۔ جن کی پشت پر بڑے بڑے مصنفین کے ذہن سائنس دانوں کی ایجادات اور اخبارات و رسائل کے لامحدود ذرائع نشر و اشاعت ہیں تو دوسری طرف اسلامی نظریہ ابھی ریاستی شکل میں تبدیل نہیں ہو سکا اور اپنے عروج کے لئے ابھی عالمِ طفولیت (In The Making) میں ہے۔ ابھی وہ صرف ایک صحت مند نظریہ ہے۔ ایک ٹھوس دلیل ہے۔ ایک بیدار جذبہ ہے۔ ایک لاجواب فکر ہے لیکن یہ سب کچھ ابھی صرف دلوں، دماغوں، کتابوں، اخباروں اور جلسوں میں ہے۔ دلوں اور دماغوں سے نکل کر جس روز اس کی جڑ زمین کے اندر کسی گوشہ میں پیوست ہو گی۔ اور کسی ریاست کی صورت میں اس کی پہلی کونپل زمین کے سینے کو چیر کر فضائے

کائنات میں نمودار ہو گی، اس روز اس کی حقانیت اور اس کا قابلِ عمل کردار بے دلیل سب کی سمجھ میں آجائے گا۔ اس روز اندھوں کو بھی محسوس ہو گا کہ سورج نکل آیا ہے اور بہرے دلوں کو بھی احساس ہو گا کہ کسی چیز کی خنکی قلب کو ٹھنڈک پہنچا رہی ہے جب یہ ہو گا۔ تو جو شخص بھی اس نظریے کی نمائندگی کرے گا وہ دنیا کے تین نظریاتی بڑوں میں ایک بڑا ہو گا۔ وہ چاہے خدا کے عاجز بندوں میں سے ایک عاجز بندہ ہو، لیکن اس کی آواز میں بڑا زور، اس کی دلیل میں بڑا وزن اور اس کے اشارے میں بڑی گہرائی محسوس کی جائے گی اور دنیا کے بین الاقوامی مسائل اس کی رائے کے بغیر طے نہ ہوں گے۔

لیکن جب تک وہ دور آتا ہے اور میدان میں دو ہی نظریئے سیاست کی زوردار قوت کے ساتھ دندنا رہے ہیں علم و عقل و دلیل کی بے بہا قوت کے ساتھ اس تیسرے جہانی نظریئے کی نمائندگی مولانا مودودی نہایت احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں اور اسی نمائندگی نے ان کو بین الاقوامی شخصیت بنا دیا ہے،

دستوری مہم کی بازگشت مسلم ممالک میں

مولانا مودودی نے ایک انتخابی مہم کے موقعہ پر سفر کے دوران ہاتھ میں اپنی جماعت کا منشور لئے ہوئے کہا تھا۔

"یہ منشور ہم نے اس نکتۂ نظر سے مرتب کیا ہے کہ اگر کسی بھی غیر اسلامی نظامِ مملکت کو اسلامی شکل دینی پڑے تو یہ منشور کام کرنے والوں کی ہر گوشے میں رہنمائی کر سکے مجھے امید ہے کہ دوسرے مسلم ممالک بھی اس سے استفادہ کریں گے۔ چلئے اور کچھ نہیں تو ذہنی غذا تو ہم ان کو یہاں سے پہنچاتے ہی رہیں گے۔"

اس نکتۂ نظر سے جب میں نے اس منشور کا جائزہ لیا تو حقیقتاً اس جدید تقاضوں والے سائنٹیفک دور میں ایک ریاست کو اسلامی رفاعی ریاست بنانے کیلئے اس مختصر ۲۳ صفحے کے پمفلٹ میں مکمل رہنمائی موجود تھی۔ آج بھی جسے اس کی ضرورت ہو وہ ریاست کے مختلف شعبوں کی اصلاح کے لئے کمیشن مقرر کرنے کی بجائے مختلف اصلاحات کے لئے اس مختصر پمفلٹ میں دی ہوئی اصلاحات کا نقشہ اٹھا کر دیکھ لے تو اسے پتہ چل جائے گا۔ کہ اسلام ماڈرن تقاضوں کو جدید دور میں کس طرح پورا کرتا ہے اور سائنس مذہب کی رہنمائی میں انسان کو ہلاک کرنے کی بجائے اس کی خدمت کا فریضہ کیونکر انجام دیتی ہے۔

چنانچہ پاکستان میں جب مولانا مودودی نے یہاں کے ارباب اقتدار کو اسلامی دستور کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے محض اتنی سی بات پر مہم نہیں چلاتی رہیں اسلامی دستور چاہیئے بلکہ یہ بھی کہا کہ اسلامی دستور کیا ہے۔ اسلامی دستور کی تدوین کن کن ذرائع سے ہوتی ہے اور اس کے مقاصد کیا کیا ہیں اور اس کے خدوخال کیا ہیں انہوں نے عوامی جلسوں سے لے کر وکلاء کی ایسوسی ایشنوں تک کو خطاب کر کے سمجھا دیا کہ اسلامی دستور کیا ہوتا ہے۔ یہ ایک قابل عمل نظریۂ زندگی ہے اور اسے اپنے ملک میں نافذ کرنا ہی اس کی بہتری کا عین ضامن ہے

یہ مہم یہاں تقریباً ۱۰ سال چلتی رہی ہے۔ دستور بنتا بگڑتا اور پھر بنتا رہا ہے ارباب اقتدار تاخیر پر تاخیر کر کے جمہوریت کو ناکام ثابت کر کے آمریت کا راستہ ہموار کرتے رہے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی اس سارے عرصے میں اپنا مثبت کام برابر کرتے رہے۔ انہوں نے اس پر تقاریر کیں۔ کتابیں لکھیں۔ کنونشن بلائے۔ جیسے کئے علماء کی کانفرنسوں

کے ذریعے اسلامی دستور کے بنیادی اصول مرتب کئے اور تمام دنیا کو دکھا دیا کہ جو وہ چاہتے ہیں وہ کیا ہے اور جسے ارباب اقتدار رد کر رہے ہیں۔ وہ کیا رد کر رہے ہیں۔

اس دس سالہ مہم کے اثرات باہر کے ممالک تک پہنچے۔ اس لئے کہ یہ ایک طویل کش مکش تھی اور ابتلاء و آزمائش کے مختلف سنسنی خیز مراحل نے دنیا کو بار بار ہمارے ملک کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اثر جو ابتدائی طور پر بیشتر اسلامی ممالک نے قبول کیا۔ وہ اسلامی دستور، اس کی طلب۔ اس کی فہم اور اس کی مانگ ہے، جو مسلم ممالک کے عوام اور خواص دونوں میں اس پاکستانی اسلامی دستوری مہم کے نتیجے میں پیدا ہو گئی۔ حد یہ ہے کہ جب مارچ ۱۹۵۶ء میں ملک کا دستور بہت کچھ اسلامی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہوا تو اور تو اور انڈونیشیا کی انجمن خواتین تک نے باقاعدہ اجلاس بلا کر شکرانہ کی دعا مانگی اور اسے حکومت پاکستان کا ایک مبارک قدم قرار دیا

مصر

پاکستان میں اسلامی دستور کی مہم کے نتیجے میں مصر کے اندر بھی اس کا چرچا شروع ہو گیا۔ چنانچہ وہاں نومبر ۵۳ء میں مولانا مودودی کی دستوری تقاریر اور مضامین کا مجموعہ "نحو الدستور الاسلامی" کے نام سے شائع ہوا جس کے دیباچے میں لکھا گیا کہ

"آج کل ملک میں اسلامی حکومت کی ماہیت، مزاج اور ڈھانچے کے بارے میں جگہ جگہ بحثیں چھڑی ہوئی ہیں۔ اس لئے ہم بھی اس میں حصہ لیتے ہوئے اسلامی دستور کے موضوع پر یہ کتاب شائع کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔"

جولائی ۱۹۵۲ء سے فروری ۱۹۵۴ء تک تو وہاں پاکستان میں اٹھی ہوئی دستوری

مہم کے زیرِ اثر اسلامی دستور کا بہت چرچا رہا۔ قاہرہ سے "اسلام کا سیاسی نظریہ" اور مولانا کا "دستوری خاکہ" دونوں کتب شائع ہوئیں۔ جو وہاں بڑی تعداد میں پھیلائی گئیں۔ اور اسلام پسند حلقوں نے ان کا بڑی مسرت سے استقبال کیا۔

مولانا مودودی کے اٹھائے ہوئے چار نکاتی مطالبے اور دیگر اسلام پسند عناصر کے اسلامی حکومت کے مطالبے کے نتیجے میں جب پاکستان میں قرارداد مقاصد پاس ہوئی جس میں اللہ کی حاکمیت کو اقتدار کا منبع تسلیم کیا گیا تھا تو اس پر وہاں پاکستانی دستور کو بڑی داد و تحسین پیش کی گئی چنانچہ ڈاکٹر عبداللہ عربی نے اپنے ایک مضمون میں اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا۔

"باشندگانِ پاکستان اپنے ذہن اور وطن کو استعمار کے پنجے سے آزاد کرانے کے لئے جنگ آزادی لڑتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی دستگیری کی اور انہیں ایک ایسی ریاست میں جمع کر دیا جہاں اقتدار کا منبع صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے۔ پس اگر اہل پاکستان اللہ کے اس احسان اور کرم پر شکر ادا کریں گے تو وہ انہیں مزید نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔ اور انہیں وہ عطیے بھی عطا کرے گا جنہیں ان کی سرپرستی سے محروم کر دیا گیا ہے۔"

چنانچہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں جب پاکستان میں مولانا مودودی نے اسلامی دستور کا خاکہ پیش کیا اور حکومت کو بار بار متوجہ کیا کہ اس کے مطابق دستور بنائے تو انہی دنوں مصر میں جنرل نجیب نے ایک دستوری کمیشن قائم کر کے اس میں اخوان المسلمون کے چار آدمی لئے اس کمیشن پر مصر کی نگاہیں مرتکز تھیں اور ان پر ہر چہار طرف سے

دباؤ ڈال رہا تھا۔ کہ دستور خالص اسلامی بنیادوں پر مرتب کیا جائے۔

لیکن جب پاکستان میں اسلامی دستور کے علمبرداروں کو ختم نبوت کی تحریک کی آڑ لے کر سخت سخت سزائیں دی جانے لگیں تاکہ اسلامی دستور کا راستہ روکا جا سکے تو مصر کے جرائد نے اس پر سخت افسوس اور حیرت کا اظہار کیا اور لکھا۔

"پاکستان کے ساتھ ہماری دوستیاں صرف اسلامی عقیدے کی بنیادوں پر ہیں تمام دنیا کے مسلمان پاکستان کے ساتھ بڑی آرزوئیں وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے علمبرداروں کو گرفتار کر کے موت اور عمر قید کی سزائیں دی جا رہی ہیں۔" (المسلمون)

اس زمانے کے مصری رسائل کا مطالعہ کیا جائے اور وہاں کے دستوری رجحانات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کی دستوری مہم نے ان کے خیالات پر بڑا نمایاں اثر ڈالا ہے۔

شام

شام اسلامی دستور کے معاملے میں مصر سے ہمیشہ آگے رہا ہے پاکستان کی دستوری تحریک سے شام کے اسلام پسند عنصر کے فکری اور نظریاتی لگاؤ کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ پاکستان میں مارچ ۱۹۵۳ء سے مئی ۱۹۵۵ء تک اسلامی تحریک اور اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والوں پر جو ناروا مظالم ڈھائے گئے شام کا اسلام پسند عنصر اس پر جس حد تک برافروختہ ہوا۔ وہ خود پاکستان کے اسلام پسند عناصر کی برافروختگی سے کم نہیں تھا مولانا مودودی کے تینوں بیانات جو تحقیقاتی عدالت میں دیئے گئے تھے۔ شام میں شائع ہو چکے۔ قادیانی مسئلے کا پہلا ایڈیشن شام کے ہی ایک رسالے

(التمدن الاسلامی) میں مکمل شائع ہوا اور یہ دونوں چیزیں وہاں بڑی رغبت سے پڑھی گئیں۔

شام یونیورسٹی کے ایک پروفیسر احمد الزین نے "دو دستوری خاکے" اور مولانا مودودی کے دستوری مضامین کے عربی مجموعے سے ایک دستوری خاکہ مرتب کر کے یونیورسٹی کو پیش کیا۔ اور پھر مولانا مودودی کی اجازت سے ۱۹۵۷ء میں اسے کتابی صورت میں پیش کیا۔ مولانا مودودی کے خیالات پر علمی حلقوں میں وہاں مسلسل بحثیں ہوتی رہیں اور انہیں اسلامی علم و ادب کا بہترین مفکر قرار دیا گیا

انڈونیشیا

انڈونیشیا میں اسلامی دستور سے کس قدر والہانہ شغف پایا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس خبر سے کیا جا سکتا ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا گیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور کی تکمیل پر وہاں کی انجمنِ خواتین نے دعائے شکرانہ مانگی انڈونیشیا کی دستوری جدوجہد بھی پاکستان کے حالات سے مماثلت رکھتی ہے۔ — وہاں کے اسلام پسند طبقے نے بھی اسلامی دستور کے نفاذ کے لئے پاکستان کی اسلامی دستور کی جدوجہد سے پورا استفادہ کیا ہے۔ ماشومی پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر ناصر جب اپنے رفقاء کے ہمراہ عالمِ اسلامی کے دورے پر نکلے تاکہ مختلف ممالک کے حالات کا مطالعہ کر کے اور اہلِ علم سے مل کر اسلامی دستور کی تدوین میں مدد حاصل کریں تو اس زمانے میں پاکستان کی تحریکِ اسلامی کا دستوری لٹریچر عربی زبان میں وہاں پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ پھر ۱۹۵۳ء میں جب علماء کی مؤتمر منعقد ہوئی تو اس وقت ماشومی پارٹی کے ذمہ دار افراد پاکستان کی اسلامی تحریک۔ مطالبہ نظامِ اسلامی اور اسلامی دستور کی مہم سے

کافی حد تک روشناس ہوئے اور اس ضرورت کا احساس کیا کہ چونکہ تمام اسلامی ممالک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی شدید رغبت پائی جاتی ہے اس لئے کسی ایسے ادارے کی سخت ضرورت ہے جس کے تعاون سے اس رغبت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔

سوڈان

سوڈان کے آزاد ہوتے ہی وہاں اسلامی دستور کی مہم اٹھ کھڑی ہوئی۔ جو پاکستان میں اسلامی دستور کی مہم سے پوری پوری مماثلت رکھتی تھی۔ ۵۶ء کے وسط میں سوڈان کے جو حضرات حج پر تشریف لائے انہوں نے اپنے پاکستانی اسلام پسند مہمانوں سے دستورِ اسلامی کے موضوع پر گفت و شنید کی اور اپنے ملک کی آئینی مہم کو سر کرنے کے لئے پاکستانی بھائیوں کے تجربات سے استفادہ کیا۔ بلکہ مولانا ظفر احمد انصاری جو پاکستان کے اسلام پسند عناصر اور مولانا مودودی کے نکتۂ نظر سے متاثر حضرات میں ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ انہیں سوڈان میں آنے کی دعوت دی گئی چنانچہ انہوں نے سوڈان میں خرطوم یونیورسٹی میں خطاب کیا اور دستوری مسائل پر وہاں کی اسلام پسند جماعتوں اور نمائندہ شخصیتوں سے گفتگو کی اور آئینی اور دستوری مسائل پر انہیں مفید مشورے دیئے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے ۳۳ علماء کے مرتب کردہ اسلامی دستوری خاکے کے نقشے پر بھی وہاں دستوری خاکہ مرتب کر کے اس کی اشاعت کی گئی اور وہاں اسلامی دستور کی مہم بالکل اسی نقشے پر چلائی گئی جیسی پاکستان میں چلتی رہی تھی۔

مراکش یہاں مولانا مودودی کا دستوری لٹریچر پاکستان سے عربی میں ترجمہ ہو کر

پہنچ رہا ہے لیکن وہاں فرانسیسی اثرات کی جڑیں اب تک بہت مضبوط ہیں۔ وہاں کی تحریک اسلامی کے لیڈر پروفیسر مکی الناصری نے مولانا کی کتاب "اسلامی ریاست" (ISLAMIC LAW AND CONSTITUTION) کا ایک نسخہ سلطان مراکش کو پیش کیا تھا انہوں نے اسے پڑھ کر کہا کہ "میں انشاء اللہ اپنے ملک کی گاڑی اسی کے مطابق چلاؤں گا۔" لیکن افسوس ہے کہ وہاں بھی فرنگیت زدہ عناصر کے پنجے بہت گہرے گڑے ہوئے ہیں اور جب تک اسلامی نظام فکر کو علمی میدان میں پوری طرح برتر ثابت کرنا چاہئے کام کا راستہ پیدا نہیں ہوتا

نائیجیریا

یہاں کے مسلمانوں تک بھی اسلامی دستور اور اسلامی نظام کی صدائے بازگشت پہنچ چکی ہے۔ لیکن پاکستان کے حالات نے ان پر بڑا برا اثر ڈالا ہے۔ وہاں کے ایک وفد کے ارکان نے ایک ملاقات میں ایک پاکستانی مبلغ سے کہا۔

"ہم ملکی دستور کو پاکستان کے دستور کی روشنی میں مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن یہاں کے حالات نے اس معاملے میں ہمیں بدگمانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔"

یہ ہیں وہ دستوری اثرات جو پاکستان میں مولانا مودودی کی چلائی ہوئی اسلامی دستور کی مہم نے مختلف مسلمان ملکوں میں پیدا کئے ہیں اور جن کے نتیجے میں وہاں اسلامی دستور کا مطالبہ اور اس کی تڑپ قوت اور حرکت کے ساتھ اٹھ چکی ہے اس کے علاوہ کئی دیگر ممالک میں جہاں مولانا مودودی کی تصانیف کے ذریعے ان کی فکر کی شعاعیں آہستہ آہستہ نفوذ کر رہی ہیں وہاں اسلامی دستور کی طلب اور مانگ پیدا ہو رہی ہے۔

سزائے موت پر عالمگیر احتجاج

راہِ حق میں کام کرنے والوں پر بلا جرم ظلم

کا سلسلہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ جہاں اس راہ پر چلنے کی سعادت بھی لوگوں کو حاصل ہوتی رہی ہے۔ وہیں اس راہ میں مزاحم ہوتے اور ظلم و ستم کرنے کی بدبختی بھی تاریخ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ افراد کے حصے میں آتی رہی ہے۔

مولانا مودودی نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے خالص جمہوری طریقوں سے ایک طرف عوام میں اس کا شعور پیدا کیا اور دوسری طرف اربابِ اقتدار کو اس طرف توجہ دلائی لیکن مسلمان ہونے کے سبب اربابِ اقتدار نہ اس سے انکار کر سکتے تھے اور نہ اپنی دلچسپیوں اور مفاد کو چھوڑنے کی ہمت وجرات رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ مولانا مودودی کے نظریات کو دلیل سے غلط ثابت کرنے کی بجائے ان کی ہستی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے لیکن زمانے نے دیکھا کہ یہ سازش کرنے والے خود حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ اسی روح فرسا موقعہ پر جب اربابِ اقتدار نے ختمِ نبوت کی آڑ لے کر مولانا کو موت کی سزا سنائی اور پھر عوام کے مسلسل اور شدید احتجاج پر اسے ۱۴ سال کی مدت میں بدل دیا۔ تو مختلف بیرونی ممالک کی طرف سے بھی اس سزا پر احتجاج کیا گیا۔ اسی احتجاج کے سلسلے میں چند ایک اقتباسات جو مجھے حاصل ہو سکے ہیں۔ یہاں درج کر رہا ہوں۔

انگلستان کے مسلمانوں نے متفقہ قرارداد کے ذریعے اپنے جذبات سے پاکستان کے حکمرانوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں آگاہ کیا

"پاکستان کی ترقی و استحکام کے لئے جو لوگ سب سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ ان میں ان علماء و مفکرین کی خدمات کی از حد ضرورت ہے۔ جن میں تفقہ فی الدین کے ساتھ ساتھ یہ بھی صلاحیت ہو کہ وہ اسلامی اصول و احکام کو موجودہ زمانے

کے احوال و ضروریات پر منطبق کر سکیں، اسی قسم کے ذی علم اور اصحاب بصیرت میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا شمار ہوتا ہے۔"

انڈونیشیا کے مسلمانوں نے تار بھجوایا۔

"مودودی صاحب دنیائے اسلام کی امانت ہیں، مولانا صاحب کی اگر پاکستان کو ضرورت نہیں۔ تو دنیائے اسلام کو ان کی ضرورت ہے ہم انڈونیشیا کے مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے خیالات کی آج مسلم دنیا کو اشد ضرورت ہے۔"

قاہرہ کے عربی اخبار "منبر الشرق" نے لکھا۔

"مصر کی ساری دینی جماعتیں مولانا مودودی کو ایک مخلص عالم اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں صف اول کا جلیل القدر مجاہد صادق سمجھتی ہیں۔"

روزنامہ "السجل" نے بغداد سے لکھا۔

"علامہ ابوالاعلیٰ مودودی، وہ حق آگاہ جس کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ کے سوا کوئی نہیں۔"

رسالہ "الدعوت" قاہرہ نے لکھا۔

"مولانا مودودی کی سزائے موت محض ایک فرد بشر کی موت کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اسلام کی تلواروں میں سے ایک تلوار کو توڑ دینا۔ اسلام کی آوازوں میں سے ایک آواز کو خاموش کر دینا ہے اور اسلام کے وقار و اعزاز کو مٹا دینا ہے۔ آہ۔ وہ حرکت جس پر دشمنان اسلام مسرت کے

شادیانے بجائیں گے۔"

شیخ محمد بشیر الابراہیمی ایڈیٹر اخبار البصائر" نے من ہو المودودی" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا جس کے چند اقتباسات یہ ہیں۔

"آپ ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ میں نے کم ہی ایسے باکمال دیکھے ہیں بلکہ آپ چند خصوصیات کے اعتبار سے فردِ واحد ہیں جس کی نظیر میں اس دور کے علماء میں نہیں پاتا۔ حق کے معاملہ میں نہایت سخت، مداہنت سے کوسوں دور اور راہِ حق میں ابتلاء محن کے وقت صبر و ثبات کے پیکرِ مجسم حکامِ وقت کے تقرب سے متنفر، خوشامد و تملق تو بہت دور کی بات ہے شریعت کے مزاج شناس، قرآن و حدیث پر کامل عبور، موجودہ تہذیب کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف۔ علامہ مودودی اپنے پہلو میں ایسا دل رکھتے ہیں، جو مسلمانوں کی موجودہ پستی و زبوں حالی کے درد سے تڑپتا رہتا ہے۔

ہم اس واقعہ کے اظہار پر مجبور ہیں کہ مودودی ہی وہ واحد شخصیت ہیں جو پاکستان میں مطلوبہ اسلامی دستور کی وضع و ترتیب پر قدرت رکھتی ہے۔ مودودی کی شخصیت کسی ایک ملک اور کسی ایک خطۂ زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ دنیا کے سارے مسلمانوں کو فیض رسانی کے لیے عالمِ اسلام کی امانت ہیں۔"

ہندوستان میں اخبار "سیاست جدید" کان پور کے ایڈیٹر نے لکھا۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ آپ کو ہمارا اسلام آپ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لئے اپنا حق ادا کر دیا ہے"۔

ماہ نامہ "تجلی" دیوبند کے ایڈیٹر مولانا عامر عثمانی نے لکھا۔

"مولینا مودودی ہی وہ شخص ہے جس نے تمام دنیا سے اسلام کو ایک عظیم الشان اسلامی لٹریچر دیا۔ کہ اگر کوئی قدردان ہو تو اس کے صلہ میں ہفت اقلیم بھی کم ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کے لٹریچر کا ایک ایک صفحہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے"۔

روزنامہ "نئی دنیا" دہلی نے لکھا۔

"مولانا مودودی جن کا پاکستان ہی نہیں۔ پاکستان کے باہر بھی ایک خاص حلقہ کے دلوں میں احترام ہے"۔

ہفت روزہ" روشنی" بنگلور نے لکھا۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا وجود مسلمانوں کے لئے ایک متاع گراں مایہ ہے۔ اپنے قلم و زبان سے ملت اسلامیہ کی جو خدمت انہوں نے انجام دی ہے وہ ناقابل فراموش ہے"۔

ماہ نامہ "الکلام" بمبئی نے لکھا۔

"مولانا مودودی، جنہوں نے اپنے قلم اور زبان کی ساری قوت تبلیغ اسلام کے لئے لگا رکھی ہے"۔

مولانا مودودی کی دعوت مشن اور کام پر ریسرچ

مولانا مودودی نے گذشتہ ربع صدی میں جو کام سرانجام دیا ہے وہ حیرت ناک

ہے ایک طرف انہوں نے تفہیم اسلام کے لئے ایک ایسا عظیم الشان لٹریچر تیار کیا ہے جو حق کے متلاشی کی قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔ اور دوسری طرف حق کی سربلندی اور اسلامی نظریۂ حیات کی بالفعل ترویج و نفاذ کے لئے عالم اسلام میں ایک زبردست تحریک برپا کر دی ہے چنانچہ یورپ کے مبصرین جو مشرق میں اٹھنے والی ہر فکر پر چونکتے اور چوکنے ہو کر اس کا جائزہ لینے لگ جاتے ہیں تاکہ وہ آئندہ قوت پکڑ کر ان کے لئے کسی پہلو سے خطرناک ثابت نہ ہو۔ اور کچھ زندہ قوموں کی خصوصیات رکھنے کے سبب ذوقِ تحقیق و تجسس بھی رکھتے ہیں۔ مولینا مودودی کی پھیلتی ہوئی فکری تحریک سے وہ بھی مجبور ہوتے ہیں کہ اس اٹھتی ہوئی نئی نظریاتی قوت کا جائزہ لیں اور اس کے خدوخال سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ تاکہ اس کے ساتھ معاملہ کرنے اور کوئی طرزِ عمل متعین کرنے کے لئے انہیں علم و عقل کی روشنی میں صحیح معلومات فراہم ہوں۔

پاکستان کے باشندوں کے لئے بلاشبہ یہ بات موجبِ فخر ہے کہ ان کے ایک ہم وطن مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار و نظریات پر میکگل یونیورسٹی کینیڈا میں علمی تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ اس کام میں ڈاکٹر پروفیسر چارلس جے ایڈمز مصروف ہیں۔ انہیں راک فیلر فونڈیشن کی طرف سے ۶ ہزار ڈالر کی گرانٹ دی گئی ہے۔ یہ کام یونیورسٹی کے ادارہ تعلیمات اسلامیہ کے تحت سرانجام پا رہا ہے۔ اس ادارے نے ہند و پاکستان میں اسلام کے جدید رجحانات پر ریسرچ کرنے کے لئے نصاب کے طور پر جو کتب تجویز کی ہیں ان میں مولینا مودودی کی کتابیں بھی شامل ہیں

اس ادارے کے تحت مولینا ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی نظریات اور جماعت اسلامی کی تنظیم اور اس کے پروگرام پر تحقیق ہو رہی ہے۔ انہوں نے پاکستان میں رہ کر دو سال گزارے مولینا مودودی اور ان کے رفقا سے ملاقاتیں کیں۔ اردو سیکھی اور اپنی ریسرچ کے لئے مواد جمع کرتے رہے۔

انہیں اس تحقیقی کام میں سیاسی مباحث سے تعرض نہیں کرنا ہے بلکہ ان کا دائرۂ تحقیق یہ ہے کہ مولینا مودودی نے ہمارے دور کی سیاسی فکر میں کیا حصّہ شامل کیا ہے۔ ان کے پاس مولینا مودودی کی تمام تصانیف ترجمان القرآن کے تمام فائل اور ان کے علاوہ کثیر لٹریچر کا ایک ڈھیر موجود ہے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر ایڈمز نے کراچی کے انگریزی ماہنامہ "وائس آف اسلام" کے ایڈیٹر کے نام ایک مکتوب میں اپنے کام کا مختصر تذکرہ کیا جس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

"پچھلے سال ایک امریکی ادارہ نے جو مختلف مذاہب کے درمیان تعلقات میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہے مجھے ایک مقالہ لکھنے کے لئے کہا تھا۔ اس مقالہ میں میں نے مولینا مودودی صاحب کے متعلق ذرا تفصیل سے اظہارِ خیال کیا تھا۔ جس اجتماع میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔ اس میں راک فیلر فانڈیشن کا ایک نمائندہ بھی موجود تھا۔ مقالہ کے بعد وہ مجھ سے ملا اور تجویز پیش کی کہ مولانا مودودی کے سیاسی افکار پر تحقیق کی جائے۔ اب میں ایک سال تک مولینا مودودی پر ایک کتاب تیار کرنے میں مصروف رہوں گا اور اس میں میں خصوصیت سے ان کے ان افکار کا مطالعہ پیش کروں گا۔ جو اسلامی ریاست سے

متعلق ایک

______ آپ جانتے ہیں کہ ہماری لائبریری میں مولینا صاحب کی تصنیفات اور جماعت کے دوسرے اہل قلم کی نگارشات بکثرت موجود ہیں. خود میرے اپنے کمرے میں اس وقت مولینا کی کتابوں کا اتنا بڑا انبار لگا ہوا ہے کہ اس کی بلندی میرے سر سے بھی کچھ زیادہ ہے. پھر ہماری لائبریری میں رسالہ ترجمان القرآن کا مکمل فائل بھی موجود ہے. خوش قسمتی سے میری اردو اب اتنی اچھی ہو گئی ہے. کہ میں بیشتر تصنیفات کا براہ راست مطالعہ کر لوں گا جو میرے پاس ہیں. ویسے میں ان دوسری چیزوں کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

باوجودیکہ پاکستان میں جماعت اسلامی کو توڑ دیا گیا ہے لیکن میں اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہوں کہ وہاں مولانا صاحب کی بڑی اہمیت ہے میں بعض معاملات میں ان سے اختلاف کے باوجود ان کے اخلاص اور مستعدی کا بڑا معترف ہوں اور ان کی کوششوں کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں جو آج کے نہایت سخت زمانے میں اسلام کے تقاضوں کو اجاگر کرنے کے لئے انہوں نے کی ہیں. میرا اصل مقصد مولانا کے نظریات و افکار کو اپنی استطاعت بھر مغربی پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرنا ہے اسی لئے کہ وہ عملاً مغرب کی دسترس سے باہر ہیں. میں یہ بھی ارادہ رکھتا ہوں کہ مولینا صاحب کے افکار کو جیسا کہ میں محسوس کرتا ہوں پیش کروں اور ان مسائل کی نشاندہی بھی کروں جو میرے خیال میں اب تک حل

نہیں ہوئے ہیں لیکن بہرحال میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مولینا صاحب پر کوئی محاکمہ کروں۔ میں تو یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں باقی میرا یہ ارادہ بھی ہے۔ کہ پاکستان کے پس منظر میں ان کے مقام کو متعین کروں۔"

یونیورسٹی کے اخبار منگل ڈیلی میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا۔

"_____ مولینا مودودی کی زندگی ہمیں ان میں دلچسپی لینے پر مجبور کرتی ہے۔ مودودی صاحب جدید دنیا کے ان تین چار مفکرین میں سے ایک ہیں جنہوں نے ایک جدید ریاست کو اسلام کے روایتی نکتہ نظر کی روشنی میں قائم کرنے کی سعی کی ہے اور اس حیثیت سے وہ بڑے اہم ہیں۔"

اس کے علاوہ مختلف ممالک کے اہل علم ان سے جو براہ راست رابطہ پیدا کرتے اور خط و کتابت کرتے ہیں۔ وہ مولینا کے ذاتی معاون کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ نہایت کثرت سے ہیں جن کا احاطہ مشکل اور ایک طویل کام ہے۔

بیرونی اسلامی ممالک کے دورے

موتمر عالم اسلامی کے دمشق میں منعقد ہونے والے دوسرے اجلاس میں شرکت کے لئے مولینا مودودی جون ۱۹۵۶ء میں مشرق وسطیٰ کے سفر پر روانہ ہوئے پہلے اجلاس کے موقعہ پر مولینا سزائے موت اور عمر قید والی جیل میں تھے۔ اس موتمر کے اجلاسوں میں عالم اسلام کے نمائندوں نے مولینا کی اسلامی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا۔ مولینا نے ان مختلف اجلاسوں میں سے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی اور مولانا کو موتمر کی طرف سے تبلیغ و دعوت اسلامی کی کمیٹی کے صدر منتخب کیا گیا۔

دمشق میں موتمر کے اجلاس میں شرکت اور صدارت کے بعد مولینا نے مشرقِ وسطیٰ کے بعض دیگر ممالک کا دورہ بھی کیا۔ اور فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ جہاں مسلم ممالک سے آئے ہوئے مختلف اصحاب علم و نظر سے رابطہ قائم ہوا۔

دمشق روانہ ہوئے تو تھوڑی دیر بحرین رکنے کے بعد بیروت پہنچے۔ یہاں لبنان کی اسلامی تحریک "عباد الرحمٰن" کے رہنماؤں۔ کارکنوں اور شہر کے معززین نے ہوائی اڈے پر مولانا کا پرجوش استقبال کیا۔ "عباد الرحمٰن" کے اسکاؤٹوں نے باقاعدہ مولینا مودودی کو سلامی دی۔ ان سے معلوم ہوا کہ جماعت عباد الرحمٰن کے حلقوں میں مولینا مودودی کا عربی لٹریچر کثرت سے پھیلا ہوا ہے اور ہر شخص مولینا مودودی اور جماعت اسلامی سے پوری طرح واقف ہے۔

شام کی سرحد پر پہنچے تو وہاں مولینا اور ان کے ساتھیوں کے سامان کا کوئی معائنہ نہیں کیا گیا۔ پولیس چوکی کے انچارج نے بتایا کہ اسے حکومت کی طرف سے ہدایت آگئی ہے کہ وہ شامی حکومت اور شامی قوم کی طرف سے مولینا مودودی کا خیر مقدم کرے۔ دمشق شہر سے دس بارہ میل باہر تک شہر کے عمائدین مولینا مودودی کے استقبال کے لئے کاروں کا ایک قافلہ لئے ہوئے پہلے سے موجود تھے۔ جن کے ہمراہ مولینا دمشق میں داخل ہوئے۔ شام کو مندوبین کے اعزاز میں دعوت کا انتظام کیا گیا جس میں شہریوں کے علاوہ وزیر عدلیہ۔ پارلیمنٹ کے صدر اور وزیر داخلہ نے بھی شرکت کی۔

یہ بھی اسی موقعہ پر معلوم ہوا کہ سوڈان میں مولینا مودودی کا لٹریچر کثیر تعداد میں پہنچا ہوا ہے اور عرب کے دیگر مقامات پر بھی پہنچ رہا ہے۔ مراکش کی اسلامی

جماعت کے رہنما جناب مکی الناصری نے مولانا مودودی کی تصانیف دمشق کے علاوہ طنجہ سے بھی شائع کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اور پروگرام بنایا کہ وہ ان کتب کو عربی میں شائع کر کے مراکش، ٹیونس اور الجزائر میں پھیلائیں گے۔

مولانا مودودی نے اس سفر میں ایک نہایت اہم ملکی خدمت یہ انجام دی کہ عربوں میں پاکستان کے بارے میں اور بھارت کے حق میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں ان کا ازالہ کرنے کی جگہ جگہ کوشش کی اور عربوں کے "عرب نیشلزم" کو حکمت سے غلط ثابت کیا اور جابجا اس کا اظہار کیا اور بتایا کہ ہمارا آپ کا رشتہ اسلام کی بنیاد پر ہے۔ آپ اگر پاکستان کی بجائے بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھائیں جو ہمارا تمہارا اسرائیل سے بھی بڑا دشمن ہے جو گذشتہ کئی برسوں سے ہمارے وسیع رقبے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کئے ہوئے ہے۔ تو پھر تم ہم سے کیا توقع رکھ سکتے ہو۔ ہم نے اسرائیل کو اب تک تسلیم نہیں کیا۔ اور بھارت مدت سے کر چکا ہے مختلف مجالس میں ایسی گفتگوئیں ہوئیں اور اہل علم نے مولانا مودودی کے اس موقف کو پسند کیا اور مولانا کو بتایا کہ عرب ممالک میں دراصل پاکستان کی صحیح نمائندگی نہیں ہو رہی ہے۔

دمشق سے واپسی پر بھی شامی حکومت نے انتہائی عزت و احترام کا سلوک کیا۔ وزیر مواصلات ملک اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لئے تشریف لائے اور خاص کی سرحد تک، گاڑی کے سفر کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا گیا۔

شرق اردن میں شاہ حسین نے ایک دعوت دی اور ایک جلسۂ عام میں بھی مولانا کو تقریر کرنی پڑی جس میں اسلامی نظام زندگی جماعت اسلامی اس کے لٹریچر

اور عربی تراجم کے متعلق بہت سے سوالات کا جواب دیا اور پاکستان کی خارجی پالیسی اور معاہدہ بغداد کے خلاف عربوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور انہیں مطمئن کیا مولینا نے کہا ـــــ "سارے عرب ممالک اسرائیل جیسی چھوٹی طاقت سے ۲۰ گنا بڑے ہونے کے باوجود اس سے بچنے کے لئے روسی بلاک کے آگے دستِ استمداد پھیلاتے ہیں اور اسے جائز سمجھتے ہیں تو پاکستان اپنے سے چار گنا بڑی طاقت کی چیرہ دستی سے بچنے کیلئے امریکی امداد لے تو وہ کیوں سراپا شکایت بن جاتے ہیں جب کہ پاکستان عرب ممالک کے تمام قضیوں میں ان کا حامی رہا ہے۔"

حلب سے ایک خاص وفد مولینا مودودی کو لے جانے کے لئے آیا چنانچہ مولینا مودودی مراکش کے رہنما کی الناصری اور الجزائر کے رہنما جناب محمد الغیری کے ہمراہ حلب روانہ ہوئے۔ تو راستے کے مختلف مقامات پر عربوں نے شہر سے دس دس پندرہ پندرہ میل آگے کاروں کے قافلے لا لاکر اپنے مخصوص انداز میں مولانا کا استقبال کیا۔

حمص اور حماۃ میں اخوان نوجوانوں نے قدیم عرب رواج کے مطابق عربی نظمیں پڑھ پڑھ کر اور تالیاں بجا بجا کر مولینا کا استقبال کیا۔ اخوان نوجوانوں نے تو اپنی محبت و الفت کا انتہائی گہرا اظہار کیا جس سے مولینا مودودی بہت متاثر ہوئے۔

شامی فوج کے بہت سے نوجوان مولینا مودودی سے ملے۔ اور ان سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سے مولینا مودودی کی کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ ان سے اچھی طرح واقف ہیں اور حکومت کی طرف سے بھی مولانا کا لٹریچر فوجوں میں جلسے ترجمہ

کوئی پابندی نہیں ہے۔ مولانا مودودی کو افسوس تھا کہ ان کے اپنے ملک میں حکومت ان کے لٹریچر کو فوجوں کے لئے شجر ممنوعہ قرار دیتی ہے اور کسی فوجی نوجوان کے پاس ان کی کسی کتاب کا نکل آنا اسے مجرم قرار دلوانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

سعودی عرب میں بھی بہت سے لوگ مولانا کی عربی تصانیف کا مطالعہ کئے ہوئے ان سے آآ کر ملے اور قیام مکہ کے دوران برابر آ کر ملتے اور تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔

سیام کے بہت سے متدین اور بعض دینی انجمنوں کے لیڈروں نے بھی مولانا سے ملاقاتیں کیں اور مولانا کی تصانیف کا سیامی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔

روسی ترکستانی مہاجروں کی ایک بڑی تعداد آ کر ملتی رہی اور اس نے مولانا کو اپنے حالِ زار سے آگاہ کیا۔ اور بتایا کہ روس نے ترکستان میں کیا کیا مظالم توڑے اور مسلمانوں کو کس کس طرح تباہ و برباد کیا۔ ان میں ایک عالم نے مولانا کی چند کتابوں کا ترکستانی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہوا تھا۔

مقبوضہ کشمیر کے بھی بہت سے مسلمان آکر ملے اور انہوں نے کشمیری مسلمانوں پر بھارت کے توڑے جانے والے مظالم کا ذکر کیا۔ وہ گڑگڑا گڑگڑا کر حرم پاک میں کشمیر کی آزادی کی دعائیں مانگتے اور روتے تھے۔

ترکی کے بھی بہت سے حضرات آئے۔ جو بڑی تلاش و جستجو کے بعد آ کر ملے تھے۔ انہوں نے یہ خبر کہیں سے سنی تھی کہ مولانا مودودی صاحب امسال حج کے

لئے تشریف لائے ہیں۔ وہ مولانا کو مکہ میں تلاش کرتے رہے۔ بالآخر مدینہ شریف میں آ کر ملاقات ہوئی وہ بھی مولانا کی کتب کے ترجمے ترکی میں کرنا چاہتے تھے، جس کی مولانا نے اجازت دے دی

اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مولانا مشرق وسطیٰ کے دورے پر دوبارہ تشریف لے گئے۔ یہ دورہ خالص علمی تحقیقی اور تاریخی مقامات ارض القرآن کے مشاہدات سے متعلق تھا۔ مولانا مودودی اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن کے لئے ارض القرآن کے مختلف مقامات کا خود مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

اس دورے میں بھی مولانا کے ساتھ ہر جگہ انتہائی برادرانہ سلوک کیا گیا۔ مختلف عرب حکومتوں نے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں، خصوصاً سعودی عرب اور شرق اردن کے حکام اور فرمانرواؤں نے تو مہمان نوازی کا ناقابل فراموش مظاہرہ کیا۔ اس دورے میں بھی مولانا کو جہاں جہاں موقعہ ملا عرب قوم پرستی کے غلط تصور کی اصلاح کی کوشش کی اور پاکستان کی پوزیشن واضح کی۔ اکثر مقامات پر تو مولانا نے عرب بھائیوں سے صاف کہا۔

"ہمارا اور تمہارا رشتہ اسلام کی بدولت ہے۔ اسلام کو تم لے کر اٹھو تو دنیا کے ۵۰، ۶۰ کروڑ مسلمان تمہارے ساتھ ہیں لیکن کفر جاہلیت کو اختیار کرو گے تو دنیا کے مسلمان تو درکنار، عرب کے مسلمانوں کا بھی بڑا حصہ تم کو الوداع کہے گا اور تم کسی طرف سے بھی کوئی تائید نہ پا سکو گے۔" مولانا نے بتایا۔

"میرا خیال ہے کہ عربی ممالک میں قومیت پرستی اور الحاد اور فسق و فجور تینوں ایک ہی منبع سے آ رہی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چل رہی ہیں۔ جو لوگ قومیت عرب کے علمبردار ہیں وہی الحاد اور فسق و فجور کے علمبردار ہیں"

تین سال بعد اس سفر میں اندازہ ہوا کہ مولانا مودودی کی دعوت، اشاعت تصانیف اور تعارف عرب ممالک میں ۱۹۵۶ء کے مقابلہ میں کئی گنا بڑھ چکا ہے۔ عربی کتب کی اشاعت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مولانا کے ساتھ حکام اور حکمرانوں کا طرز عمل نہایت ہی

مہماندارانہ اور مشفقانہ رہا۔ جا بجا تبلیغی اجتماعات منعقد ہوتے رہے جہاں مولانا نے اپنی دعوت اور مشن کا تعارف کرایا اور سوالات کے جوابات دیئے۔ کالجوں میں خطاب کیا۔ ذہین طبقہ پہلے سے کافی متعارف ہو چکا ہے اور محسوس ہوا کہ مولانا کی تصانیف بڑی سرعت سے دین دار طبقہ میں پھیل رہی ہیں۔ عرب قومیت کا اندھا جذبہ بھی ان اثرات کے مقابلے میں پہلے سے کم محسوس ہوا۔ یہ دورہ دعوتی اور تعارفی لحاظ سے نہایت کامیاب رہا۔

پھر جلد ہی دسمبر ۱۹۶۰ء میں مولانا کو تیسری بار سعودی عرب جانا پڑا۔ اس بار مولانا شاہ سعود کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے۔ شاہ کے پیش نظر مدینہ شریف میں ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام تھا جس کا ابتدائی خاکہ تیار کرنے کے لئے اس نے چند اہل علم حضرات کی مجلس منعقد کی اور مولینا مودودی کو شاہی مہمان کی حیثیت سے پاکستان سے مدعو کیا۔

مولینا اپنا خاکہ یہاں سے مرتب کر کے ہمراہ لے گئے تھے، جسے وہاں ممبران میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور اسی کو بنیاد بنا کر نقشۂ کار بنایا گیا۔ شاہ سعود نے مولینا سے مدینہ شریف جا کر یونیورسٹی کی عمارت اور جگہ دیکھنے اور مناسب مشورہ دینے کی بھی خواہش ظاہر کی چنانچہ مولانا مدینہ شریف بھی گئے۔

اس دورے میں بھی کثرت سے ملاقاتیں ہوئیں۔ تعلقات قائم ہوئے۔ ریاض یونیورسٹی کے پروفیسروں اور طلباء سے مختلف مسائل پر گفتگوئیں ہوتی رہیں مختلف تقریبات اور اجتماعات میں بھی شرکت کی۔ تقاریر کیں۔ مولینا کو اس یونیورسٹی سے مسلمانوں کی دینی معیاری تعلیم کے بارے میں بڑی توقعات ہیں۔

یہیں پر افریقہ میں تبلیغِ اسلام کا پروگرام بنایا گیا۔ اور کام کے لئے بہت کچھ امید افزا حالات اور ذرائع سامنے آئے۔ ایک اخبار نے تو مولانا کو افریقہ میں تبلیغِ اسلام کے اہم فریضہ کی طرف متوجہ بھی کیا۔

"بلا شبہ مولانا اس کام کے لئے ذہناً تیار بھی ہیں۔ اور کام کا ایک مستقل نقشہ بھی سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن جو ذرائع انہیں اس کام کے لئے مطلوب ہیں، انکی فراہمی کا سامان حکومت کی طرف سے تو الگ رہا۔ کیا معمولی پاسپورٹ اور زرِ مبادلہ کی سہولتیں بھی مولانا کے لئے فراہم ہو سکتی ہیں؟ یہ بات اپنی جگہ خود محلِ نظر ہے بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ مولانا بہت جلد افریقہ تبلیغ کے سلسلے میں مسلمانانِ کینیا اور نیروبی کی دعوت پر تشریف لے جا رہے ہیں اور انجمن حمایتِ اسلام نیروبی ایک جامع تبلیغی پروگرام بناتے ہوئے مولانا کی تشریف آوری کی منتظر ہے۔ مولانا اس تبلیغی دورے کے لئے ہر وقت پا بہ رکاب ہیں بشرطیکہ حکومت کو اس تبلیغ پر کوئی اعتراض نہ ہو"

غیر مسلم ممالک میں اثرات

ہندوستان

پاکستان سے باہر جن غیر ممالک میں مولانا مودودی کی دعوت اور مشن کے اثرات پہنچ چکے ہیں، ان میں نمایاں ترین ملک ہندوستان ہے۔ جہاں تقسیم سے قبل مولانا مودودی پورے ملک میں اپنا کام خود کر رہے تھے اور تقسیم کے بعد مولانا کے ہم خیال لوگ ان کے مشن اور دعوت کے مطابق منظم طور پر اسلامی دعوت اور تبلیغ اسلام کا کام کر رہے ہیں۔

اس وقت جو لوگ وہاں کام کر رہے ہیں۔ وہ جماعت اسلامی ہند کی ایک

تنظیم کی شکل میں منظم ہیں۔ جس کا پروگرام چار بنیادی نکات پر مشتمل ہے (یہ معلومات روزنامہ "دعوت" دہلی کے اجتماع نمبر سے حاصل کی گئی ہیں)

- فرقہ دارانہ طبقاتی کشمکش کا استیصال
- مسلمانوں کے معاشرے کی اسلامی اصولوں کے مطابق اصلاح اور ان میں علم دین کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت۔
- ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو دعوت سے متاثر کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر تحقیقی اور تعمیری کاموں میں لگانے کی کوشش خصوصاً دہریت۔ فرقہ واریت سوشلزم اور کمیونزم کے سیلاب کے سامنے علمی اور استدلالی بند باندھنے کی کوشش۔
- ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں تقریری و تحریری صلاحیت کی نشوونما تاکہ ان مختلف زبانوں میں دعوت اسلامی کو پیش کیا جا سکے۔

اس چار نکاتی بنیادی پروگرام پر عمل کرتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو ۲۴ سال گذر چکے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے ہر ہر نکتے پر وافر کام کیا ہے۔ لٹریچر اور اشاعت کتب کے ذریعہ ذہنی اور فکری اصلاح ملاقاتوں کے ذریعہ رابطہ عوام اور فرقہ وارانہ جذبات کا استیصال اسٹڈی سرکل۔ تعلیم بالغان۔ خواتین میں دینی شعور کا فروغ۔ بچوں کو لادینی تعلیم کے اثرات سے بچانا اور بے جا مذہبی مخالفتوں کو افہام و تفہیم اور صابرانہ رویہ سے رفع کرنا۔ فرقہ وارانہ جذبات کی شدت اور مقامی حکومت کی سختیوں کے باوجود انہوں نے اپنے پروگرام میں کافی کامیابی حاصل کی ہے۔ اب تک وہاں متعدد زبانوں میں دارالاشاعت قائم کر کے دعوت اسلامی کی توسیع کا کام ہو رہا ہے۔ بنگلہ۔ ملیام۔ ٹامل۔ تلنگی۔ کنٹری۔ گجراتی اور مرہٹی زبانوں

میں دارالاشاعت قائم ہو چکے ہیں۔ مختلف زبانوں میں دعوتِ اسلامی پیش کرنے کے لئے جرائد اور رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں اور بڑے بڑے ہفتہ وار، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ اجلاسوں کے ذریعے بھی توسیع دعوت اسلامی کا کام جاری ہے۔ ان کا مکتبہ لاکھوں کی تعداد میں اسلامی کتب کے مختلف زبانوں میں ایڈیشن نکال رہا ہے اور ہندوستان کے عوام میں اسلام کا شعور اور انسانی مساوات و اخوت کا پیغام پہنچا رہا ہے۔ ایک سو سے زائد تو تعلیم بالغان کے مراکز قائم ہیں جن کے ذریعے عوام کو دعوت سے روشناس کرانے کا کام جاری ہے اور ۱۰۸ سے زائد دینی درس گاہیں ہیں جن میں مسلمان بچوں کو اسلام کی صحیح تعلیم دینے کا انتظام اور اسلامی شعور پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ دو دینی کالج اور متعدد دینی مدرسے اس کے علاوہ قائم ہیں ان کے مرکز میں بھی ایک اعلیٰ دینی درس گاہ ہے۔ جہاں اسلامی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام مسلمان طلباء کے لئے کیا گیا ہے مسلمانوں کے مشترکہ تعلیمی بورڈ کے قیام کے ذریعے بھی دیگر مسلم جماعتوں سے مل کر مسلمانوں کے لئے تعلیمی اصلاحات و مناسب انتظامات کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اور تمام مسلم جماعتوں کا مشترکہ کنونشن بھی اپنے سامنے ایسا ہی پروگرام رکھتا ہے۔ فسادات کے دوران خدمتِ خلق کے مواقع پر وہاں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اور جبل پور کے فسادات پر تو مسلم عوام نے ان پر اپنے اعتماد کا کھلم کھلا اظہار کیا اور لاکھوں کی رقوم جمع کر کے ان کے حوالے کیں تاکہ ریلیف کا کام ہو سکے۔

انہوں نے خوف زدہ اور ہراساں مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس وقت وہاں کی اسلامی تنظیم مسلمانوں

کے اندر نہایت مقبول اور دیگر تنظیموں کے اندر بڑا وزن رکھتی ہے۔

لنکا

ہندوستان کے بعد لنکا میں بھی مولانا مودودی کی فکر سے وابستہ لوگ ایک جماعت کی صورت میں منظم ہیں۔ جن کی بیشتر تعداد اساتذہ اور طلبا پر مبنی ہے۔ ان کے علاوہ عام مسلمان شہریوں میں بھی اس کا اثر بڑھ رہا ہے۔ یہ لوگ وہاں مسلم برادر ہڈ موومنٹ Muslim Brother hood movement کے نام سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے اپنے ایک دو جرائد بھی نکلتے ہیں باقاعدہ ہفتہ وار اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں۔ جن میں وہ ——

—— اصلاحِ اخلاق

—— اصلاحِ معاشرہ

—— اور ——

—— توسیع دعوتِ اسلامی

کا پروگرام بناتے ہیں۔ انھوں نے مولانا مودودی کی کچھ تصانیف کا ترجمہ بھی مقامی زبان میں کیا ہے۔ تاجر طبقے میں بھی ان کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔

امریکہ

کئی برسوں سے مولانا کی تصانیف کے انگریزی تراجم امریکہ جا رہے ہیں فلاڈلفیا سے مسلمانوں کی ایک تنظیم مسلم لیگ مولانا مودودی کی تصانیف مسلسل منگوا رہی ہے اس کے علاوہ بھی کئی مقامات سے مولانا کی تصانیف منگائی جاتی رہتی ہیں اور جا بجا مولانا کے مشن کا تعارف ہو رہا ہے۔

انگلستان

چند ایک مقامات سے مولانا کی تصانیف کے آرڈر آتے رہتے ہیں خصوصاً وہاں کے طلباء میں اس کی بڑی مانگ ہے۔ مختلف دینی سوالات بھی پوچھے جاتے ہیں۔ وہاں کی زندگی میں مسلم طلباء کو جا کر جو مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کا شرعی حل بھی دریافت کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لندن اور چند دیگر مقامات سے بھی مولانا کی تصانیف کی مانگ آتی رہتی ہے۔

جرمنی

یہاں بھی مولانا کی دعوت اور مشن کے اثرات پہنچے ہوئے ہیں۔ جناب ایرک عبدالرحمٰن روسلر نائب صدر اسلامی کمیونٹی ہمبرگ نے مولانا سے رابطہ قائم کر کے ان کی تصانیف طلب کیں۔۔۔۔۔ اور اظہار کیا کہ "یہاں سخت انتشار ذہنی اور اخلاقی پستی کارفرما ہے اور ہماری قوم کو ایک ایسے تصورِ حیات کی ضرورت ہے۔ جو ان کی۔

- ذہنی پریشانی
- کامل مایوسی
- خوف زدگی

اور

- فکری انتشار

کو رفع کر سکے"۔ مولانا نے انہیں اپنی تصانیف کے انگریزی تراجم بھجوا دیئے۔

انہوں نے جواب میں لکھا۔

"آپ ایک بابرکت ملک میں بستے ہیں جو اسلام پر قائم ہے۔ ہمیں تو یہاں قرآن مجید بھی میسّر نہیں آتے۔ ہم یہاں (pioneers) کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور آپ کی طرف سے اخلاقی تائید اور دوستانہ تعلقات کے سخت محتاج ہیں اس سے ہمیں بڑی تقویت ہوگی اور ہمارے کام پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ اب تک آپ اور آپ کے احباب کے جو خطوط ہمیں آئے ہیں ان سے ہمیں بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اگر آپ یا آپ کے رفقاء میں سے کوئی صاحب جرمنی تشریف لائیں تو آپ اسے بالکل اپنا گھر پائیں گے اور یہاں کے دوستوں کو پوری طرح قابلِ اعتماد پائیں گے۔"

ان کی کوشش اور مدد سے بھی جرمنی میں مولینا مودودی کی دعوت اور مشن کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔

ان ممالک کے علاوہ ماریشش میں مولینا مودودی کے ایک رفیق کار بہت دنوں سے منتقل ہو کر چلے گئے اور وہاں تعلیمی اداروں اور مسلم عوام میں کام شروع کر دیا۔ ایک اخبار کی ادارت۔ ایک سکول کی ہیڈ ماسٹری۔ ایک مسجد کی خطابت اور درسِ قرآن وحدیث کے ذریعے وہ مولانا کے مشن کو ماریشش میں پھیلاتے رہے ہیں جس کے نتائج بہت تسلی بخش ثابت ہوئے

سیول کوریا کے نوجوانوں میں مولینا کی تصانیف جا رہی ہیں۔ برما۔ لاؤس۔ ویسٹ انڈیز۔ برٹش گی آنا۔ جنوبی امریکہ۔ پرٹوریا۔ جنوبی افریقہ کانو۔ نائیجیریا۔ مراکش۔ جوہنسبرگ میں بھی مولانا کی دعوت، بذریعہ اردو، عربی اور انگریزی تصانیف پہنچ رہی ہے۔

جنوبی افریقہ سے بھی مولانا کو تبلیغی دورے کے لیئے بار بار دعوت آچکی ہے اور مولانا اس کے لیئے تیار ہیں۔

پرٹیوریا کی اسلامک سوسائٹی نے بھی مولانا کی تصانیف کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت حاصل کرلی ہے۔

ماریشس کی حکومت نے بھی اپنے مدارس میں مولانا کی دعوت سے متعلق بعض کتب اپنے ہاں داخل نصاب کرلی ہیں۔

لاہور میں کلوکیم کے موقعہ پر بھی جہاں مولانا نے "اسلام میں اجتہاد کا مقام" کے موضوع پر مقالہ پڑھا، دور و نزدیک کے مسلم و غیر مسلم اہل علم سے مولانا کا براہِ راست تعارف ہوا جس سے بڑے اچھے اثرات مترتب ہوئے۔

اس کے علاوہ مسلم عرب ممالک میں بھی مولانا کی تصانیف بڑی کثرت سے پھیل رہی ہیں۔ گزشتہ دورے پر کویت کے مسلمانوں نے اسی مقصد کے لیئے پچاس ہزار روپے کا فنڈ جمع کیا۔ جسے توسیع و تعارف دعوت و نشر و اشاعت دینی کتب کیلئے وقف کر دیا گیا۔ مصر، عراق، شام، لبنان، سعودی عرب، شمالی افریقہ، ترکی، انڈونیشیا، ملایا میں بھی اردو، عربی، انگریزی کتب کثرت سے پہنچ رہی ہیں اور ان کے ترجمے مقامی اور یورپی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔

دیگر زبانوں میں تصانیف کے تراجم

اب تک اندازاً مختلف زبانوں میں مولانا مودودی کی دینی، علمی اور تحقیقی کتب کے تراجم ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک مختصر خاکہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ان کتب میں آن بدان اضافہ ہو رہا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار مولانا کے ۱۹۵۷ء کے ریکارڈ سے حاصل کیے جا سکے ہیں

انگریزی، ۴۳ مطبوعات کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

عربی، ۳۵ مطبوعات، بنگالی ۲۲ مطبوعات۔ سندھی، ۴۲ مطبوعات، پنجابی ۱۵ مطبوعات، پشتو، ۶ مطبوعات، ہندی ۱۵ مطبوعات، گجراتی ۱۸ مطبوعات، ملیالم ۱۱ مطبوعات، تامل ۱۶ مطبوعات، تلگو، ۳ مطبوعات۔ مراٹھی، ۹ مطبوعات، کنیڑی، ۲ مطبوعات ترکی، ۲ مطبوعات، فرانسیسی ۲ مطبوعات اور انڈونیشیائی ۳ مطبوعات کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا مودودی کی دعوت اور مشن ایک جہانی اور عالمگیر مشن ہے۔ ہر نظریۂ حیات کے لیئے کسی نہ کسی تجربہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ عملی نقشے سے دنیا کو بتا سکے کہ وہ اپنے اندر فلاحِ عالم کے لیئے کیا کچھ عملی خوبیاں رکھتا ہے۔ مولانا مودودی کے مشن اور دعوت کو اب تک کوئی تجربہ گاہ تو میسّر نہیں آئی لیکن جس انداز سے وہ دنیا کے مختلف مسلم اور غیر مسلم ممالک کے اندر نفوذ کر رہی ہے۔ اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کے حق میں عقلی فضا اور رائے عامہ تو ضرور ایسی پیدا ہو جائے گی کہ اگر اس نظریہ کو کوئی تجربہ گاہ میسّر آ گئی تو دنیا اسکی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھے گی اور دوسرے ظالمانہ نظریہ ہائے حیات کی کشمکش میں اسلام کی وہ تجربہ گاہ دنیا کے لیئے ایمان کا مرکز اور روشنی کا مینارہ ہوگی۔

(۹)

مولانا مودودی اور اربابِ اقتدار

ایک خطرناک آدمی

اربابِ اقتدار کی نظر میں مولانا مودودی ایک خطرناک آدمی ہیں خطرناک بھی ایسے کہ خطرناک لوگوں کی فہرست میں سرفہرست درج ہیں۔ ان کا علم وفضل مسلّم۔ ان کا تقوےٰ اور خدا ترسی تسلیم۔ ان کا استدلال لاجواب۔ ان کی حب الوطنی لاریب۔ ان کا فہمِ دین شک وشبہ سے بالا۔ ان کا مقصدِ زندگی اسلامی نظام حیات کا قیام۔ لیکن پھر بھی وہ ایک خطرناک آدمی ہیں۔ اربابِ اقتدار کا نکتۂ نظر یہی ہے۔ ان کی خطرناکی کے اسباب کیا ہیں یہ بات گذشتہ ۱۲-۱۳ سال کے عرصے میں مولانا پر مقدموں جیلوں اور سزاؤں کے پے در پے حملوں کے باوجود نہ اربابِ اقتدار کی طرف سے واضح کی گئی ہے اور نہ واضح ہوئی ہے۔ بس ایک گونگی لڑائی ہے۔ جو ان کے خلاف لڑی جا رہی ہے، یہ صورتِ حال ملک کے اجتماعی مفاد سے گہری دلچسپی رکھنے والے اہلِ دل حضرات کے لئے بڑی پریشانی اور فکرمندی کا باعث ہے۔ لوگ دعائیں کرتے ہیں کہ کاش اربابِ اقتدار مولانا کے علم وفضل اور علوم جدید وقدیم پر گہری نظر سے استفادہ کر سکیں، کاش مولانا کی بہترین علمی، تنظیمی، ادبی، فکری اور قائدانہ صلاحیتیں ملک وملت کی تعمیر میں بہتر طور پر کام آ سکیں اور یہ ملک جو بڑی پاکیزہ تمناؤں، بڑے اونچے اسلامی دعووں اور بڑی خونریز قربانیوں کے بعد وجود میں آیا ہے وہ دین اسلام کی اساس پر جدید

میں ایسی لیبارٹری بن سکے جہاں دور دور سے لوگ آکر اسلام کی برکات دیکھیں اور چشم سر سے انسانی مساوات، اخوت، عدل و رواداری کے نمونے دیکھ کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں۔ لیکن یہ تمنائیں گذشتہ برسوں سے دم سادھے لوگوں کے سینوں میں دفن پڑی ہیں اور ارباب اقتدار سخت ناراض ہیں کہ مولانا مودودی ایسی باتیں بھی کیوں زبان پر لاتے اور قلم سے تحریر کرتے ہیں۔ جو انہیں ناگوار ہوتی ہیں اور جن کا تعلق اس ملک میں دین کے احیاء سے ہوتا ہے۔

دو مدارس فکر

ہمارے ملک میں اس وقت دو طبقے کھلم کھلا علمی، فکری، معاشرتی اور سیاسی میدان میں متصادم ہیں۔ ایک مغرب سے مرعوب اور متاثر ہے اور دوسرا اسلام کو اپنی اصلی شکل میں لانا چاہتا ہے۔ مغرب پسند طبقہ بھی اکثر و بیشتر اسلام کا ہی نام لیتا رہتا ہے لیکن اس میں زمانے کی ضروریات کے مطابق ترمیم و تجدید و کمی و اضافہ کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔ اور بظاہر اس طبقہ کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ان ترمیمات کی ضرورت ان کے اندر مغربی تہذیب کے تقاضے پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی زندگیاں اور کارگذاریاں کچھ ایسی ہی گواہیاں گزشتہ برسوں سے عوام کے سامنے پیش کر رہی ہیں لیکن بہرحال نام وہ بھی اسلام کا ہی لیتے ہیں۔

پھر ان میں تصادم کیوں ہے؟ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک طبقہ اسلام کے بارے میں مخلص نہ ہو۔ دونوں کی منزلیں الگ الگ ہوں اور دونوں میں سے کوئی ایک فریق اسلام کا نعرہ محض سیاسی مقاصد کے لیے ہی کے طور پر لگا رہا ہو۔ اور اس نے اسلام کو بطور نظام حیات کے ترک کر دیا ہو۔

ہماری گزشتہ ۱۲۰۰ - ۱۴۰۰ سالہ تاریخ کا طویل عرصہ مغرب پسند طبقے کے بارے میں مسلسل یہی گواہی دیتا چلا آرہا ہے۔ مولانا مودودی کا بھی یہی خیال ہے انہوں نے ستمبر ۱۹۵۰ء کے ترجمان القرآن میں اس کی نشاندہی کی ہے۔

"دراصل اس ملک میں دو مستقل مدارس فکر پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے۔ ہر ایک کو بہت سے اخلاقی، ذہنی اور تمدنی اسباب نے پرورش کیا ہے ہر ایک کی جڑیں ہماری سوسائٹی میں دور دور تک پھیلی اور گہری جمی ہوئی ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ دوسرے کو پھونک مار کر اڑا دے۔

ایک مدرسۂ فکر وہ ہے جو مغرب کے سیاسی علمی اخلاقی اور معاشی غلبہ سے ہمارے اندر پیدا ہوا ہے۔ اس میں مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو عقیدہ و عمل دونوں میں اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور اس بات کو نہیں چھپاتے کہ انہیں اسلام کی پیروی منظور نہیں ہے۔ کچھ وہ ہیں جن کا انحراف تو قریب قریب اسی درجے کا ہے مگر سراسر منافقت اور مکاری کے ساتھ وہ اسلام کے ترجمان اور علمبردار بن رہے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اسلام کو بالکل تو چھوڑ دینا نہیں چاہتے۔ مگر پورے اور اصل اسلام کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ اپنے مذاق اور رجحان کے مطابق ایک نیا اسلام بنانا چاہتے ہیں جس میں اصلی اسلام کی صرف وہ چیزیں باقی رہ سکتی ہیں جو ان کو پسند ہوں۔ ان مختلف رجحانات کے لوگوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر معیارِ حق وہ افکار و اقدار و اطوار ہیں جو مغربی تعلیم و تہذیب کے زیرِ اثر انہوں نے اختیار کئے

ہیں۔ اور خدا و رسولؐ کی ہدایت ان کے لئے حجت نہیں ہے کہ جو کچھ اس سے ثابت ہو وہ اس کے آگے سر جھکا دیں۔ اس مدرسۂ فکر کے لوگ اگرچہ تھوڑے ہیں اور ہمارے عوام کے دل و دماغ ان کیساتھ نہیں ہیں۔ لیکن زمام کار اس وقت انہیں کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انگریزی اقتدار کے دور میں آگے بڑھنے کے جتنے مواقع بھی ملے زیادہ تر انہیں کو ملے اور چلتے وقت انگریز نے اپنی میراث بھی اپنے اسی خلف الصدق گروہ کو سونپی۔

دوسرا مدرسۂ فکر وہ ہے جو اسلام کی اندرونی قوتِ حیات کے نتیجہ میں ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اگرچہ مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں جن کے درمیان جزئیات و فروع اور مذاقِ طبیعت کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہیں۔ مگر قدرِ مشترک ان سب کے درمیان یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کو اپنے لئے نظامِ زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں اور تمام معاملاتِ زندگی میں اسی ہدایت کو حجت مانتے ہیں۔ جو خدا اور رسولؐ سے ثابت ہو۔ یہ مدرسۂ فکر انگریزی اقتدار کے پورے دور میں مغلوب و مقہور رہا ہے۔ نشوونما کے ذرائع سے محروم رہا۔ ہر شعبۂ زندگی میں زمامِ کار سے بے دخل رہا اور اب بھی کم و بیش اس کا یہی حال ہے۔ لیکن اسلام کے وہ تمام اخلاقی و روحانی، ذہنی و فکری اور تہذیبی و تمدنی اثرات جن کی بدولت پچھلی تیرہ صدیوں میں ہر قسم کے مخالف حالات میں اسلام زندہ رہا اس مدرسہ کی پشت پر موجود ہیں خود اس ملک کے اندر گزشتہ تین صدیوں سے تجدید و احیائے اسلام کی جو تحریکیں پے در پے اٹھتی رہی ہیں۔ وہ سب اپنے طاقتور اثرات کے ساتھ اس مدرسۂ فکر کی بنیاد مضبوط کر رہی ہیں۔ قوم کے متوسط اور اہلِ دماغ طبقے کی

اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ قوم کے عوام اپنی جہالت و بے شعوری کے باوجود اس کے نصب العین سے متفق اور اس کے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور اس پورے مدرسۂ فکر میں یہ جذبہ مشترک ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کی گاڑی اس رُخ پر نہ جائے جدھر اسلام سے انحراف اور اسلام میں تحریف کرنے والے لوگ اسے لے جانا چاہتے ہیں بلکہ اس کی سمت سفر اسلام کی طرف موڑ دی جائے۔"

تصادم

ان دو نمایاں طبقوں میں سے مولینا مودودی دوسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعلق ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے رہنما اور علمبردار ہیں۔ دوسری طرف ارباب اقتدار پہلے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور تعلق ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے داعی اور علمبردار بنے چلے آرہے ہیں۔ تصادم کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ یہ تصادم عمل کے میدان میں دونوں طبقوں کے ضمیر کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ قوت پاکر ظلم و زیادتی کرنا ہر بزدل، کم ظرف، اقتدار پرست، خدا ناشناس، انسان کا کام ہوتا ہے۔ وہ کسی شخص کو چاہے وہ حق پر بھی کیوں نہ ہو اپنے مقابل سربلند دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ جبر و استبداد کی طویل ترین انسانی تاریخ میں ایسے انسانوں کی بے شمار خون آلود مثالیں جا بجا پائی جاتی ہیں اس کے مقابلے میں ہر قسم کے جبر و ستم پر اُف نہ کرنا مردانگی سے سارے مظالم سہہ جانا اور اپنے نصب العین اور موقف کے لئے سر تک کٹا دینا حق پرست انسانوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے اور تاریخ کا دامن ایسی مثالوں سے بھی خالی نہیں ہے۔

دباؤ کے تین طریقے | عام سیاسی مخالفین کے ساتھ معاملہ کرنے میں

ارباب اقتدار عموماً تین طریقے اختیار کیا کرتے ہیں، جو جمہوری اقدار کو ذبح کرنے والے اور اخلاقی اصولوں کی پامالی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگرچہ کسی مسلم معاشرے میں ان طریقوں کا استعمال سخت غیر مناسب اور غیر مستحسن ہوتا ہے لیکن وہ ارباب اقتدار جنہیں ان روائتی قسم کی روایات کا احترام نہ ہو عموماً ان کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔

● جبر و تشدد، ظلم و زیادتی اور سیاسی دباؤ (Political Coercion) سے فریق مخالف کو پست ہمت کرنا، قید و بند، سیفٹی قوانین اور جان و مال اور آبرو پر حملے۔

● دھوکہ اور فریب سے بدنام کرنا۔ الزام تراشیاں اور سی۔ آئی۔ ڈی کے ذریعے کسی نہ کسی ہتھکنڈے میں لاکر درپے آزار ہونا۔

● لالچ اور طمع کے ہتھیار استعمال کرنا۔ ضمیروں کی خرید و فروخت اور عہدہ و منصب کے لالچ سے حریف کو رام کرنا۔

مولانا مودودی پر گذشتہ ۱۲، ۱۳ سال میں یہ تینوں طریقے آزمائے گئے ہیں۔ اور یہ مولانا مودودی کا کردار ہے کہ وہ ان تینوں آزمائشوں میں کامیاب ہو کر نکلے ہیں۔ میں مولانا مودودی کے کردار کے ان مختلف پہلوؤں کے مطالعہ اور خود ارباب اقتدار اور رائے عامہ کے استفادے اور انصاف کے لئے میں ان تینوں پہلوؤں پر پاکستان کی تاریخ حوادث کو سامنے رکھتے ہوئے روشنی ڈالوں گا۔

جبر و تشدد اور سیاسی ظلم و زیادتی

اگرچہ ایک جمہوری ملک میں سیاسی جبر و تشدد کا تصور کرنا مشکل ہے خصوصاً ایسا ایک جمہوری ملک جس کی جمہوری اقدار کا یہ عالم ہو کہ پوری دنیا کے سیاسی

نقشہ پر یہ ملک بغیر کسی فوجی جنگ کے خالص جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں افقِ عالم پر ابھرا ہو جسے مسلم رائے عامہ نے اپنے زور سے بنایا ہو۔ جس کی تحریک کو ایک زبردست جمہوری لیڈر نے چلایا ہو اور خالص جمہوری خطوط پر اس ساری تحریک کو اٹھایا بڑھایا۔ پھیلایا اور کامیابی کی منزل تک پہنچایا ہو۔ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہو کہ وہ خالص ایک پارلیمنٹری لیڈر تھا۔ جس کے قلم، زبان اور ٹائپ رائٹر نے ایک ملک کی سیاسی صورت گری کی ہو۔ جس کی تخلیق کے لیے خالص اور محض جمہوری طریقوں سے کام لیا گیا ہو۔ جس کے بعض علاقے ریفرنڈم جیسے خالص جمہوری طریقوں سے رائے عامہ کے قطعی فیصلہ کے نتیجے میں ملک کے اندر شامل ہوئے ہوں اور جس کی نظریاتی بنیادوں کے بارے میں قائد تحریک پاکستان نے خود صاف الفاظ میں یہ کہا ہو۔

" مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطۂ حیات کے مطابق اور خود اپنے تہذیبی ارتقاء روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکمرانی کرسکیں۔" (۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء)

جنہوں نے صاف صاف کہا ہو۔

" ہمارا مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات ہی وہ محرک قوتیں ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھاتی ہیں"

(۱۳ نومبر ۱۹۴۵ء)

جنہوں نے خود لیگ کا نقطۂ نظر اور مشن بیان کرتے ہوئے فرمایا ہو۔

" لیگ اس لیے اٹھی ہے کہ ہندوستان میں ایسی ریاستیں الگ بنائے

جہاں مسلمان عددی اکثریت میں ہوں تاکہ اسلامی قانون کے تحت ان پر حکمرانی کی جائے۔" (نومبر ۱۹۴۵ء)

ظاہر ہے کہ پاکستان کے بانی کے یہی وہ نظریات تھے جنہیں اپنے دل کی آواز اور اپنے عقیدہ و مسلک کی عین ترجمانی سمجھ کر ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم عوام اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ جن کے اس تقسیم کے نتیجے میں اس موجودہ اسلامی ملک میں آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا اس لئے کہ ہندوستان کے مسلم عوام اس کی تائید کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ اس خالص اسلامی نظریاتی جمہوری بنیادوں پر قائم ہونے والے ملک میں چاہئیے تو یہ تھا کہ یہاں کے اربابِ اقتدار ملک کی تقسیم کے فوراً بعد اپنے پہلے اجلاس میں ہی دستوری زبان سے اس ملک کے اسلامی نظریاتی جمہوری مملکت ہونے کا اعلان کر دیتے اور اس کی آئندہ کی قانونی اور دستوری صورت گری میں اسلام کو رہنما تسلیم کر کے کام شروع کر دیتے۔ چاہئیے تو یہ تھا کہ اگر اربابِ اقتدار نے اس میں تاخیر کی تھی تو یہاں کی سب سے بڑی جماعت جس نے اس ملک کی تشکیل و تخلیق میں مسلم عوام کی رہنمائی کی تھی اور ان کے سامنے خوشنما وعدوں کے پھول بکھیرے تھے۔ خود اس مطالبہ کو لے کر اٹھ کھڑی ہوتی کہ یہاں جلد از جلد اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ کے لئے دستوری اقدامات کئے جائیں لیکن جب یہ سب کچھ نہ ہوا اربابِ اقتدار نے نہ صرف منہ میں گھونگھنیاں ڈال لیں بلکہ پاکستان کو اپنے لئے خوانِ یغما بھی سمجھ لیا اور دوسری طرف مسلم عوام کی اس سب سے بڑی رہنما جماعت نے بھی جو اخلاقی، سیاسی اور دستوری لحاظ سے مسلم عوام کے سامنے اپنے دستور

منشور اور مواعید کے لئے بھی ذمہ دار تھی۔ چپ سادھ لی اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ارباب اقتدار کے ارادے اب کچھ اور ہیں۔ بلکہ بعض حضرات نے تو صاف صاف اپنی مجالس میں پاکستان کے ایک سکیولر ریاست ہونے کا اظہار بھی کرنا شروع کر دیا۔ تو وہ کام جو دستوری اور سیاسی طور پر ارباب اقتدار کے کرنے کا تھا اور وہ کام جو اخلاقی طور پر مسلم لیگ کے کرنے کا تھا یعنی مطالبہ نظامِ اسلامی اور پاکستان میں اسلامی اقدار پر مشتمل دستور کا نفاذ۔ وہ کام بالآخر مجبور ہو کر مولانا مودودی کو اٹھانا پڑا جو بجائے یہ کام خود اپنے ہونے کے لئے عوام کے ضمیروں میں ایک گہری پکار رکھتا تھا اور اس کا سلسلہ خود تحریک پاکستان کے عظیم نعرے۔

"پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اس لئے اسلامی دستور اور اسلامی حکومت کے مطالبے کو عوام نے جلد ہی اٹھا لیا۔ اٹھا کر اپنا لیا اور اپنا کر اس کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ پاکستان بننے کے بعد اتنی بڑی جمہوری جدوجہد کبھی نہ ہوئی تھی۔ مولانا مودودی نے خود اپنی ایک کراچی کی تقریر میں مطالبہ نظامِ اسلامی اٹھاتے ہوئے کہا کہ اگر اس مطالبے کو مسلم لیگ اپنائے تو پھر ان میں اور مسلم لیگ میں کوئی غیریت نہیں رہ جاتی۔

اربابِ اقتدار کی اس موقع پر ہی آنکھیں کھل جانی چاہئیں تھیں۔ اسی وقت اس آواز کو وقت کا تقاضا اور عوام کا مطالبہ سمجھ کر اس پر ہمدردانہ غور کر لینا چاہیئے تھا لیکن اب انگریز کی کرسیاں اپنوں کے قبضے میں تھیں اور بقول مولانا مودودی۔

"غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی وہ مسلم حکومت ان پر سزا پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر

جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمتہ اللہ علیہ ہی ہوں گے"

کے مصداق ہمارے ارباب اقتدار اپنے ذوق، اپنے ذہن، اپنے رجحان اور اپنے پرسٹیج Prestige کو درمیان میں لاکر بدقسمتی سے، ہماری قومی ملکی اور سیاسی بدقسمتی سے بالکل الٹے رُخ پر ہی چل پڑے اور ایسے اُلٹے رخ پر چلے کہ مدینے کا مسافر نہ مدینے پہنچا اور نہ ترکستان بلکہ گزشتہ ۱۳ سال سے عول بیابانی کے چکر میں محو سرگردانی ہے

وہ اُلٹا رُخ یہ تھا کہ انہوں نے اسلامی نظام کا مطالبہ اٹھانے والوں پر جبرو تشدد کی تلوار کھینچ لی۔ یہ ایسی ہی بات تھی جیسے کوئی شخص کسی کو اس کا وعدہ یاد دلائے تو وہ الٹا مار پیٹ پر آمادہ ہو جائے۔ کوئی ووٹر کسی ممبر کو اس کے وعدے یاد دلائے تو وہ ممبر پولیس کے ساتھ مل کر اسی ووٹر کو تھانے اور جیل کی ہوا کھلانا شروع کر دے یہ بات ایسی ہی تھی کہ کچھ لوگ بھارت میں اکھنڈ بھارت کی تحریک چلائیں تو انہیں جیل میں ڈالا جائے۔ یا مسجد میں نماز کے اہتمام پر زور دیا جائے تو متولی لٹھ لے کر نمازیوں کے پیچھے پڑ جائیں۔ بہرحال یہ ایک حیرت انگیز، شرانگیز پریشان کن اور رسوا کن بات تھی کہ ارباب اقتدار انہیں لوگوں کے پیچھے جبر و تشدد کے ہتھیار سنبھال کر پڑ گئے جنہوں نے ان کو محض ان کے وعدے اور مملکت کے دستوری تقاضے پورے کرنے کی طرف جمہوری توجہ دلائی تھی۔

نظام اسلامی کا جمہوری مطالبہ ابھی ۷، ۸ ماہ ہی چلا تھا کہ ملک کے طول و عرض میں ہر طرف سے اس کی تائید میں آوازا ٹھنے لگی۔ یہ تو دراصل مسلم لیگ کا ہی چھوڑا ہوا کام تھا جسے مولانا مودودی نے اٹھا لیا تھا۔ اس مطالبے پر عوام متحد، اخبارات متفق، علمائے حق کی ایک بڑی تعداد یک زبان اور قبل تقسیم پاکستان کے اسلامی

مماثلت ہونے کے دعووں کے بیشمار گواہ موجود تھے ——— لیکن مولانا مودودی کو مطالبۂ نظامِ اسلامی اٹھانے پر اکتوبر ۱۹۴۸ء میں گرفتار کر لیا گیا، اور وہ بھی سیفٹی ایکٹ کے تحت مطالبۂ نظامِ اسلامی کے سوا ان کا کوئی جرم سامنے نہ آسکا اس بدنام زمانہ ایکٹ کے تحت:

- پہلے وہ ایک ماہ کے لئے جیل بھیجے گئے
- پھر چھ ماہ کا اضافہ ہوا
- پھر چھ ماہ کا اضافہ ہوا
- پھر چھ ماہ کا اضافہ ہوا

کیوں ——— اس کیوں کا جواب آج تک نہیں دیا گیا۔ مولانا کے ساتھ جیل میں اخلاقی قیدیوں کا سا طرزِ عمل روا رکھا گیا جبکہ مثالیں موجود ہیں کہ اس ملک میں زنا کے مجرم، معاف قاتلوں کو اے کلاس میں رکھا جاتا ہے۔ تنگ نظری اور تنگ ظرفی کی یہ ایک نہایت مکروہ مثال تھی۔

مولانا مودودی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی ڈاک پر سنسر بٹھا دیا گیا۔

ان کی نقل و حرکت پر خفیہ پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا اور سی، آئی ڈی کے اہم ترین فرائض میں مولانا مودودی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی نگرانی کرنا بھی قرار پایا۔

مولانا مودودی کی جماعت کو سیاسی جماعت قرار دے دیا گیا اور اس پر وہ پابندیاں لگائی گئیں جو انگریزوں نے بھی اپنے عہد میں کبھی مسلم لیگ اور کانگرس پر نہ لگائی تھیں حالانکہ مولانا کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کی جماعت نہ غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے سیاسی جماعت ہے اور نہ غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے

مذہبی جماعت ہے بلکہ وہ تو ایک اسلامی جماعت ہے جو مسلمانوں کو ان کے معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی اخلاقی اور سیاسی ہر دائرے میں خالص مسلمان بنانا اور دیکھنا چاہتی ہے۔

پھر الزامات کا ایک طویل سلسلہ اخبارات، سیاسی کارکنوں، سرکاری اداروں، ریڈیو اور علماء سوء کے ایک خاص طبقے کی طرف سے مولانا کے خلاف چلایا گیا۔ اور جابجا اس کی ہمت افزائی کی گئی۔

● کبھی کہا گیا۔ یہ جہادِ کشمیر کے خلاف ہیں۔ اور یہ بات وہ لوگ کہتے رہے ہیں جنہوں نے اس وقت یہ جہاد بند کیا جب کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ پھر اس مسئلے کو خود بگاڑا اور آج تک بگاڑے چلے جا رہے ہیں ہمارے اربابِ اقتدار کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا۔ کہ انہوں نے مولانا مودودی کو بدنام کرنے کے لئے خود جہادِ کشمیر تک کو نقصان پہنچانا پسند کر لیا

● کبھی کہا گیا کہ: مولانا مودودی لوگوں کو فوجی بھرتی سے روکتے ہیں حالانکہ یہ ایک سفید جھوٹ تھا۔

● کبھی کہا گیا کہ: مولانا مودودی پاکستان کے حلفِ وفاداری سے لوگوں کو باز رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک مکروہ الزام تھا۔ اور ایک ذلیل پروپیگنڈے سے زائد کوئی چیز نہ تھی۔

● کبھی کسی غیر مسلم کے اسمبلی میں مولانا مودودی کی کسی کتاب کا حوالہ دیکھ کر اسلام کا کوئی حکم بتانے پر فخریہ کہا گیا کہ جانتے ہو کہ وہ شخص کہاں ہے وہ جیل میں ہے۔ دراصل یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ جو کوئی بھی یہاں اسلام

کے نظریات کی ترجمانی کرے گا اسے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

• کبھی کہا گیا کہ مولانا مودودی انتشار پھیلاتے ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اسلامی نظام کا مطالبہ کیوں اٹھا رکھا ہے۔

• کبھی کہا گیا کہ مولانا مودودی امیر المومنین بننا چاہتے ہیں۔ پاکستان تو ابھی بچہ ہے یعنی اس جمہوری ملک میں امیر المومنین بننا بھی صرف خاص لوگوں کا ہی پیدائشی حق ہے دوسروں کے لئے یہ جرم قابل سزا ہے۔ اور چونکہ پاکستان ابھی بچہ ہے اس لئے یہاں اسلام کا نام نہ لینا چاہیئے۔ غالباً ان کے نزدیک اسلام ایک زبردست تخریبی قوت ہے جو کسی ملک کی ابتداء میں تو اسے بالکل ہی برباد کر دے گی حالانکہ مسلمان تو بچے کے کان میں پیدا ہوتے ہی اسلام کا کلمۂ حق سب سے پہلے پھونکتے ہیں۔ تبھی وہ مسلمان بن کر جوان ہوتا ہے۔

• ایک صوبے کے وزیر اعلےٰ صاحب نے تو اپنی ایک پرائیویٹ مجلس میں یہ تک فرما دیا کہ میرا بس چلے تو میں مولانا مودودی کو گولی سے اڑا دوں۔ یہ الگ بات ہے کہ قدرت نے ان کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ کیا۔

• کبھی مولانا کے ہم خیال اخبارات کو سیفٹی ایکٹ کے تحت، بار بار بند کیا گیا کہ ان کی فکر جو اسلامی نظام حیات کی دعوت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عوام میں پھیل نہ سکے۔ اس کے مقابلے میں اشتراکی ذہن کے اخبارات کی نہ صرف سرکاری اشتہارات کے ذریعہ ہمت افزائی کی جاتی رہی بلکہ سرکاری دفاتر اور جیلوں تک ان کی سرکاری خریداری جاری رکھی گئی۔

مولانا کی اٹھائی ہوئی خالص جمہوری اسلامی جماعت کو سیاسی جماعت قرار

دے کر اس پر السی کڑی نگرانی رکھی گئی کہ سرکاری ملازمین میں اشتراکی کارکن چاہے گھسے رہیں، لیکن مولانا مودودی سے ہم خیال کوئی شخص رہنے نہ پائے۔ حد یہ ہے کہ بیسیوں افراد کو چن چن کر ان کی طویل سرکاری خدمات کے باوجود ملازمتوں سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ باہر جا کر ان میں سے ہر ہر شخص کو ان کے مالک نے پہلے سے کہیں بہتر ذرائع آمدنی فراہم کر دیئے۔ حالانکہ یہ بات دعوے بلکہ چیلنج کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور اس پر ان نکالے جانے والوں کے ساتھی اور افسران بھی گواہ ہیں کہ وہ لوگ اپنے کام میں نہایت ہوشیار، دیانت دار اور محنتی تھے اور اپنے اپنے محکمے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کے لئے رکاوٹ کا باعث تھے۔

سرکاری ملازمین اور فوج کو خصوصی طور پر مولانا مودودی کی کتب پڑھنے سے نہ صرف باز رکھا گیا بلکہ اس پر کڑی نگرانی رکھی گئی کہ جو کوئی ایسا نظر آئے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ حالانکہ یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کی تمام تر تصانیف نہ صرف اسلامی اخلاق پیدا کرتی ہیں بلکہ عام معلومات کا ایک ایسا بیش بہا خزانہ دیتی ہیں جو مطالعہ کرنے والے کے علم میں قیمتی اضافہ کرتا اور اسے اپنے کام کے لئے اہل تر بناتا ہے۔

بار بار کے سرکلروں کے ذریعے ہر ہر محکمہ میں مولانا مودودی کے بارے میں سخت درجے کا خوف و ہراس پھیلایا گیا جیسے کسی خونی قاتل مفرور مجرم سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس معاملے میں انسانی نفسیات نے الٹا کام کیا۔

• حد یہ ہے کہ مولینا کی تصانیف پر نگرانی کے ذریعے نہ صرف ان کو عام لوگوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ عوام کے لئے تقریباً ممنوعہ لٹریچر بنا دیا گیا بلکہ "حقیقت جہاد" اور "جماعت اسلامی کی دعوت" جیسے دو پمفلٹوں کو تو ایک صوبائی حکومت نے ضبط بھی کر لیا اور یہ ان لوگوں نے کیا جن میں سے ہر ہر شخص بعد میں سخت بدکردار اور پبلک زندگی کیلئے نااہل ثابت ہوا۔

• سنسر شپ بٹھا کر لوگوں کی پرائیویٹ ڈاک کو چھلنیوں میں چھانا گیا جیسے وہ لوگ کوئی ایٹم بم کے نسخے اپنے خطوط میں تحریر کرتے تھے یا بیرونی حملہ آوروں کو اپنے دو آنے کے لفافوں اور تین پیسے کے کارڈوں میں حملے کی دعوت دیتے تھے۔

• سی۔ آئی۔ ڈی جسے انگریز اپنے وقت میں بدترین مقاصد کے لئے استعمال کیا کرتا تھا، انہیں مقاصد کے لئے اسے بار بار استعمال کیا گیا۔ اور اس کی بجائے کہ وہ مجرموں چوروں، رشوت خوروں، بلیک مارکیٹیوں اور عادی مجرموں کا سراغ لگاتے وہ اپنا سارا زور انہیں لوگوں پر صرف کرنے لگی جو عام جمہوری ذرائع سے ملک کو اس کے نصب العین کے حصول کے لئے تیار کر رہے تھے۔ وہ سی آئی ڈی جس کا بنیادی ذہن ہی یوں بنایا جاتا ہے کہ وہ حکومت کو صحیح معلومات نہ فراہم کرے بلکہ ایسی معلومات بنا کر فراہم کرے جو ارباب اقتدار کی خواہشات کے مطابق ہوں تاکہ وہ اپنے مخصوصین کے خلاف کوئی موثر کارروائی کر سکیں۔ سی آئی ڈی کی غلط رپورٹوں کی بہت سی مثالیں خود پنجاب کے فسادات کی عدالتی تحقیقات کی رپورٹ میں ملتی ہیں جن کی چند مثالیں یہاں بیان کرنا میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ حکومت اس محکمے کو کسی مفید مصرف پر لگائے اور اس کے لئے انگریز کی مرتب کی ہوئی پالیسی سے ہٹ کر کوئی نئی پالیسی مرتب کرے۔

۱۔ سی۔ آئی ڈی نے ہوم سیکرٹری پنجاب کو یہ رپورٹ دی کہ جماعت اسلامی نے مسٹر ظفر اللہ خان کی علیحدگی کا مطالبہ اپنے ۸ نکاتی دستوری مطالبے میں شامل کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ خالص جھوٹ تھا۔ (منیر رپورٹ ۹۰ا سے ۱۴۱)

۲۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے رپورٹ دی کہ جماعت اسلامی اور دوسری پارٹیاں احرار کی مقبولیت دیکھ کر احمدیوں کی مذمت میں احرار کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں۔ حالانکہ یہ خالص جھوٹ تھا۔ اور دوسروں کی نیت پر ایک گھٹیا حملہ۔

۳۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے رپورٹ دی کہ جو گروہ ڈائرکٹ ایکشن کا سرگرم حامی ہے اس میں جماعت اسلامی کے ملک نصر اللہ خان عزیز بھی ہیں۔ حالانکہ جو واقعی حامی تھے ان کو بھی ملک صاحب نے سمجھا سمجھا کر رائے بدلنے پر وقتی طور پر آمادہ کر لیا تھا

۴۔ سی آئی ڈی نے رپورٹ دی کہ گوجرانوالہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں میاں طفیل محمد جماعت اسلامی نے تقریر کی حالانکہ وہ اس میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے۔

۵۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے رپورٹ دی کہ راولپنڈی گورنمنٹ کالج کے طالبعلم مسعود ملک کمیونسٹ ہیں۔ حالانکہ وہ کالج میں کمیونسٹوں کے اثرات کے خلاف شدت سے ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔

۶۔ ایک سی۔ آئی ڈی رپورٹر سے مجھے شخصی واقفیت تھی۔ وہ جلسوں میں خود کم ہی شریک ہوتے تھے اور جو لوگ شریک ہو کر واپس آتے ان سے پوچھ پوچھ کر ہی کوائف کی رپورٹ سرکار کو دے دیا کرتے۔

۷۔ ایک صوبائی سی۔ آئی ڈی کے رکن نے خود بتایا کہ لائلپور شہر کے ایک آدمی

کے خلاف وہاں کی مقامی سی۔ آئی ڈی نے اتنی رپورٹیں دیں کہ ہمارا تصور اس شخص کے بارے میں انتہائی خطرناک اور دہشت خیز بن گیا تھا لیکن جب میں خود ایک بار اچانک اس شخص سے جا کر ملا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک انتہائی شریف اور خاموش شہری تھا اور بس، سی آئی ڈی کے کوئی صاحب ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے۔

● سی۔ آئی۔ ڈی کی غلط اطلاعات کی مثالوں کی اتنی کثرت ہے کہ اس پر علیحدہ ایک مضمون مرتب ہو سکتا ہے لیکن انہیں لوگوں کی رپورٹوں پر اربابِ اقتدار لوگوں کی آزادی اور قید و بند کے فیصلے کرتے رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز انکشاف اور کیا ہو سکتا ہے جو اربابِ اقتدار کے قائم کردہ فاضل ججوں کی مرتب کردہ طویل رپورٹ میں صفحہ ۱۴۸ پر کیا گیا ہے کہ "جماعت اسلامی اور مولینا ابوالاعلیٰ مودودی ہنوز بھی اسلامی ریاست کے تصور کے مخالف تھے"۔

● ظلم و زیادتی کی حد یہ ہے کہ مرحوم قائدِ ملّت لیاقت علی خان کے قتل کی انکوائری رپورٹ شائع ہوئی تو کمیشن نے اس بات کا اظہار نہایت افسوس سے اپنی رپورٹ میں کیا کہ یہ بات بار بار اس کے کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسٹر لیاقت علی خان کے قتل کا باعث مذہبی جنون تھا جس جنون کے ساتھ گویا مولینا مودودی کو بھی بہت قریب کی نسبت ہے حالانکہ یہ بات اب رائے عامہ کے کس گوشے سے پوشیدہ ہے کہ اس کا باعث کون تھا اور اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔

● اس کے علاوہ الزام لگایا گیا کہ یہ ہندوستان کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں بلکہ ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے کے منی آرڈروں کی رسیدیں دیکھنے کی بعض حضرات

کرام نے گواہیاں تک دے ڈالیں اور دنیا بھر کو اپنی حماقت پر گواہ بنا لیا۔

● دوبارہ ۱۹۵۳ء میں مولانا مودودی کو بے بنیاد وجوہ پر گرفتار کر لیا گیا۔ مارشل لا کے تحت اس بات پر مقدمہ چلا کر کہ آپ نے قادیانیوں کے خلاف ایک پمفلٹ کیوں لکھا پھانسی کی سزا سنا دی گئی جسے عمر قید میں بدلا گیا اور پھر انتہائی قانونی مجبوری کے تحت ۲ سال ۹ ماہ قید کے بعد رہا کرنا پڑا۔ اس سزائے موت عمر قید اور طویل قید کا بھی آج تک کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکا۔

ان جھگڑوں اور مظالم کے مقابلے میں مولانا کا طرزِ عمل ہمیشہ یہ رہا کہ جب انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی تو پھانسی پانے والے قیدیوں کے لباس میں کھڑے ہوئے اپنے بیٹے کو سلاخوں کے پیچھے سے مولانا نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا ذرا مت گھبرانا۔ اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا اور اگر اس کا ہی حکم ابھی نہیں تو پھر چاہے یہ الٹے لٹک جائیں لیکن مجھ کو نہیں لٹکا سکتے۔"

مولانا سے لوگوں نے بار بار اپیل کرنے کے لئے کہا بلکہ حکومت کا منشا بھی اس بارے میں متعدد ذرائع سے ظاہر ہوا۔ حد یہ ہے کہ اس وقت کے گورنر جنرل صاحب بہادر نے بھی شاہ سعود کے ایک استفسار کے جواب میں کہا کہ اگر مولانا معافی مانگ لیں تو انہیں رہا کیا جا سکتا ہے۔ اس سارے داخلی اور خارجی دباؤ کے جواب میں مولانا نے اصرار کرنے والوں سے صاف کہہ دیا۔

" بھئی میرا مسلک آپ کو معلوم ہے۔ میرے نزدیک ان لوگوں سے جو میرا

جرم خوب جانتے ہیں معافی کا طلب گار بننے سے زیادہ قابلِ برداشت ہے کہ آدمی پھانسی پر لٹک جائے۔"

دھوکا، فریب اور الزام تراشیاں

اس معاملے میں بھی اربابِ اقتدار نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جس کے چند مواقع بیان کیے جاتے ہیں۔

● جہادِ کشمیر کے بارے میں حکومت کا طرزِ عمل دو رنگی پر مبنی تھا۔ ظاہری معاہدے اور داخلی لڑائی۔ مولینا کی ذاتی رائے تھی کہ حکومت کو کھل کر جہاد کرنا چاہیے۔ معاہدات ترک کر کے اس مسئلہ کو جہاد کے ذریعے حل کر لینا چاہیے۔ اس لئے کہ یہی موقع اس کے لئے موزوں ترین تھا۔ مولینا حکومت کے ذمہ دار لوگوں کو یہ رائے بتا بھی چکے تھے۔ اربابِ اقتدار نے ایک شخص کو بھیجا کہ وہ مولینا سے جہادِ کشمیر کے بارے میں ان کی رائے پوچھے۔ بار بار اصرار کے بعد اس نے رائے معلوم کی۔ اور پھر اسے توڑ مروڑ کر پریس میں یہ بنا کر دیا کہ مولینا جہادِ کشمیر کے مخالف ہیں۔ حالانکہ حکومت کا بھی کھلا ہوا موقف یہی تھا کہ وہ اس جہاد سے دست بردار تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سرکاری آدمی ایک سلسلے کا آفیسر تھا۔ اور اس کا مقصد مولینا کو بدنام کرنے کی مہم چلانا تھا۔ یہ گندگی مدت تک اچھلتی رہی اور بڑی مشکلات سے جا کر صاف ہوئی۔

● مولینا اور ان کے ہم خیال لوگ، قادیانی مسئلے کو دستوری طریق سے حل کرنے کے حامی تھے۔ پنجاب کے فسادات کی عدالتی تحقیقاتی رپورٹ خود بتاتی ہے کہ اس تحریک کو چلانے اور پھیلانے میں خود صوبائی حکومت کا ہاتھ تھا

اور اس کے لئے اخبارات اور مقررین کو رقوم تک دی گئیں اور رائے عامہ کو اتنا بھڑکا دیا گیا کہ اگر مولانا مودودی اس طوفانی تحریک سے قطعی علیحدہ رہیں اور خاموشی سے گھر بیٹھ جائیں تو ہمیشہ کے لئے اپنے مشن اور دعوت کی بساط عوامی میدان سے سمیٹ کر لے جائیں اور اگر اس کا ساتھ دیں تو حکومت کی گولیوں کا سب سے پہلا نشانہ بن کر ارباب اقتدار کی قلبی تمنائیں پوری کر جائیں۔ اس کے باوجود مولانا نے درمیانی راستہ اختیار کیا اور عوام میں شعور دلانے کی مہم جاری رکھی لیکن پھر بھی نہ صرف ان کو پکڑ کر ۷۲ گھنٹے تک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ اور پھر سزائے موت تک سنائی گئی۔ بلکہ ان کے بہت سے زائد ساتھی پکڑے گئے اور ان کی جماعت کے بیت المال پر غاصبانہ قبضہ کر کے اسے بلا ڈکار ہضم کر لیا گیا۔

اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جن کے ذریعے ارباب اقتدار نے مولانا کو دھوکے اور فریب سے پھنسانے اور مبتلا کرنے کی بار بار ناکام کوششیں کیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ کے فضل نے ہمیشہ مولانا کی حفاظت کی۔

عہدہ و منصب کا لالچ

پاکستان میں جہاں صوبوں میں ۲۹ بار وزارتیں بنیں اور ٹوٹیں اور مرکز میں جہاں چند سال میں ۷ بار کابینہ کی بار بار تشکیل ہوئی اور اقتدار و عہدہ و منصب کی بہتی گنگا میں ٹیکسی ڈرائیوروں اور دفتروں کے منشیوں تک نے ہاتھ ہی نہیں دھوئے بلکہ بار بار ڈبکیاں لگائیں وہاں ایک ایسے شخص کے لئے اگر وہ عہدہ و منصب کا حریص ہوتا۔ ان کا حصول کیا مشکل تھا جو ملک میں ملک گیر اثر کا مالک اور ایک منظم جماعت کا لیڈر اور اہل

دماغ طبقہ میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن بالآخر ایبڈو ٹریبونل کے فیصلوں نے یہ بات قطعی ثابت کردی کہ مولینا کا دامن عہدہ و منصب کے لالچ سے ہمیشہ اسی طرح پاک رہا جس طرح پہاڑ کی برف گرد سے پاک ہوتی ہے۔

مولینا مودودی کا کردار ان تینوں آزمائشوں میں سے کندن کی طرح کھرا ہو کر نکل چکا ہے۔ جبر و تشدد اور ظلم و زیادتی کے مقابلے میں وہ پہاڑ کی مانند جمے رہے اور ثابت کر دیا کہ اس آتشِ نمرود میں بھی وہ ابراہیمی شان رکھتے ہیں۔ مکر و فریب اور سیاسی دھوکا بازی اور عہدہ و منصب کے لالچ کے مقابلے میں انہوں نے جس اعتدال اور ذہانت اور استغنیٰ کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ مرغ بلند آشیاں کسی دانے کے پیچھے دام میں آنے والا نہیں اور اس کا کردار ظلم، فریب اور لالچ سے قطعی غیر متاثر ہے۔ اس تجربے کے بعد جو گذشتہ ۱۲، ۱۳ سال کی وسیع مدت پر پھیلا ہوا ہے ضرورت تھی کہ اربابِ اقتدار مولینا مودودی کے بارے میں اپنی پالیسی اور نکتۂ نظر پر نظر ثانی کرتے لیکن اس کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے اور اب تک وہی پرانی لکیر پیٹی جارہی ہے۔

مولینا مودودی ایک نہایت باوقار دعوت کے داعی ہیں۔ اور وہ دعوت دے کا پورا دین اسلام ہے جس سے بڑی باوقار شے اس زمین پر اور کوئی نہیں ہے وہ مستغنی دل و دماغ کے مالک ہیں انہیں اپنے لئے کوئی گدی یا جائداد یا عیش و عشرت کے محلات تعمیر نہیں کرنا ہیں وہ جو بات کہتے ہیں وہ سب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ پھر وہ کیوں اربابِ اقتدار کے آستانوں پر حاضریاں دیں، ان کے سامنے کورنش بجالائیں، ان کی ہاں میں ہاں غلط سلط ملائیں اور ضمیر فروشی

کریں۔ کیا اس قسم کے آدمی نے تاریخ میں اس سے پہلے کبھی یہ کام کیا ہے؟

ایک تاریخی کردار

مولانا مودودی کے ساتھ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے ارباب اقتدار کو جان لینا چاہیئے کہ مولانا کس نوعیت کے انسان ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ ملوکیت میں اسلام کو مظلوم و مقہور دیکھ کر تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ کردار بار بار ابھرتا رہا ہے۔ اور ابھر ابھر کر ہر قسم کے ظلم و جور اور مصائب و مشکلات کے علی الرغم بڑے بڑے جابر سلاطین کے سامنے حق گوئی، حق پرستی اور حق پناہی کا فرض انجام دیتا رہا ہے۔ اس کردار کا انداز ہر دور میں یکساں رہا ہے۔ نہ وہ کبھی خدا کے سوا کسی سے ڈرا ہے نہ کتاب و سنت کے سوا اس نے کسی دوسرے کی اتھارٹی کو تسلیم کیا ہے۔ نہ دینوی فوائد کا کبھی لالچ کیا ہے نہ دھمکی سے مرعوب ہوا ہے نہ قوت کے سامنے جھکا ہے نہ چالبازوں کے مکر و فریب کے جال میں پھنسا ہے۔ اور نہ اپنا فرض حق پرستی بجالانے میں کبھی کوتاہی کی ہے۔

خلافت اسلامی اپنے سارے لوازم کے ساتھ موجود تھی۔ لیکن ملوکیت کی داغ بیل ڈالنے۔ کے لئے عوامی نمائندگی کی بجائے وراثت کا اصول اسلام کے نظام سیاسی میں یزید کے ساتھ داخل ہوا تو یہ کردار امام حسینؓ کی شکل میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس دستوری انحراف پر اس نے تن من دھن کی بازی لگا دی اور ہر قسم کے ظلم و تشدد سے بے نیاز ہو کر جان پر کھیل گیا۔

امام مالکؒ کی شکل میں اٹھا تو وقت کے جابر سلطان منصور عباسی کے جاہ و جلال سے بے نیاز ہو کر معاملہ طلاق جبری کے عدم صحت کا فتوٰے دیا۔

عالم اس وقت جب مشکیں اس زور سے کسی گئی تھیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گئے اور کوڑوں کی ضربیں جسم پر پڑ رہی تھیں۔ امام دار الہجرۃ کی زبان حق پرست باآواز بلند کہہ رہی تھی "جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں۔ اور اس مسئلے کا اعلان کرتا ہوں جس کے اعلان سے مجھے جبراً روکا جا رہا ہے کہ جبری طلاق درست نہیں ہے۔" انہیں خون آلود کپڑوں میں نمازِ عشق ادا کی اور کون نہیں جانتا کہ ان باتوں سے اس کی عظمت کا سکّہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے قلوب اور تاریخ اسلام کے صفحات پر ثبت ہو گیا۔

سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق بیان کرنے کو علمی طور پر جہاد اکبر تو سب جانتے ہیں لیکن اس کی لذّت سے وہی آشنا ہوتا ہے جو یہ حق گوئی کرتا اور اس کی سزا چکھتا ہے۔ یہ جو فرمایا گیا کہ "ظلم و مصائب کے بڑے سخت دن آنے والے ہیں اس وقت حق کی راہ میں صبر کرنا ایسا سخت ہوگا جیسے انگاروں کو مٹھی میں تھام لینا"

— تو یہ بات سب اہل علم جانتے ہیں لیکن ان انگاروں کو مٹھی میں تھامنے کے لئے ہر کوئی آگے نہیں بڑھتا لیکن جو کوئی بھی آگے بڑھتا ہے وہ اپنے مالک کے ساتھ نقد جان کا سودا کر کے حق الیقین کے ساتھ آگے آتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اگر وقت کے اربابِ اقتدار وہی معاملہ روا رکھیں جو عام مجرموں کے ساتھ رکھا جاتا ہے تو اس سے بڑی ان کی بدقسمتی اور بدبختی کیا ہو سکتی ہے۔

مامون اور معتصم جیسی شان و شوکت کے بادشاہوں نے جب ایک مردِ خدا سے حق کے خلاف مطالبہ کیا تو اس نے ان کے جبر و ستم کے باوجود سر جھکانے

سے صاف انکار کر دیا۔ امام احمد بن حنبل کو چار چار بوجھل بیڑیاں ڈالی گئیں اور عین رمضان المبارک کے عشرے میں دھوپ میں بٹھا کر کوڑے مارے گئے لیکن انہوں نے ہر ضرب پر یہی جواب دیا کہ :-

"اللہ کی کتاب میں سے کچھ دکھلا دو یا اس کے رسولؐ کا کوئی قول پیش کرو تو میں اقرار کر لیتا ہوں۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا .... جو تم پیش کرتے ہو میں نہیں جانتا کہ یہ کیا بلا ہے۔ اس کائنات ہستی میں میرے سر کو جھکانے والی دو ہی چیزیں ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت اس کے سوا نہ میرے لئے کوئی دلیل ہے نہ علم"

— کسی نے پوچھا کہ "جب تلوار کے نیچے کھڑے کر دیئے گئے تب تو مان گئے" جواب دیا کہ "نہیں" لیکن ان کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ شاہی کوتوال کہتا تھا :-

"میں نے کبھی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمدؒ بن حنبل سے بڑھ کر بارعب نہ پایا۔ ہم عمالِ حکومت تو ان کی نظروں میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے"

منصور عباسی جیسے باجبروت بادشاہ کو امام ابو حنیفہؒ نے شاہی عہدۂ قضاء سے انکار کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا :-

"اگر کوئی مقدمہ آپ پر دائر ہو اور آپ مجھ سے یہ چاہیں کہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کروں اور دھمکی دیں کہ ایسا نہ کرو گے تو تجھے دریا میں غرق کر دونگا تو یاد رکھئے میں دریا میں ڈوب جانے کو پسند کروں گا لیکن خلاف انصاف

فیصلہ کروں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ قاضی تو اس شخص کو ہونا چاہیے جو آپ کے خلاف بھی فیصلہ کرنے کی قوت رکھتا ہو۔ آپ کے خلاف بھی اور آپ کے بال بچوں کے خلاف بھی۔ آپ کے سپہ سالاروں اور فوجی افسروں کے خلاف بھی۔"

ابن ہبیرہ جیسے ظالم اور قاہر انسان سے جب امامؒ کا معاملہ پیش آیا تو امامؒ نے اس کے حکم کے خلاف قضا کی خدمت قبول کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا ابن ہبیرہ نے خوفناک سزا دینے کی قسم کھائی تو امام نے نہایت اطمینان سے کہا

"دنیا میں اس کے مار لینے کو آخرت کے آہنی گرزوں کی مار سے میں آسان خیال کرتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا چاہے ابن ہبیرہ مجھے قتل ہی کیوں نہ کر دے۔ اور جب امام پر حق پر کوڑے برس رہے تھے اور خون بہہ بہہ کر ان کی ایڑیوں تک آ رہا تھا تو نہایت بے نیازی سے ان کی زبان پر تھا۔ بس صرف ایک ہی موت تک اس کا اقتدار ہے"

پھر کہا۔

"یاد کر اس وقت کو جب اللہ تعالیٰ کے سامنے تو بھی کھڑا کیا جائے گا۔ اور آج تیرے سامنے میں جتنا ذلیل کیا جا رہا ہوں اس سے کہیں زیادہ ذلت کے ساتھ تو خدا کے دربار میں پیش کیا جائے گا۔ اس وقت بجز سچی بات کے تیرا کوئی جواب نہ سنا جائے گا۔"

قاضی ابو یوسف نے شاہی عہدۂ قضا پر مامور ہونے کے باوجود بادشاہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"آپ پر ایک بڑی ذمہ داری عائد کی گئی ہے جس کا ثواب تمام ثوابوں میں بڑا ہے لیکن اس کی سزا بھی تمام سزاؤں میں بدتر اور سخت ہے۔ آپ کے سپرد امت کے معاملات کئے گئے ہیں اور آپ ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں کہ خدا کی بے شمار مخلوق کے حقوق کی بنیادوں کو مستحکم کریں۔ خدا آپ پر ذمہ داری عائد کر کے آزمائش کر رہا ہے۔ میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ خدا کے ڈر پر جس تعمیر کی بنیاد نہ رکھی جائے گی اس کے متعلق ڈرتے رہنا چاہیئے کہ کس وقت قدرت اس کو اوندھے منہ گرا دیتی ہے۔"

امام حسن بصری کو جب ارباب اقتدار سے واسطہ پیش آیا تو انہوں نے بھی ابن ہبیرہ جیسے جابر حاکم سے صاف صاف کہہ دیا:-

"ابن ہبیرہ یزید کے بارے میں خدا کا خوف کر اور خدا کے معاملہ میں اس کا خوف نہ کیا کر۔ خدا تجھ کو یزید سے بچا سکتا ہے۔ لیکن یزید تجھ کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ خدا تیرے پاس ایسا فرشتہ بھیجے گا جو تجھ کو تخت حکومت سے اتار کر اور قصر کی وسعت سے نکال کر قبر کی تنگی میں ڈال دے گا۔ اس وقت تیرے اعمال کے سوا کوئی اور شے تجھ کو نجات نہ دلا سکے گی۔ خدا نے بادشاہ اور حکومت کو اپنے بندوں کی امداد و اعانت کے لئے بنایا ہے اس لئے تم خدا کے بندوں پر سوار نہ ہو جاؤ۔ خدا کی معصیت میں کسی مخلوق کی اعانت نہ کرنی چاہیئے۔"

سعیدؒ بن مسیب نے بھی ظالم حاکم سے کوڑوں کی مار کے مقابل میں صاف

صاف کہہ دیا تھا کہ :۔

"کتاب اللہ کا حکم سنانے سے مجھے کوئی چیز روک نہیں سکتی جو تیرے جی میں آئے کر گزر ۔ عنقریب تجھ پر بُرا وقت آنے والا ہے تمہارا حال یہ ہے کہ انسانوں کو بھوکا رکھتے ہو اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہو"۔

تاتاریوں نے جب دمشق پر حملہ کیا تو وقت کے مرد حق آگاہ امام ابن تیمیہؒ نے بادشاہِ تاتار جس کی خونریزی سے سارا عالم کانپ رہا تھا کو صاف صاف کہہ دیا :۔

"تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی ، امام ، شیخ اور مؤذن بھی رہا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا حالانکہ تمہارے باپ اور دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے محترز تھے ۔ انہوں نے جو کچھ عہد کیا اسے پورا کیا اور تم نے جو عہد کیا تھا وہ توڑ دیا ۔ اور جو کچھ کہا تھا اسے پورا نہیں کیا اور بندگانِ خدا پر ظلم کیا"۔

بادشاہ نے دعا کے لئے درخواست کی تو حسب ذیل الفاظ میں دعا کی ۔

"خدایا اگر آپ کے نزدیک قازان کا اس جنگ سے مقصد تیرے کلمہ کی بلندی اور جہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس کی مدد فرما اور اگر سلطنت دنیا اور حرص و ہوس ہے تو اس سے تو سمجھ لے"۔

پھر ایک وقت آیا جب شیخ الاسلام کو ارباب اقتدار نے جیل بھیج دیا ۔ لیکن وہ اس ظلم کے باوجود اپنے مسلکِ حق پرستی پر قائم رہے

اس بات کا انہوں نے اپنے ایک رسالے میں تذکرہ کیا ہے :۔

"ایک دن میرے پاس داروغہ جیل آیا اور اس نے کہا۔ نائب السلطنت نے سلام بھجوایا ہے اور فرماتے ہیں کہ آخر کب تک جیل میں رہنا ہے کیا نکلنے کا ارادہ نہیں۔ کیا اب بھی آپ اسی بات پر قائم ہیں؟ میں نے کہلا بھیجا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ میں کس جرم میں قید کیا گیا ہوں۔ پھر داروغہ کے ساتھ دوسرا آدمی آیا انہوں نے ایک محضر نامہ نکالا جس میں خلاف واقعہ اور غلط باتیں لکھی تھیں۔ اور اصرار کیا کہ میں اس مطالبے کو منظور کروں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ اس معاملے میں مجھے فیصلے کا حق نہیں۔ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور تمام عالم کے مسلمانوں کا ہے۔ مجھے اللہ کے آئین میں تغیر و تبدل کا اختیار نہیں ہے۔ تمہارے اللہ کسی دوسرے کی وجہ سے دین اسلام سے ہٹ نہیں سکتا۔ اور نہ کذب و بہتان کا اقرار کر سکتا ہوں جب میں نے دیکھا کہ وہ اصرار کرتے ہیں تو پھر میں نے بھی سختی سے بات کی اور کہا کہ یہ فضول باتیں چھوڑ دو۔ جاؤ اور اپنا کام کرو۔ میں نے تم سے اس کی درخواست نہیں کی تھی کہ تم مجھے جیل سے نکالو۔ دروازہ کھولو میں جاتا ہوں۔ گفتگو بند ہے۔ میں نے قاصد سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس معاملہ کا نقصان مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ مجھے کس بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے اگر میں اس مقدمہ میں قتل کر دیا گیا تو میں بڑے درجے میں شہادت پاؤں گا۔ اور یہ میرے حق میں بڑی سعادت ہو گی۔ قیامت میں مجھے راضی کیا جائے گا۔ اور جو لوگ اس میں ساعی بنیں گے۔ قیامت تک وہ لعنت کے مستحق ہوں گے۔ اس لئے کہ ساری

امّت محمدیؐ کو معلوم ہے کہ میں اسی حق پر مارا جا رہا ہوں جس کے ساتھ اللہ نے اپنے رسولؐ کو مبعوث فرمایا۔ اور اگر میں محبوس کر دیا گیا تو خدا کی قسم میرا محبوس ہونا اللہ تعالےٰ کی ایک عظیم ترین نعمت ہوگی اور مجھے کسی ایسی چیز کا خوف نہیں جو لوگ مجھ سے چھین لیں گے۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا یہ مقدمہ پاکستان کے اندر مولینا مودودی کے حالات سے بہت مشابہ نظر آتا ہے۔

امام غزالی نے تو سلاطین وقت کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا:۔

"ہمارے زمانے میں سلاطین کے تمام یا اکثر اموال حرام ہیں۔ ان سلاطین کو نہ اپنی صورت دکھانی چاہیئے نہ ان کی دیکھنی چاہیئے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ ان کے ظلم سے بغض رکھے ان کی تعریف نہ کرے۔ ان کے حالات سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور ان کے ہاں رسائی رکھنے والوں سے بھی دور رہے۔"

انہوں نے دوران گفتگو میں بادشاہِ وقت سے رُو در رُو کہہ دیا تھا:۔

"تیرے گھوڑوں کی گردن سازِ زرین سے نہ ٹوٹی تو کیا مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی۔"

اور ایک دوسرے حاکم وقت کو کہا:۔

"ظلم حد سے گذر چکا ہے، چونکہ مجھے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا تھا اس لئے تقریباً ایک سال سے میں نے طوس کا قیام ترک کر دیا ہے تاکہ بے رحم و بے حیا ظالموں کی حرکات دیکھنے سے خلاصی پاؤں۔"

زمانۂ قریب میں شاہ ولی اللہ نے اسی حق گوئی و حق پرستی کا حق ادا کیا

مسلمان بادشاہوں کے بارے میں خود ان کی موجودگی میں صاف صاف لکھ دیا۔

"ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند رہی ہے بس فرق صرف یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے ہیں اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں۔ ہم اس تغیّر کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں معلوم نہیں آگے چل کر اللہ تعالےٰ کیا دکھانا چاہتا ہے۔"

اور آگے چل کر لوگوں نے جو دیکھا۔ وہ یہ دیکھا کہ آئندہ آنے والے مسلمان حاکم ان دو ضروریات دین سے بھی بے نیاز ہو گئے اور خود مسلمانوں پر ہی ظلم و ستم میں پہلے سے زیادہ جری اور بے باک ہو گئے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اس وقت کے امراء سلطنت کو مخاطب کر کے کہا۔

"میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا۔ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو گئے اور رعیّت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے علانیہ شرابیں پی جا رہی ہیں اور تم نہیں روکتے۔ زناکاری، شراب خوری اور قمار بازی کے اڈے بکسر عام بن گئے ہیں اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں مدّت ہائے دراز سے کوئی حد شرعی نہیں لگائی گئی جس کو تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو۔ کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز کپڑوں اور مکانوں کی لطافت بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو۔ کبھی خدا کا خیال تمہیں نہیں آتا۔"

ایسا نہیں اقتباسات کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کے احوال پر بھی نظر

ڈالیئے۔ وہ پاکستان میں نظام اسلامی کا مطالبہ اٹھاتے ہیں اور ملک گیر مہم کر کے رائے عامہ ہموار کر دیتے ہیں جمہوری طریق سے وہ تمام دستوری تقاضے پورے کر دیتے ہیں اور ایک جمہوری ریاست میں یہ کافی ہوتا ہے کہ فلاں چیز کو جو ریاست کے بنیادی تصورات کے بھی خلاف نہیں ہے جمہور چاہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اربابِ اقتدار ایسی مہم اور ایسے کسی مطالبے کو ناپسند کرتے ہیں اس لیے مولانا مودودی کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھجوا دیتے ہیں اور پھر مسلسل تین بار مدت قید میں اضافہ پر اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ بالآخر ایک قانونی سقم کی بناء پر ہی اربابِ اقتدار کی مرضی کے عین خلاف وہ جیل سے باہر آ جاتے ہیں۔ اس وقت مولانا اپنے بارے میں ان کو بتاتے ہیں کہ انہیں ان کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہیئے۔

"میں نے اپنی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سُن کر، سوچ کر اور سمجھ کر اور مشاہدہ اور تجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک سانچہ بن چکا ہے۔ میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں جن کی پشت پر برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے۔ اور ان پر پورے قلبی و دماغی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے اور ان کو قلب و دماغ کے متفقہ فیصلہ کے ساتھ رد کر چکا ہوں۔ میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے

میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں ہے بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصب العین کی طرف کھینچا ہے جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے، جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا۔ اور ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی اس جدوجہد میں مبتلا کر دیا ہے جس میں خود مبتلا ہوں۔ اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی ہوا سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفاخانہ امراضِ دماغی ہے اور اگر اس نے یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آ کر میں اپنا ضمیر اس کے ہاتھ میں رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راشن کیے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دل صداقت کے لیے تو ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری ہر رائے علمی اور عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے لیکن میرا ایمان و ضمیر کوئی قابلِ رہن و بیع چیز نہیں ہے اس کی کوشش پہلے بھی جس نے کی ہے ناکام ہوا ہے۔ اور آئندہ بھی جو کرے گا انشاءاللہ منہ کی کھائے گا۔" (ترجمان القرآن شعبان ۱۳۶۹ھ)

مولینا نے یہ باتیں اربابِ جفا پیشہ کی اطلاع کے لیے صاف صاف کہہ دی تھیں تاکہ مولینا کا موقف ان پر ظاہر ہو جائے۔ لیکن انہوں نے

جو اس سے سبق لیا وہ یہ کہ اندھے بھینسے کی طرح اسی رُخ پر زور لگاتے چلے گئے اور مولانا کو آزاد پاکستان میں آکر زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل میں گزارنا پڑا۔

اسی طرح دین کے مفاد کے لیے مولانا کسی بڑی سے بڑی مصلحت اور بدتر سے بدتر خطرے کی بھی پروا نہیں کرتے وہ انہیں ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ اور اس پر ان کی پوری زندگی گواہ ہے۔

"میرے نزدیک خدا کا دین اور اس کی اُمت مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور تعلق سے قیمتی ہے اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز دوست ہو یا استاد ہو، میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملے میں کسی تعلق یا کسی نیازمندی کی پروا کرنے سے میں بالکل معذور ہوں۔ جس کسی کو میرے اس طرز عمل سے تکلیف ہو وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا، بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا۔ خواہ وہ دنیوی لحاظ سے حقیر ترین آدمی ہو اور اگر وہ مجرد شکایت کرے گا تو میں عرض کروں گا کہ حق کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، اپنے اور پرائے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔"

جسم مختلف روح ایک

مولانا مودودی کے الفاظ پر غور کیجئے اور پھر تاریخ کے مختلف ادوار میں اصلاح امت کے لئے اٹھنے والے حضرات کے کہے ہوئے الفاظ پر نظر ڈالیے تو

آپ دیکھیں گے کہ ارباب اقتدار کے مقابلے میں ان سب حضرات کے الفاظ چاہیے مختلف ہیں لیکن ذہن ایک ہے۔ بیان مختلف ہیں لیکن لہجہ ایک ہے جسم مختلف ہیں لیکن روح ایک ہے۔ دور تاریخ مختلف ہیں لیکن تصور ایک ہے۔ اپنے اپنے وقت میں جن ارباب اقتدار سے انہیں واسطہ پڑا۔ ان حضرات میں سے کسی ایک نے بھی سرکاری درباری لہجہ یا انداز اختیار نہیں کیا۔ خوشامد کا پہلو اختیار نہیں کیا۔ درباری سرکاری تو وہ بنتا ہے جس کے دل میں روگ ہوتا ہے۔ بقول امام احمد بن حنبل سلاطین سے تو وہ ڈرتے ہیں جن کے دل میں بیماری ہوتی ہے جس کا دل تندرست ہوتا ہے وہ اگر حق پر قائم ہے تو نہ کسی سے خوف کھاتا ہے اور نہ لالچ میں گھرتا ہے۔ وہ تو حق کی بے لاگ تیغ براں ہوتا ہے اور بدقسمت ہے وہ جس کے خلاف یہ تلوار چل جائے اس لئے کہ اس تلوار کی دھار تو زمانے کے ساتھ ساتھ کاٹ کرتی چلی جاتی ہے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ کی یہ تلوار آج تک نمرود کی نخوت کی گردن پر نہیں چل رہی ہے کیا فرعون موسیٰ آج تک زمانے کے دریا میں روز بروز گہرے سے گہرے پانیوں میں غرق نہیں ہوتا جارہا ہے۔ کیا یزید کی گردن پر آج تک امت کی تلوار امام حسینؓ کے انتقام میں نہیں لہرا رہی ہے وہ کون سا ظالم ہے۔ جس نے ظلم کیا ہو اور صدیوں تک زمانے کے ہر دور کے ساتھ ہر نئی نسل نے اسے روایات تصورات اور تاریخ کے چوراہے پر کھڑا کر کے بار بار اور مسلسل سنگسار نہ کیا ہو۔ بدقسمت ہے وہ شخص جو اپنے آپ کو حق کے مقابلے میں لا کھڑا کرے اور پھر نسل انسانی کے دوران ہمیشہ کے لئے نفرت و ذلت کا ہدف اور مثال بن جائے۔

ایک ہی مٹی

مولانا مودودی بھی اسی مٹی سے بنائے گئے ہیں جس مٹی سے داعیانِ حق بنائے جایا کرتے ہیں جو سوائے حق کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتی جو جاہ و منصب کے لئے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ فریضۂ بندگی اور حق بندگی ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور جنہیں اس دنیا کے مظاہرِ عیش و عشرت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ کسی سلطان کی جبّہ سائی کریں اور کسی جابر کی آستان بوسی کریں جو ہر غرض سے بے لوث ہے، بے لاگ ہے اس کے جسم پر طعن و تشنیع و تشدّد اثر نہیں کرتے اس لئے کہ وہ تو فرض کا پتلا ہے۔ جس کے اخلاقی جسم پر لوہے کی تلوار اثر نہیں کرتی بلکہ وہ تو لہرا کر اس میں سے اس طرح گذر جاتی ہے جیسے ہوا میں سے گذرتی ہے۔ تلواریں تو غرض مند جسموں کو کاٹتی اور بیمار دلوں کو مجروح کرتی ہیں۔

دین مستغنی ہے

مولانا مودودی کا استغنیٰ داعی دعوت اور غیرت دینی کا استغنیٰ ہے وہ بے لاگ اور بے لوث قلب و نظر کا استغنیٰ ہے۔ یہ وہ استغنیٰ ہے جو ہر داعی حق میں اربابِ اقتدار کے مقابل ہوتا ہے ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر ان کا معالج جیل میں ان کی دیرینہ بیماری کا علاج کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے لکھتے ہیں: "بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطور خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان

دے سکتا ہوں۔ مگر رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا" جیل کے اندر ظالم کے ظلم سے بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ:-

"بلا مبالغہ آج شاید روئے زمین پر مجھ سے زیادہ مطمئن کوئی آدمی نہیں ہے۔ ہاں بچوں اور متعلقین کی مجھے فکر نہیں کیونکہ انہیں خدا کے حوالے کر آیا ہوں قوم کی مجھے فکر نہیں کیونکہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے جتنی ذمہ داری مجھ پر تھی وہ سب موجودہ حکمران گروہ نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ جماعت اور دعوت اسلامی کی مجھے فکر نہیں کیونکہ گرفتار ہوتے ہی عنداللہ بری الذمہ ہو چکا ہوں اور ساتھ ہی اس بات کا بھی سو فیصدی یقین رکھتا ہوں کہ اس کام کو میرے قید ہونے اور رہنے سے قطعاً کوئی نقصان نہ پہنچے گا بلکہ اس کے برعکس فائدہ ہی پہنچے گا۔"

جس راستے پر وہ چل رہے ہیں اس کی منازل کی طرف سے ان کی آگاہی کا یہ عالم ہے کہ وہ قدم قدم کی آزمائشوں کو خوب جانتے ہیں۔ اور اس کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ جیل میں سے والدہ کے نام لکھتے ہیں:-

جس راستے پر میں برسوں سے چل رہا تھا۔ اس میں یہ منزل تو بہر حال آنی ہی تھی حیرت اس کے آنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ درحقیقت میں تو اس بات پر حیران ہوں۔ کہ شیطان اور اس کی ذریت نے مجھے اتنے دنوں برداشت کیسے کیا۔ بہر حال اب کہ وہ ادھر متوجہ ہو گئے۔ ہیں یہ امید نہ رکھیے کہ یہ کشمکش جلدی ختم ہو جائے گی۔ اب اس کا خاتمہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے۔ یا میں ختم ہو جاؤں یا وہ اصلاح ہو کر رہے جس کے لئے

میں پچھلے پندرہ برس سے کام کر رہا ہوں۔ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی اور بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیئے اور ہر بد سے بدتر نتیجہ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

حیدر آباد کے قیام کے دوران ایک نواب صاحب نے جو محکمہ امور مذہبی کی طرف سے ترجمان القرآن کے کئی سو پرچے محکمے کے لیے خریدتے تھے۔ خریداری روک دی اور اس بات کے متمنی تھے کہ مولانا ان سے جا کر کہیں کہ وہ پھر خریداری کی منظوری دے دیں مولانا کو معلوم ہوا تو بولے۔

"میں قیامت تک اس کام کے لیے ان کے پاس نہ جاؤں گا۔ یہ میرا نہیں دین کا کام ہے جو ان کا بھی ہے۔"

چنانچہ مالی نقصان برداشت کیا اور نہیں گئے۔

۱۹۵۳ء میں سزائے موت سنانے کے بعد مولانا کو ۴۸ گھنٹے تک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ پھر سی کلاس میں اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رکھا اور پریشان کرنے کے لیے بیماری کی حالت میں بھی جگہ جگہ منتقل کرتے رہے۔ ارباب اقتدار چاہتے تھے کہ مولانا رحم کی اپیل کریں۔ احوال پوچھنے پر بتایا۔

"بڑے اطمینان سے پھانسی کی کوٹھڑی میں تین راتیں گذاریں اور کل انہیں باہر نکالنا ہی پڑا۔ مجھ سے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں رحم کی اپیل ان سے کروں اس کے لیے تو میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے۔" (روایت بالمعنی)۔ اسی قید میں مولانا کو جو تفہیم القرآن جیسی عظیم الشان تفسیر لکھ رہے ہیں۔ مشقت بھی دی گئی

وزیر جیل خانجات جیل کے دورے پر آئے تو مولانا نے یہاں کے سارے افسوسناک حالات کا ان سے تذکرہ کیا اور کہا۔

" کیا آپ لوگ اس اصول پر چل رہے ہیں کہ جو پارٹی برسرِ اقتدار آجائے، وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ بدترین توہین آمیز اور انتقامی سلوک کرے۔ اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کے نتائج آپ کے حق میں اچھے نہیں ہو سکتے"!

اس کشمکش کا کوئی حل ..... ایک گول میز کانفرنس

یہ کشمکش جو مولانا مودودی اور اربابِ اقتدار کے درمیان برسوں سے چلی آرہی ہے یہاں تک کہ ہر گروہ جو اوپر آتا ہے۔ اپنے پیش روؤں سے ہزار اختلافات کے باوجود مولانا مودودی کے بارے میں وہ اپنے پیش روؤں کے ہی نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اب ان آزمائے ہوئے ظلم و تشدد کے حربوں کو چھوڑ کر کوئی دانشمندانہ تدبیر عمل میں لائے جس سے ملت کی تعمیر کا مثبت کام ہو سکے اور اس اسلام پسند قوت جو مولانا مودودی کی رہنمائی میں ملک کے اندر سرگرمِ عمل ہے اور جس کی جڑیں ملت کے ضمیر میں گہری پیوست ہیں۔ اس سے کوئی مفید کام لیا جا سکے۔ کرسی پر ہر نیا آنے والا اقتدار کی اسی ایک اندھی لاٹھی سے مسائل کو حل کرنے کی احمقانہ کوشش کرتا اور نتیجتہً حالات کو اور زیادہ بگاڑتا ہے۔ کیا کوئی دانشمند آدمی کبھی برسرِ اقتدار نہ آئے گا جو حالات کو عقل سے سمجھے اور انگریز کی چھوڑی ہوئی بیوروکریسی کے چشم و ابرو کے اشاروں کو چھوڑ کر خود اپنے ضمیر اور عقل سے کام لے اور مسائل کے حل کا کوئی معقول۔ (Reasonable) راستہ نکالے اور مولانا مودودی کے بارے میں اربابِ

اقتدار کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کی جو روایت چلی آ رہی ہے۔ اس سے ہٹ کر عقل و تدبیر سے کام لے۔ مولینا مودودی ایک ذہین پڑھے لکھے صاحب نصب العین آدمی ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ملکی مسائل کو کسی گول میز کانفرنس میں بیٹھ کر طے کیا جائے جس سے درمیان کے حجاب اٹھ سکیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا کوئی موقع فراہم ہو سکے۔ مولینا مودودی جس کردار کے آدمی ہیں۔ وہ کبھی دعوت دین جیسے باوقار کام کے لئے بحضور فیض گنجور کی فدویانہ درخواست لے کر ارباب اقتدار کی خدمت اقدس میں حاضر نہ ہوں گے لیکن اگر سوچا جائے تو ارباب اقتدار کے لئے یہ ایک سعادت ہو سکتی ہے۔ کہ وہ مولینا مودودی سے ان کا پیغام مشن۔ دعوت، اور نصب العین جانیں، سمجھیں اور اسے ملک و ملت کے لئے مفید پا کر اپنانے کی کوشش کریں۔ ملک و ملت کے بلند ترین مسائل کے حل میں جہاں کچھ مخلص انسانوں میں بنیادی اختلافات ہوں وہاں علمی اور نظریاتی مسائل جیل اور دھونس کی دلیل سے حل نہیں کئے جا سکتے ——— ان کا قابل عمل حل باہمی افہام و تفہیم سمجھنے سمجھانے اور بحث و تمحیص سے ہی سامنے آ سکتا ہے اور اگر نیت خالص اور دل پاکیزہ ہوں تو یہ بات کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ جو طبقہ بات بات پر سائنٹیفک دور کے جدید تقاضے عملی تجربات اور عقل و دانش کی ہانک لگاتا ہو۔ اس کے لئے تو یہ بڑی ہی غیر عقلی اور نامعقول (جمہوریت کش) بات ہے۔ کہ وہ ہر وقت ہر مسئلے میں جبر و تشدد کی قوت کو ہی حرکت میں لاتا رہے اور سمجھے کہ ہر بیماری کا علاج مار پیٹ ہے۔

دوسرا حل رائے عامہ کا کھلا میدان

اس کا دوسرا حل خود مولینا مودودی نے پیش کر دیا ہوا ہے۔

"جو لوگ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں خواہ وہ برسرِ اقتدار ہوں یا نہ ہوں۔ ان کیلئے سیدھا اور صاف طریقہ کار یہ ہے۔ کہ وہ دلائل سے ہمارا مقابلہ کریں اور جس طرح رائے عام سے ہم اپیل کرتے ہیں وہ بھی کریں۔ ہم اس کیلئے تیار ہیں اور انہیں بھی اس کے لئے تیار ہونا چاہیئے کہ باشندگانِ ملک کی اکثریت اس کھلے مقابلے میں جس مدرسہ فکر کو پسند کرے۔ وہ زمامِ کار پر قابض ہو۔ اور دوسرے مدارس فکر عوام کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتے رہیں۔ اس سیدھے طریقے کو چھوڑ کر جو لوگ دوسروں کا راستہ روکنے کے لئے جبر و ظلم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، اور حکومت کے وسائل و ذرائع اور اختیارات اس غرض کے لئے استعمال کرتے ہیں کہ رائے عام پر ان کو دائمی قبضہ حاصل رہے۔ اور دوسرے کو اسے ہموار کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ وہ نادان اور نا عاقبت اندیش ہیں۔ ان کا یہ طریق نہ صرف حکمت و مصلحت کے خلاف ہے۔ بلکہ دیانت و امانت کے بھی خلاف ہے۔"

لیکن مصیبت یہ ہے کہ اقتدار کی کرسی پر پہنچ کر اپنے سے پہلوں کو بار بار گرتے دیکھنے کے باوجود پاکستان میں تو اقتدار کے عارضی مناظر کا تماشہ ہر ہر فرد دیکھ چکا ہے۔ اربابِ اقتدار پھر وہی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ جو ان سے پہلوں نے کی ہوتی ہیں۔ اور جن کے کرنے سے ہی وہ عوام میں غیر مقبول ہو کر اقتدار کی کرسیوں سے گرے ہوتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے اس ذہن کے بارے میں مولانا مودودی نے لکھا ہے۔

"اصحابِ اقتدار اپنی مرضی کے خلاف کسی تحریک کو بڑھتے دیکھ کر اس کے خلاف جبر کے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ایک طرح کا اعتراف

جو یہ لوگ کھیلتے ہیں۔ جبر لازماً ایک ہی نتیجہ پیدا نہیں کیا کرتا کہ آپ اطمینان سے آنکھیں بند کر کے اسے استعمال کر بیٹھیں اور خود بخود آپ کا مطلوب نتیجہ برآمد ہو جائے۔ اس کے تو تین ممکن نتیجے برآمد ہونے کے یکساں امکانات ہیں۔ ایک ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کے کارفرما اور کارکن دب جائیں یا بک جائیں۔ حکومت کے قمار باز اسی نتیجہ کی امید پر یہ بازی کھیلتے ہیں۔ دوسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ جابرانہ مزاحمت سے تحریک اور زیادہ زور پکڑ جائے اور آزمائش کی بھٹی اس کے کارکنوں کی قابلیتوں کو اور زیادہ نکھار دے۔ اسی امید پر ایک تحریک جبر کا خیر مقدم کرتی ہے اور بسا اوقات اس کو خود دعوت دینے لگتی ہے۔ تیسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک غلط راستے پر پڑ جائے۔ اس کے لیڈر اور کارکن اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھیں۔ یا ذمہ دار بردباروں کے ہٹ جانے کے بعد تحریک سر پھرے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے یا آئینی و جمہوری طرز کی جدوجہد کا راستہ بند پاکر وہ خفیہ تحریکوں کا راستہ اختیار کرلے۔ یہ نتیجہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوتا۔ نہ حکومت کے لئے نہ ملک کے لئے نہ خود تحریک کے لئے۔ دنیا میں بار بار جبر کے استعمال سے یہ نتیجہ رونما ہو چکا ہے۔ اس کی بدولت اچھی اچھی مفید تحریکیں بگڑ کر نقصان دہ بن گئی ہیں۔ اس نے ملکوں اور قوموں کی قسمتیں بگاڑ دی ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے سامنے روس موجود ہے جہاں زاروں کے جبر نے اصلاح کے جمہوری و آئینی طریقوں کا راستہ روک کر اصلاح طلب لوگوں کو خفیہ تحریکات کے راستے پر ڈال دیا اور اس کی بدولت پوری قوم کا مزاج ایسا بگڑ گیا کہ آج پوری دنیا اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ حکومتیں

اس امید پر جبر استعمال کرتی ہیں کہ نتیجہ ان کے منشا کے مطابق ہو گا۔ لیکن اس کے رونما نہ ہو سکنے کی ضمانت کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ حکومت کو اس قماربازی سے باز رہنا چاہیئے اور سیدھی طرح کام کرنے والوں کے ساتھ سیدھی طرح ہی معاملہ کرنا چاہیئے۔ ملک کی اور خود حکومت کی اپنی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ یہاں ہر خیال کے لوگوں کے لئے رائے عام سے اپیل کرنے کا موقعہ کھلا رہے اور صرف رائے عام کی تبدیلی نظامِ حکومت کی تبدیلی کے لئے کافی ہو۔"

اربابِ اقتدار کا ایک بڑا امتحان

یہ ہے مولینا مودودی کی پیش کردہ جمہوری تجویز جو انہوں نے اربابِ اقتدار کے سامنے رکھ دی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے بہتر جمہوری اخلاقی اور عملی طریق کار اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب یہ اربابِ اقتدار کا اپنا کام ہے کہ وہ اس ملک کی نظریاتی بنیادوں، عوام کی فلاح و بہبود اور اپنے موقف کے پیشِ نظر مولانا مودودی کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولینا مودودی کی ذات ہمارے اربابِ اقتدار کی عقل و دانش، صبر و تحمل، ملکی مفاد کے بارے میں دیانت اور اخلاص کا بہت بڑا امتحان ہے۔ بہت ہی بڑا امتحان، جسے ہمارے اربابِ اقتدار گذشتہ ۱۴ سال میں اب تک پاس نہیں کر سکے۔ حالانکہ اس امتحان کے پاس کرنے پر ہی ملک و ملت کا درخشاں مستقبل معلق ہے۔

(۱۰)

اقامتِ دین کی راہِ سلوک کا مسافر

غیر جانبداری مشکل ہے!

مولانا مودودی کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے ہم آج کے انسانوں کی یہ خوش بختی ہے کہ ان کے لئے یہ پڑھنے، معلومات فراہم کرنے اور بیان کرنے کی چیز نہیں بلکہ غور سے سمجھنے، قریب سے دیکھنے اور رائے قائم کر کے مخالفت یا موافقت کرنے کی چیز ہے۔ وہ ایسی شخصیت نہیں ہے جو دنیا میں خاموشی کے ساتھ آکر اپنی ذات کے تربیتی ماحول میں تگ و تاز کر کے کچھ دنیوی کامیابیاں یا حسرتیں سمیٹ کر کسی مخصوص طبقہ میں معروف یا بدنام ہو کر رخصت ہو جانے والی ہے بلکہ جس دورِ تہذیب میں ہم رہ رہے ہیں جس عصرِ حاضر نے ہمارے چاروں طرف اپنا فکری اور تہذیبی جال پھیلا رکھا ہے۔ اس دورِ تہذیب اور اس عصرِ حاضر کے خلاف مولانا مودودی نے بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے۔ وہ اس کو ڈھانے، توڑ پھوڑ دینے اور مسمار کر کے اس کی تخریب سے ایک نئی تعمیر اٹھانے کا علی الاعلان اظہار کر رہے ہیں۔ اظہار ہی نہیں، انہوں نے یہ کام عملاً شروع کر رکھا ہے۔ ایک صبر آزما اعصابی، علمی، عقلی، اخلاقی، مادی اور تہذیبی جنگ ہے جو انہوں نے چھیڑ رکھی ہے۔ بنی نوع انسان کی موجودہ نسل میں سے وہ پکار پکار کر اپنے

ساتھی جمع کر رہے ہیں انہیں سمیٹ سمیٹ کر اور منظم کر کر کے وہ موجودہ چلتے ہوئے نظام پر پیہم یورش کر رہے ہیں۔ یہ ساری کارروائی برابر وہ ہمارے سامنے کئے جا رہے ہیں ظاہر ہے کہ کوئی بڑا ہی غافل آدمی ہو گا جو غیر جانب داری کا پردہ لٹکا کر اس میدانِ جنگ کی طرف سے آنکھیں پھیر لے۔ انہوں نے ساری موجودہ نسل کو عموماً اور مسلم معاشرے کے فرد فرد کو خصوصاً یہ کہہ کر آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے کہ میں اقامتِ دین کا کام کر رہا ہوں۔ وہ کام جسے انبیاء اور صلحاء کرتے آئے ہیں اور جسے ہمارے آقاؐ اور سرکارؐ نے انجام دیا۔ اب کون مسلمان ہے جو ان کی ان باتوں سے غافل رہ سکتا ہے۔ ان کے بارے میں دو میں سے ایک طرزِ عمل اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اگر یہ شخص غلط کہہ رہا ہے تو پھر اس کا مقابلہ اس کی مزاحمت۔ اس کی پیش قدمی کو روکنا ایک ایک مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اس کے دین و ایمان کے ساتھ کھیلے۔

اور اگر یہ صحیح کہہ رہا ہے تو پھر اس کی امداد اس کی اعانت اس کی پیروی۔ اس کی رفاقت۔ اس کے محاذِ جنگ کا سپاہی بننا اس کے کام میں اپنا سب کچھ لگا دینا ایک ایک مسلمان کا فرض ہے اس لئے کہ ایک مسلمان کے لئے یہ کسی صورت جائز نہیں ہے کہ دین کے خادم زخم کھا کھا کر گریں اور اس کی حمیت میں ہمیر موحرکت پیدا نہ ہو۔

اس لئے آج ایک مسلمان ہر معاملے میں غیر جانبدار رہ سکتا ہے۔ لیکن

مولانا مودودی کے معاملے میں۔ اگر اسے ذرا بھی حالاتِ زمانہ سے آگاہی اور اپنے گردوپیش کی خبر ہے تو وہ غیر جانب دار نہیں رہ سکتا یا اسے ان کا دوست ہونا چاہئے جانثار دوست۔ یا اسے ان کا دشمن ہونا چاہیئے۔ متشدد دشمن۔ لیکن یہ طرزِ عمل اس وقت تک دل و دماغ کے اطمینان اور قلب کی گہرائی سے اختیار نہیں کیا جا سکتا جب تک ان کی شخصیت اور ذات کا قریبی اور گہرا مطالعہ نہ کر لیا جائے وہ کیا کہتے ہیں۔ اور جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود کس حد تک عمل کرتے ہیں جو عمل کرتے ہیں اس میں کس حد تک خلوص خدا ترسی اور مقصد کے عشق کی جھلک ہوتی ہے اس کام میں ان کی استقامت کا کیا حال ہے، انہوں نے اس کام میں کیا کچھ لگایا ہے کیا کچھ بچایا ہے۔ مادی طور پر کیا کچھ صرف کیا ہے اور کیا کچھ پایا ہے۔ اس کٹھن کام میں ان کے عزم و ہمت کا کیا حال ہے، مصائب میں ان کی عزیمت کس درجہ کی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا اندر اور باہر کیسا ہے، وہ قریب اور دور سے کیسے نظر آتے ہیں یہ وہ سب چیزیں ہیں جو ایک صاحبِ ہوش آدمی کو دیکھنی چاہیئے۔ اگر وہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہے۔

پہاڑ کی مانند

مولانا مودودی کی شخصیت ایک پہاڑ کی مانند ہے۔ پہاڑ کو آنکھیں کھول کر دور سے دیکھئے تو بھی وہ خوش نما اور خوش منظر ہوتا ہے اور وہ بے پناہ حوادث زمانہ کے اندر اپنے عزم کی مستحکم بنیاد پر ساری دنیا کے سامنے بے لاگ و لپیٹ کھڑا ہوتا ہے اور اگر اس کے قریب جائیے تو جوں جوں اس کی قربت بڑھے گی۔ اس کی بلندی اور عظمت اور اونچائی اور خوش نمائی اور خوش منظری

بڑھتی چلی جائے گی۔ مولانا مودودی کی یہ بہت بڑی عظمت ہے کہ انکی قربت دوری سے کہیں زیادہ خوش منظر ہے۔

مولانا مودودی کی زندگی میں کہیں پردے لٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ کہیں پر بھی ان کی شخصیت نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ انہیں ہر حال میں دیکھئے اور ہر رنگ میں یکساں پائیے۔ بناوٹ۔ تصنع۔ تکلف۔ خود نمائی۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا ان کی شخصیت کے گرد کوسوں دور تک پتہ نہیں ملتا۔ نہ وہ اپنی ذات کو کسی پر ٹھونستے ہیں۔ نہ مرعوب کرتے ہیں۔ نہ علمی تفوق کا کوئی خفیف سا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔ نہ مجلس میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ ہر شخص کے جو ان سے ملے ہمدرد۔ غمگسار۔ مخلص اور رازگو ساتھی ہیں۔ ان کی چال ڈھال، بول چال، نشست و برخاست اور لب ولہجہ سے ایک متحکم باعمل اور راست فکر کردار کا اظہار ہوتا ہے۔ اور آدمی تھوڑی سی بات چیت میں ہی سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص باتوں میں بہلانے والا اور اپنے گرد کوئی بناوٹی رکھ رکھاؤ رکھنے والا آدمی نہیں ہے بلکہ اس کے افکار عمل میں ڈھلنے کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ اور وہ پوری سادگی اور اخلاص لیکن گہرے فہم و تدبر سے اپنے کاموں کا نقشہ بنانے والا ہے۔ اس کے کردار میں کوئی سنسنی خیزی نہیں ہے۔ البتہ معاشرے کے بگاڑ کی اس انتہا میں اپنی زندگی کو اسلامی اخلاقی حدود میں بے تکلفی سے کس کر رکھنے کا ایک سادہ عمل انسان کو تحیر میں ضرور مبتلا کر دیتا ہے جس نظام فکر و اخلاق کو وہ دعوت اور تحریک کے طور پر لے کر اٹھے ہیں اس کے عملی نظام ہونے پر ان کی روز مرہ کی زندگی خود ایک جیتی جاگتی دلیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسی مثالیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں کہ اسلامی نظامِ حیات پر بعض اعتراضات و شبہات کا جواب اگر مجھ جیسے ایک عام آدمی نے دیا ہے تو بسا اوقات سائل کے دل کو تسکین اور شرح صدر حاصل نہیں ہوتی اور انہیں الفاظ میں مولانا مودودی نے جواب دے دیا ہے تو سائل دل سے پورے طور پر مطمئن ہو گیا ہے۔ یہ اطمینان جو ایک شخص کی زبان کے الفاظ ایک سائل کے دِل میں ٹھنڈک بن کر اتر جاتا ہے۔ دراصل اپنے اندر علمی اور لسانی فرق سے کہیں زیادہ قلب و نظر کی پاکیزگی اور فکر و عمل کی یکسانی سے پیدا ہوتا ہے۔

حق ہر شے سے بالا

جس راہِ سلوک کو طے کر کے انہوں نے اپنے مالک کے ساتھ ایک مخصوص تعلق پیدا کیا ہے۔ اس تعلق نے ان کے اندر احقاق حق اور ابطالِ باطل کی عزیمت کا جوہر پیدا کر دیا ہے۔ وہ چیزیں ہیں جن کا مطالعہ ان کے کام کو سمجھنے کے لئے مفید ہے۔ ان کا عملی کردار جو حق کے لئے سب کچھ سہہ جانے کا داعیہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور ان کی وہ راہِ سلوک اور اس کے کچھ خدوخال جس پر وہ چل کر اپنے مالکِ حقیقی سے اپنا تعلق استوار کرنا چاہتے ہیں۔ دعوتِ حق کے لئے ان کے داعیانہ کردار کی چند جھلکیاں ان کی بعض مختصر تحریروں سے نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔

"میرے برادرانِ دینی خواہ میری بات سنیں یا نہ سنیں، مگر میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ تمہارے لئے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے۔ کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا جو فرض ہے اسے

ادا کروں ۔"

دوسری جگہ لکھا ہے ۔

"میرے جرات آمیز الفاظ سے آپ کو شائد یہ گمان گذرا ہو گا کہ میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لئے کر رہا ہوں

——— اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے ۔۔۔۔"

اپنی اولاد کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے ۔

"میں اپنی اولاد کو عیش کے لئے نہیں پالنا چاہتا بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لئے پالنا چاہتا ہوں ۔۔۔۔"

اپنے انقلابی مشن کا علم اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں ۔

"میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں اور انہیں کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوند عالم سے علم صحیح اور عقل سلیم کے لئے دعا کروں ۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اس کام پر آمادہ کیا ہے جس کے دشوار گذار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف میری روح لرز اٹھتی ہے ۔ بہر حال خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر جن کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے ۔"

یہ کام وہ کس بے لاگ انداز میں کر رہے ہیں۔ اس کا ہلکا سا نقشہ اس اقتباس میں نظر آئے گا۔

"میرے نزدیک خدا کا دین اور اس کی امّتِ مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور ہر تعلق سے زیادہ قیمتی ہے اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز ہو، دوست ہو، استاد ہو یا میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملے میں کسی تعلق یا کسی نیاز مندی کی پروا کرنے سے میں بالکل معذور ہوں، جس کسی کو میرے اس طرزِ عمل سے تکلیف ہو وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا۔ تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا۔ خواہ وہ دنیوی اعتبار سے حقیر ترین آدمی ہو۔ اور اگر وہ مجرد شکایت کرے گا تو میں صاف عرض کر دوں گا کہ حق کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے اپنے اور پرائے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔"

پھر جس راہ میں انہوں نے قدم رکھا ہے اس میں جیل کے شب و روز اور پھانسی کے تختے بھی آجاتے ہیں، لیکن ان کی عزیمت بیماری میں معالج سے مشورے کی رعایت بھی ظالم سے طلب کرنا پسند نہیں کرتی۔

"آپ کا بالمشافہ معائنہ کر کے علاج تجویز کرنے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطورِ خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے

معالج سے شورہ پینے کی اجازت دے لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جو کچھ علاج آپ غائبانہ کر سکتے ہیں بس اسی پر اکتفا فرمائیں۔"

جیل کے اندر سے اپنی بوڑھی والدہ کو خط کے ذریعے تسلی دیتے ہوئے صورت حال سے آگاہ کرتے ہیں۔

"جس راستہ پر میں برسوں سے چل رہا تھا اس میں یہ منزل تو بہر حال آنی ہی تھی۔ حیرت اس کے آنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی تاخیر سے کیوں آئی۔ درحقیقت میں تو اس پر حیران ہوں کہ شیطان اور اس کی برادری نے مجھے اتنے دنوں برداشت کیسے کیا۔ بہر حال اب کہ وہ ادھر متوجہ ہو گئے ہیں۔ یہ امید نہ رکھیے کہ یہ کشمکش جلدی ختم ہو جائے گی۔ اب اس کا خاتمہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے یا میں ختم ہو جاؤں یا وہ اصلاح ہو کر رہے جس کے لئے میں پچھلے ۱۵ برسوں سے کام کرتا رہا ہوں۔ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیئے اور ہر بدتر سے بدتر نتیجہ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

کیا ان الفاظ کے پیچھے وہ کردار نہیں بول رہا ہے جو دنیا میں حق کی گواہی کو زندگی کا واحد نصب العین بنا کر اٹھا ہے اور جس کے لئے اس نے تن، من دھن کی بازی لگا دی ہوئی ہے۔ جس کے الفاظ میں حقیقت اور سچائی کا گہرا جذبہ

ہے جو خود سننے والے کو یقین دِلا دیتا ہے کہ یہ کوئی خاص آواز ہے جو بول رہی ہے اور اس کے پیچھے کوئی خاص اور عظیم کردار ہے جو کام کر رہا ہے۔

سلوکِ قرآنی

یہ کردار ایک خاص راہ پر چل کر اپنے مالک سے تعلق پیدا کر رہا ہے۔ اس راہ کو مولانا مودودیؒ "سلوکِ قرآنی" کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلق باللہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس کام پر دل و جان سے لگ جائے جس پر اس کے مالک نے اسے بندۂ مومن کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ اتباعِ رسولؐ کا راز اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ امتی وہی فریضہ انجام دے جو رسولِ کریمؐ نے انجام دیا اور اسی طرح انجام دے انہیں کے نقشِ قدم پر چلے۔ اسی طرح راہِ حق میں اقامتِ دین کی خاطر مصائب برداشت کرے جس طرح رسولِ کریمؐ نے برداشت کیے۔ پھر فہمِ قرآن کا اس سے بڑا نکتہ اور کوئی نہیں ہے کہ جو انقلابی کام قرآن نے انجام دیا اور اپنے لانیوالے کو جس انقلاب کی سربراہی پر مجبور کر دیا۔ طالبِ حق اسی انقلابی کام کو لے کر اٹھ کھڑا ہو۔ وہی جھنڈا بلند کرے۔ اسی علم کو تھامے۔ انہیں بدر و احد کے معرکوں میں جا گھسے انہیں دشمنانِ دین کے نیزوں کی نوکوں اور تلواروں کی دھاروں پر چل کر اپنے کام کو آگے بڑھائے۔ جب ایک بندۂ مومن یہ کچھ کرنے اور سہنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ تو سلوک کی بہت سی منازل خود بخود طے ہونے لگتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلوک کی فنّی اصطلاحات اور مخصوص اذکار و اشغال کا کوئی مرتب اور منضبط سلسلہ نہ ہو لیکن اللہ کی طرف بڑھنے اور اس کے دربار حق بندگی ادا کر دینے کا کام اسی طرح انجام پاتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے کلام کا فہم حاصل کرنے کے بارے میں مشورے

دیتے ہوئے تفہیم القرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشہ گوشہ سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیان حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جانگسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اسے تو آپ پوری طرح اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوتِ الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں

گے اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اوّلین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے جس کو میں سلوکِ قرآنی کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گذرتے جائیں گے۔ قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں۔ اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ ------- اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔"

تعلق باللہ ناپنے کا پیمانہ

مولانا کی اختیار کردہ اس راہِ سلوک پر چلتے ہوئے مالکِ حقیقی کے ساتھ جو تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اسے ناپنے۔ تولنے اور بڑھانے کے لئے جو طریقہ مولانا کے نزدیک کارگر ہے۔ اسے انہوں نے اپنی ایک تقریر "ھدایات" میں خود بیان فرمایا ہے،

"اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو خواب کی بشارتوں اور کشف و کرامات کے ظہور اور اندھیری کوٹھڑی میں انوار کے مشاہدے کا انتظار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے

اس تعلق کو ناپنے کا پیمانہ تو اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کے قلب میں ہی رکھ دیا ہے۔ آپ بیداری کی حالت میں اور دن کی روشنی میں ہر وقت اس کو ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کا اپنی مساعی کا اور اپنے جذبات کا جائزہ لیجئے۔ اپنا حساب آپ لے کر دیکھئے کہ ایمان لا کر اللہ سے بیع کا جو معاہدہ آپ کر چکے ہیں ـــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ـ اسے آپ کہاں تک نبھا رہے ہیں۔ اللہ کی امانتوں میں آپ کا تصرف ایک امین ہی کا سا تصرف ہے یا کچھ خیانت بھی پائی جاتی ہے آپ کے اوقات اور محنتوں اور قابلیتوں اور اموال کا کتنا حصّہ خدا کے کام میں جا رہا ہے۔ اور کتنا دوسرے کاموں میں! آپ کے اپنے مفاد اور جذبات پر چوٹ پڑے تو آپ کے غصّے اور بے کلی کا کیا حال ہوتا ہے اور جب خدا کے مقابلے میں بغاوت ہو رہی ہو تو اسے دیکھ کر آپ کے دل کی کڑھن اور آپ کے غضب اور بے چینی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ اور دوسرے بہت سے سوالات ہیں۔ جو آپ خود اپنے نفس سے کر سکتے ہیں اور اس کا جواب لے کر ہر روز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ سے آپ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں اور ہے تو کتنا ہے اور اس میں کمی ہو رہی ہے یا اضافہ ہو رہا ہے۔ رہیں بشارتیں اور کشوف و کرامات اور انوار و تجلیات تو آپ ان کے اکتساب کی فکر نہ کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مادی دنیا کے دھوکہ دینے والے مظاہر میں توحید کی حقیقت پا لینے سے بڑا کوئی کشف نہیں ہے شیطان اور اس کی ذریات کے دلائے ہوئے ڈراؤں اور لالچوں کے

مقابلے میں راہِ راست پر قائم رہنے سے بڑی کوئی کرامت نہیں ہے کفر و فسق اور ضلالت کے اندھیروں میں حق کی روشنی دیکھنے اور اس کا اتباع کرنے سے بڑا کوئی مشاہدۂ انوار نہیں ہے اور مومن کو اگر کوئی سب سے بڑی بشارت مل سکتی ہے تو وہ اللہ کو رب مان کر اس پر جم جانے اور ثابت قدمی کے ساتھ اس کی راہ پر چلنے سے ملتی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

تزکیہ نفس کا طریق کار

پھر اس راہِ سلوک میں ذاتی اصلاح تزکیۂ نفس اور سعیٔ خیر کے لئے جو طریق انہوں نے تجویز کیا ہے اسے مولانا محترم نے ایک رفیق کے نام اپنے ایک مکتوبِ زنداں میں بیان کیا ہے۔

"ان اخلاقی کمزوریوں کے تین علاج ہیں۔ ایک مخلص دوستوں کی دعائے خیر دوسرے صحبتِ خیر اور تیسرے خود اپنی سعیٔ خیر۔ دعائیں بھی آپ کے حق میں کرتا ہوں اور انشاء اللہ آپ کے دوسرے رفقاء بھی کریں گے۔ صحبت ایسے آدمیوں کی اختیار کیجئے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں اور ان لوگوں سے دور رہیئے جن کے اندر خدا سے بے خوفی کی علامات پائی جاتی ہوں۔ رہی تیسری چیز تو احتسابِ نفس سے زیادہ کارگر کوئی دوسری تدبیر اس مقصد کے لئے نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو ایک ایسی چیز عطا کی ہے

جو اس کو بُرے اور بھلے کا فرق بھی بتاتی ہے۔ برائی پر اسے ٹوکتی اور ملامت بھی کرتی ہے اور بھلائی کی طرف اس کو اکساتی بھی ہے۔ ہمارے قدیم لٹریچر میں اس کو نفسِ لوّامہ کہتے تھے موجودہ زمانے کی اصطلاح میں اس کو ضمیر کہتے ہیں۔ اگر انسان اس کو زندہ رکھے۔ اس کی ملامتوں پر توجہ کرے اور جس جس چیز پر وہ ملامت کرتا جائے اسے چھوڑنے کی اور جس جس چیز کے اختیار کرنے کی وہ ہدایت کرتا جائے۔ اسے اختیار کرنے کی کوشش کرتا رہے تو یوماً فیوماً اس کو ترقی ہو گی۔ لیکن اگر آدمی اس کو دبانے کی کوشش کرے اور جب وہ کسی برائی پر ٹوکے تو تاویلیں کر کر کے اسے خاموش کرتا رہے۔ اور اس کے تقاضوں کی خلاف ورزی کرتے کرتے اسے بالکل بے جان کر ڈالے تو پھر آدمی کا اخلاقی اور روحانی تنزل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسفل السافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن مجید میں فرمائی گئی ہے۔ کہ۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا پھر ضمیر بھی دو چیزوں کا محتاج ہے۔ ایک یہ کہ اس کو زیادہ سے زیادہ علم کی روشنی بہم پہنچائی جائے تاکہ وہ بھلائی اور برائی دونوں سے خوب واقف ہو۔ اس غرض کے لئے قرآن اور حدیث اور سیرت نبوی اور صالحین کی سیرتیں نہایت مفید ہیں۔ دوسرے یہ کہ آدمی اپنے ضمیر کو مقویات کھلاتا رہے اور اس کی مقویات ہیں فرض اور نفل نمازیں۔ فرض اور نفلی روزے۔ زکوٰۃ اور صدقات و خیرات اور بندگانِ خدا کی خدمت اور راہِ خدا میں عملاً دوڑ دھوپ۔ یہ مقویات

اس کو کھلاتے جائیے اور ترقی کے آسمانوں پر چڑھتے جائیے۔"

یہ وہ سیدھا سادھا طریق تزکیہ ہے جو مولانا مودودی اپنے لئے اور اپنے رفقاء کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔

راہِ سلوک کی کچھ مشکلات

لیکن اس راہِ سلوک کی کچھ خاص مشکلات بھی ہیں اور اس کے بعض مقامات پر آدمی ٹھٹک کر کھڑا رہ جاتا اور حیرانی و سرگشتگی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی چیز کو کسی صاحب نے مولانا کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ اقامتِ دین کا کام جتنا کچھ کٹھن اور اپنے تقاضوں کے لحاظ سے عظیم الشان ہے اس درجے کی قیادت ہم کہاں سے لا سکتے ہیں، جو صاحبِ وحی و الہام ہو۔ پھر اس کام کو انجام دینے والے وہ مخلص مجاہدین کی جماعت کہاں سے میسر آ سکتی ہے جیسی کہ صحابہ کرام کی جماعت تھی۔ ان کا سا معیارِ ایمان و اخلاص کہاں سے آ سکتا ہے۔ اگر ہم قرآن کے سیاسی نظریے پر کوئی گروہ منظم کر بھی لیں تو بھی اس میں وہ اخلاقی اور روحانی اسپرٹ کہاں سے پیدا ہو گی جو اسلامی نظامِ حیات کی صحیح نمائندگی کر سکے۔ مولانا مودودی نے اس رفیق کے خلجان اور حیرانی کا علاج تجویز کیا ہے اور ان شبہات و خیالات کو اقامتِ دین کی راہِ سلوک کے دھوکے قرار دیا ہے اور ایک تفصیلی گفتگو کے ذریعہ ان کی نشان دہی اور ان سے بچنے کی تدابیر بیان کر دی ہیں اسی مضمون کا ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے:-

اقامتِ دین کی راہِ سلوک کے دھوکے

"آپ کے اس خلجان کی ابتدا، غالباً اس مقام سے ہوتی ہے کہ آپ اقامتِ دین

کا جب تصور کرتے ہیں تو معاً آپ کے سامنے دورِ نبوت اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ آجاتا ہے اور اس خیال سے آپ کا دل بیٹھنے لگتا ہے کہ وہ عظیم رہنما اور وہ بے نظیر کارکن آج کہاں ہیں جن کے ہاتھوں یہ کام اس وقت ہوا تھا۔ آپ اپنے دل کا جائزہ لے کر تحقیق کیجیے کہ جب یہ سوال آپ کے دل میں ابھرتا ہے تو اس کے ساتھ کس قسم کے رجحانات آپ کے نفس کو اپنی طرف کھینچنا شروع کرتے ہیں۔ آپ گہرا جائزہ لیں گے تو نمایاں طور پر دو رجحانات کی کشش آپ کو خود محسوس ہوگی۔

ایک یہ کہ مایوس ہو جاؤ۔ اب نہ وہ رہنما اور وہ کارکن میسر آسکتے ہیں اور نہ یہ کام ہو سکے گا اس لیے بہتر یہ ہے کہ پورے دین کی اقامت کا تصور ہی چھوڑ دو۔ جو کام نہیں ہو سکتا اس کے پیچھے پڑنے سے کیا حاصل دین کی جزوی خدمات میں سے کوئی ایک خدمت اپنے ہاتھ میں لے لو اور جیسی کچھ بری بھلی بن آئے کرتے رہو۔ میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بناء پر کہتا ہوں کہ یہ اولین رجحان ہے جو اس مقام پر آدمی کے سامنے آتا ہے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ پہلا دھوکہ ہے جو شیطان ایک نیک نفس مسلمان کو دیتا ہے تاکہ وہ اقامتِ دین کے نصب العین سے کسی طرح باز آجائے اس لئے آگے ۔۔۔۔۔۔۔ کی کوئی بات سوچنے سے پہلے آپ کو چاہیئے کہ اس فریب کو اول قدم ہی پر پہچان لیں اور اگر آپ نیک نیت ہیں تو پورے شعور اور عزم کے ساتھ اپنے ذہن میں سے پہلے اس کا اچھی طرح قلع قمع کر دیں۔

دوسرا رجحان جو اس کے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ یہ کام ہے تو بے شک ضروری اور فرض مگر اس کے لئے رہنماؤں اور کارکنوں میں وہی دینی، روحانی و اخلاقی اوصاف درکار ہیں، جن کی بدولت عہدِ نبویؐ میں یہ کام ہوا تھا۔ لٰہذا پہلے ایسے بن جاؤ اور اس طرز کے آدمی بنالو، پھر اس کام میں لگو۔ یہ دوسرا دھوکا ہے جو پہلے دھوکے سے بچ نکلنے والے کو شیطان رجیم دیا کرتا ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ یہ شخص اس نصب العین پر جم گیا ہے اور اس سے ہٹنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تو پھر وہ اس کو فکر کی بجائے تدبیر کی ایک غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ بےشک دریا پار تو جس منزل کی طرف جانا چاہتا ہے وہ ہے تو منزلِ مقصود ہی مگر بے وقوف تیرنا سیکھے بغیر دریا میں اترے گا۔ پہلے دریا سے باہر خشکی پر تیرنے کی مشق اچھی طرح کرلے۔ پھر دریا میں قدم رکھ۔ اس طرح وہ ناصح مشفق آدمی کو واقعی بے وقوف بنا دیتا ہے اور جو لوگ اس کے داؤں سے مات کھا جاتے ہیں۔ وہ سب نہ صرف خود خشکی پر تیراکی کی مشق شروع کر دیتے ہیں بلکہ جن لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہتے ہیں۔ ان کو بھی خشکی کا تیراک بناتے ہیں خوب مہارتِ فن دکھاتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ماہرینِ فن کو اکثر تو عمر بھر دریا میں اترنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی اور اگر کبھی اتر جاتے ہیں تو زمین پاؤں تلے سے نکلتے ہی یا غرق ہو جاتے ہیں یا دریا کے بہاؤ پر بہہ نکلتے ہیں۔ کیونکہ دریا سے باہر خشکی پر تیراکی میں جو کمال پیدا کیا جاتا ہے وہ

دریا کی روانی سے پہلا سابقہ پڑتے ہی کالعدم ہو جاتا ہے۔

ان دونوں رجحانات کی غلطی کو اگر آدمی آغاز میں ہی محسوس کرے تو وہ اس طریق تزکیہ و تربیت کو آپ سے آپ ترجیح دے گا۔ جسے ہم نے ترجیح دی ہے لیکن اس راہ پر چند قدم چلتے ہی یکے بعد دیگرے کچھ دوراہے ایسے آتے ہیں جن میں سے ہر ایک پر پہنچ کر آدمی کا دل چاہتا ہے کہ دائیں یا بائیں مڑ جائے اور اگر وہ نہ مڑے۔ تب بھی آگے چلتے ہوئے بار بار اس کے دل میں ایک کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے کسی موڑ پر کیوں نہ مڑ گیا۔ بلکہ بسا اوقات یہاں تک جی چاہنے لگتا ہے کہ پلٹے اور انہیں میں سے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ آپ ذرا اپنے ذہن میں اپنا سفر آغاز سے شروع کریں اور ان میں سے ہر ایک موڑ کی کشش محسوس کر کے ذرا اس کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ اُدھر کیا ہے اور کیا چیز اس کی طرف مائل کرتی ہے۔ ایک موڑ آتا ہے جب آدمی کے دل میں بار بار یہ خیال چٹکیاں لیتا ہے کہ اس کام کے لئے بہرحال تزکیہ نفس ضروری ہے اور تزکیہ نفس کے وہ طریقے جو پچھلے ادوار میں اختیار کیے گئے تھے۔ کچھ واضح اور منضبط نہیں ہیں اور بعد کے ادوار میں جن بزرگوں نے ان طریقوں کو منضبط کیا وہ صوفیائے کرام ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ سب بزرگانِ دین ہی ہیں لہٰذا اس کام کے لئے جو تزکیہ مطلوب ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے تصوف کے معروف طریقوں میں سے کسی کو اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ سنے مطرز کے لوگوں میں تو شائد کم ہوں۔ مگر مذہبی خاندانوں

میں جن لوگوں نے آنکھیں کھولی ہیں ان سب کو اس موڑ کی کشش کم و بیش متاثر کرتی ہے۔ میں ان سب لوگوں سے جو اس کشش کو محسوس کرتے ہیں، عرض کرتا ہوں کہ براہِ کرم اس مقام پر ٹھہر کر خوب اچھی طرح غور و تحقیق کریں۔ اور ذرا بے لاگ طریقے سے کریں۔ کیا واقعی کہیں صوفیانہ لٹریچر میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اقامتِ دین اپنے وسیع و جامع تصور کے ساتھ ان بزرگوں کے پیشِ نظر تھی۔ جن سے یہ صوفیانہ طریقے ماثور ہیں۔ کیا کہیں اس بات کا پتہ نشان ملتا ہے کہ اسی راستہ کے لئے کارکن تیار کرنے کی غرض سے انہوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا تھا؟ کیا ان طریقوں سے تیار کئے ہوئے آدمیوں نے کبھی یہ کام کیا ہے؟ اور کیا ہے تو کیا یہ طریقے اس کام میں مفید ثابت ہوئے ہیں؟

اگر کوئی شخص تحقیق میں بے جا عقیدتوں اور موروثی تعصبات کو دخل نہ دے گا اور ٹھنڈے دل سے بے لاگ تحقیق کرے گا۔ تو اسے اس معاملہ میں پورا اطمینان ہو جائے گا کہ اقامتِ دین کے لئے ہمیں اسی طریق تزکیہ پر اعتماد کرنا ہوگا جو قرآن اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ملتا ہے وہ اگر منضبط نہیں ہے تو اب اسے منضبط کرنا چاہیئے۔

اس موڑ کو جو شخص پورے اطمینان کے ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے اسے ذرا آگے چل کر ایک اور مقام پر حیرانی پیش آتی ہے۔ سیرت نگاروں نے عہدِ صحابہ کی شخصیتوں کے جو مرقعے کھینچے ہیں۔ وہ اس کی نگاہ میں گھومنے لگتے ہیں اور یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا ہے کہ ان کتابی مرقعوں سے ملتی جلتی

شخصیتیں تو کہیں نظر نہیں آتیں۔ پھر بھلا یہ کام کیسے ہو گا۔ اس مقام پر آدمی ہر طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کہاں کوئی راستہ ملتا ہے جدھر جا کر اپنی مطلوب شخصیتیں پا سکوں اور بسا اوقات شیطان یہاں بھی اس کو مشورہ دیتا ہے کہ بس اس جگہ سے پیچھے مڑ جاؤ یا مایوس ہو کر یہیں بیٹھ جاؤ۔ اس مرحلے پر بھی ٹھہر کر آدمی کو اچھی طرح غور کرنا چاہیئے اور ٹھنڈے دل سے تحقیق کر کے ایک رائے قائم کرنی چاہیئے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ عرض کرتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی حیرانی و پریشانی آدمی کو لاحق ہوتی ہے۔ دو حقیقتوں سے غفلت کی بنا پر ہوتی ہے۔ وہ دو حقیقتیں اگر اس کی سمجھ میں آجائیں۔ تو قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور آگے کا راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ جن شخصیتوں کے نمونے وہ تلاش کر رہا ہے وہ شخصیتیں نہ ایک دن میں بنی تھیں اور نہ آپ ہی آپ بن گئی تھیں۔ وہ بنانے سے ہی بنی تھیں۔ سالہا سال میں بنی تھیں اور اگر بے لاگ تحقیق سے کام لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ گوشہ ہائے عزلت میں نہیں بنی تھیں بلکہ قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق اقامت دین کی جدوجہد میں لگ جانے اور جاہلیت کے خلاف کشمکش کرنے سے ہی بتدریج بن سنور کر وہ اس مرتبے پر پہنچی تھیں، جسے آپ سیرت کی کتابوں میں دیکھ دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ شخصیت سازی کے اسی طریقے کی پیروی کرنے سے وہی نتائج حاصل نہ ہوں اس درجے کے نتائج نہ سہی۔ اس طرز اور اس نوعیت کے نتائج تو یقیناً حاصل ہونے

ہی چاہئیں بلکہ ٹھیک صبر سے کام لے کر اس طریقے کی پیروی کی جائے اور حکمت و تفقہ کے ساتھ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کی جائے۔

دوسری حقیقت جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ پریشانی لاحق ہوتی ہے یہ ہے کہ کتابی شخصیتیں واقعی شخصیتوں سے اچھی خاصی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک گذرے ہوئے زمانے کے جو نقشے صفحۂ قرطاس پر کھینچے جا سکتے ہیں، گوشت پوست کی دنیا میں بعینہٖ وہ نقشے کبھی پیدا نہیں کئے جا سکتے لہٰذا جس شخص کو خیالی دنیا میں نہ رہنا ہو بلکہ واقعی دنیا میں کچھ کرنا ہو اسے اس خیالِ خام میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے کہ گوشت پوست کے انسان کبھی بشری کمزوریوں سے بالکل منزہ اور تمام مثالی کمالات کا مرقع بن سکیں گے۔ آپ حدِ کمال کو نگاہوں سے اوجھل تو نہ ہونے دیں اور اس تک خود پہنچنے اور دوسروں کو پہنچانے کی کوششیں بھی جاری رکھیں مگر جبکہ آپ کو عملاً خدا کی راہ میں کام کرنا اور ہزارہا آدمیوں سے کام لینا ہو تو قرآن و سنت کے مطابق دین کے تقاضوں اور مطالبات کی ایک حدِ اوسط آپ کو نگاہ میں رکھنی پڑے گی جس پر آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا قائم ہو جانا راہِ خدا میں کام کرنے کے لئے کافی ہو اور جس سے نیچے گِر جانا قابلِ برداشت نہ ہو، اور حدِ اوسط خود ساختہ نہ ہونی چاہیئے۔ اس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہی ہونی چاہیئے۔ لیکن بہرحال اس حد کو سمجھنا اور نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی عملی کام آدمی نہیں کر سکتا۔ صدرِ اوّل میں جن لوگوں سے خدا کا کام لیا گیا تھا وہ سب ہی یکساں نہ تھے اور نہ ان میں سے کوئی

بشری کمزوریوں سے مبرّا تھا۔ آج بھی جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوگا وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک نہ ہوں گے۔ یہ خوبی نظام جماعت میں ہونی چاہیئے کہ وہ مجموعی طور پر ایک صالح اور حکیمانہ نظام ہو۔ اور اس کے اندر یہ استعداد بھی موجود ہو کہ افراد اس میں شامل ہو کر دین حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں اور ان کی کمزوریاں بروئے کار آنے کے کم سے کم مواقع پائیں۔

ان سب الجھنوں سے بچ نکلنے کے بعد پھر بھی آدمی کے دل میں یہ خلجان باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے جن رفقاء کے ساتھ وہ اقامت دین کا کام کر رہا ہے وہ معیار مطلوب سے بہت کم ہیں، اور ان کے اندر بہت سے پہلوؤں میں ابھی بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ اس خلجان سے میں نے کسی رفیق کو بھی خالی نہیں پایا ہے اور میں خود بھی اس سے خالی نہیں ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ خلجان ہمیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خامیاں دور کرنے پر اکساتا ہے اور ان صحیح ذرائع و وسائل کی تلاش اور اس کے استعمال پر آمادہ کرتا ہے جن سے یہ خامیاں دور ہوں تو مبارک ہے یہ خلجان۔ اسے مٹنا نہیں اور بڑھنا چاہیئے کیونکہ ہماری ساری اخلاقی و روحانی ترقی کا انحصار اسی خلجان کی پیدا کی ہوئی خلش پر ہے۔ جس روز یہ مٹا اور ہم اپنی جگہ مطمئن ہو گئے کہ جو کچھ ہمیں بننا تھا وہ ہم بن چکے ہیں، اسی روز ہماری ترقی بند ہو جائے گی۔ اور ہمارا تنزل شروع ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ خلجان ہمیں مایوسی اور فرار پر آمادہ کرتا ہو تو یہ خلجان نہیں وسوسۂ شیطان ہے جب بھی اس کی کھٹک محسوس ہو تو

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھئے اور اپنے کام میں لگ جائیے۔ اگر آپ واقعی خدا کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ ایسے وساوس سے دل کو پاک کئے بغیر آپ کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس وقت شیطان کے لئے اس سے زیادہ مرغوب کوئی کام نہیں ہے کہ آپ کے سامنے تحریک اسلامی کی ہر خوبی کو بے قدر اور بے وزن کر کے پیش کرے اور اس کی یا اس کے افراد کی ہر کمزوری کو بڑھا چڑھا کر دکھائے تاکہ آپ کسی صورت دل چھوڑ بیٹھیں"۔ (ترجمان القرآن صفحہ ۱۷۱ نومبر ۱۹۵۱ء)

سیدھی اور مستقیم راہ

یہ وہ اقامتِ دین کی سیدھی اور مستقیم راہِ سلوک ہے جس پر مولینا مودودی برسوں سے خود چل رہے ہیں اور بے شمار بندگانِ خدا ان سے استفادہ کر کے اس راہ پر چل رہے ہیں۔ ان چلنے والوں کے مختلف مقامات اور مختلف قلبی اور ذہنی کیفیات ہیں۔ ان سب کے سامنے مولانا نے اس راہ کی مختلف مشکلات کی وضاحت اور مختلف پیچیدہ مقامات اور دھوکہ دینے والے مظاہر اور رہزنوں کی نشان دہی کر کے ان کا علاج بھی تجویز کر دیا ہے۔ یہ وہی راہِ سلوک ہے جس پر فنّی اصطلاحات کی گرانباری اور منضبط اصول و قواعد کی قید و بندش کے بغیر ہی حضورؐ اور آپ کے رفقاء نے چل کر اللہ کا کام سرانجام دیا تھا اور اس کام کو سرانجام دینے کے لئے مولانا بھی ایک طویل عرصے سے سرگرم عمل ہیں۔ اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہونا۔ اس کے رسولِ پاک کے اسوہ کے احترام و اطاعت کا قوی ترین جذبہ لے کر اپنے آپ پر تزکیۂ نفس کی پابندی اور کبائر سے اجتناب کا پہرہ لگا دینا۔ ساری عمر کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقام پر کھڑے

ہو کر گزار دینے کا عہد کر لینا اور اس راہ میں تن، من، دھن سب کچھ کھپا دینے کا عزم کر کے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا، اللہ کی راہ میں اس کے دیئے ہوئے سارے سرمائے کو لٹا کر اس سے آخرت کے اجر کی توقع باندھنا اور کسی قسم کے کبر و ریا کے بغیر بندگانِ خدا کی تعریف و خدمت سے بے نیاز ہو کر دیوانہ وار اس راہ پر گامزن رہنا اور اس راہ میں جان تک دینے کی تمنائیں دل میں پالنا اور پرورش کرنا۔ بس اقامتِ دین کی راہِ سلوک کے یہی خد و خال اور نشانات ہیں۔ اور ان خد و خال کی راہ پر چلنے والے راہرو کے لیے کسی کو یہ اطمینان دلانا تو شاید مشکل ہو کہ وہ فنی اور اصطلاحی تصوف کے آداب و مدارج کا بھی پورا اہتمام کر رہا ہے یا نہیں البتہ اس کا قلب یہ گواہی ضرور دے سکتا ہے کہ یہ راہِ سلوک دنیا اور آخرت میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے

۱۰

مکاتیب کے آئینے میں

آدمی کے مکاتیب اس کے اندر کے انسان کو نہایت عمدگی سے بے نقاب کرتے ہیں اور جس آسانی سے کوئی شخص اپنے مکاتیب میں اپنے دل و دماغ کو کھول کر رکھ دیتا ہے اتنی آسانی سے وہ اپنے دیگر مضامین علم و ادب میں نہیں کھلتا ہے اسی لئے کسی شخص کے پرائیویٹ مکاتیب اس کی ذات اور شخصیت کا بہترین آئینہ ہوتے ہیں جس میں اس کے دل و دماغ جذبات، خیالات اور ذات کی مختلف جزیات کو بڑی آسانی سے دیکھا پرکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔

اسی لئے میں نے مولانا مودودی کے چند مکاتیب کو یہاں خصوصی طور پر شامل کر لیا ہے مولانا نے مکاتیب تو ہزاروں لکھے ہیں اس لئے کہ انہیں دنیا کے مختلف گوشوں سے اور خصوصاً ملک کے اطراف و جوانب سے بیسیوں خطوط، سوالات، اعتراضات، استفسارات روزانہ ہی آتے رہتے ہیں، جو ہر نوعیت اور علم و ادب کے ہر گوشے سے متعلق ہوتے ہیں، اور مولانا کا خط و کتابت کا کام غالباً دوسرے سب کاموں سے زیادہ وسیع ہے جو انہیں بے حد مصروف رکھتا ہے ان کے اکثر وہ مکاتیب جو مختلف علمی، دینی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تنظیمی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں اب تک رسائل و مسائل کے نام سے دو مجموعوں کی شکل میں مرتب بھی ہو چکے ہیں جن میں ان کے وسیع علم کا ہر گوشہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسائل

کو کتنی حکمت اور عمدگی سے اپنے دل نشیں استدلال سے مطمئن کرنے کا بہترین سلیقہ اور ملکہ رکھتے ہیں لیکن میں نے ان کے یہاں صرف چند وہ مکاتیب لئے ہیں جو اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے نہایت اہم بھی ہیں اور نایاب بھی۔

مکتوب نمبر ۱، ۲، ۳ ان کے تصور دین پر نہایت اختصار اور جامع انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ ۳ اور ۴ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے نایاب ہیں اور مولانا کی سیاسی بصیرت پر ایسے گواہ ہیں جنہوں نے گویا زمانہ گزرنے کے بعد اس بصیرت کی روشنی میں بیان کئے ہوئے لفظ لفظ کو سچ کر دکھایا ہے۔ مکتوب نمبر ۶ سے ۱۰ پاکستان جیل میں سے مختلف حضرات کے نام لکھے گئے ہیں لیکن جن کا موضوع حالات کے پیش نظر بیشتر جبر و استبداد ہے۔ خصوصاً جو خط چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کے نام قید بلا مقدمہ کے موضوع پر لکھا گیا ہے وہ تو اپنے استدلال اور حق گوئی کے اعتبار سے اعلائے کلمۃ الحق کی بہترین مثال ہے۔ مکتوب نمبر ۱۱ جماعت اسلامی کی داخلی تاریخ کا ایک اہم باب ہے جس کا ذکر روداد جماعت حصہ اوّل میں بھی آیا ہے لیکن مکتوب الیہ کے تقاضوں کے پیش نظر وہ شائع نہ ہوا تھا۔ اب یہ شائع ہوا ہے تو اپنے اندر دین کے لئے کام کرنے اور اس کے لئے مردان کار کی فراہمی موجود اسباب و وسائل کے استعمال اور مختلف مراحل کے بارے میں ایسے ایسے پر حکمت نفسیاتی نکات بیان کرتا ہے کہ مجرد اس کا مطالعہ ہی آدمی کے دل و دماغ کو اقامت دین کی جدوجہد میں یکسو ہو کر لگا دینے کے لئے کافی ہے۔ مکتوب نمبر ۱۲ مولانا مودودی اور علامہ اقبال کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے اور اس کے لئے ہم ادارہ چراغ راہ کے توسط سے ادارہ چٹان کے بھی ممنون ہیں۔ مکتوب نمبر ۱۳ فسادات

جبل پور میں بھارتی مسلمانوں کے قتل عام پر تبصرہ اور اس پر عربوں کی طرف سے خاموشی پر اظہار رنج وغم ہے۔ یہ خط محترم محمد احمد باشمیل سیکرٹری ہئیت امر بالمعروف مکہ معظمہ کے نام لکھا گیا تھا جس کا بہت پُرجوش جواب موصوف نے دیا اور اپنے طور پر عربی پریس میں حادثہ جبل پور پر رنج و افسوس کا اظہار اور عربوں کو غیرت دلانے کی کوشش بھی کی اور ساتھ میں عرب نیشنلزم جو غیر عرب مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس کی مذمت بھی کی گئی۔ آخری خط اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں مولانا نے اپنے ایک عزیز دنیق کو مطالعے کے لیے چند مشورے جیل میں سے ارسال کئے ہیں۔ ان مشوروں سے ہر تعلیم یافتہ نوجوان استفادہ کر سکتا ہے۔

اچھرہ لاہور
۱۱ مارچ ۱۹۴۹ء

محترمی و مکرّمی! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اگرچہ آپ کے ارشادات جواب طلب نہ تھے لیکن چونکہ آپ نے لفافہ بھیجنے کی تکلیف گوارہ فرمائی ہے اس لئے چند سطور لکھے دیتا ہوں ہر آدمی کے لئے اس کا فرض اسی سرزمین پر عائد ہوتا ہے، جہاں وہ پیدا ہوا ہو اور قیام رکھتا ہو اور دوسری جگہ اس کا جانا اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی پیدائشی سرزمین میں اپنا فرض ادا نہ کر سکتا ہو۔ اس کے علاوہ ہر

آدمی کے لئے فطری طور پر میدانِ عمل ہوتا ہی اس کا اپنا وطن ہے جہاں کی زبان عادات خصائل سب سے وہ پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ اب اگر یہ زمین سنگلاخ ہو تو اسے کوشش کر کے دیکھ لینا چاہیئے کہ وہاں کوئی بیج جڑ پکڑ سکتا ہے۔ یا نہیں اگر کوشش کے بعد مایوسی ہو جائے تو دوسری مناسب سرزمین تلاش کرنا درست ہے۔

انتخابات کے متعلق آپ نے جو بات تحریر فرمائی ہے آپ اس کے سوا کچھ اور فرما بھی نہیں سکتے تھے! کیونکہ آپ کے لیے یہ معلوم کرنے کا کہ اسلام کی اصولی تعلیمات کا ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل سے کیا تعلق ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آپ بڑے بڑے علماء کی طرف دیکھیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن اسے میری بدقسمتی سمجھئے یا خوش قسمتی۔۔۔ کہ میں اپنا دین معلوم کرنے کے لئے چھوٹے یا بڑے علماء کی طرف دیکھنے کا محتاج نہیں ہوں! بلکہ خود خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت سے یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ دین کے اصول کیا ہیں اور یہ بھی تحقیق کر سکتا ہوں کہ اس ملک میں جو لوگ دین کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں وہ کسی خاص مسئلہ میں صحیح مسلک اختیار کر رہے ہیں۔ یا غلط۔ اس لئے میں اپنی جگہ مجبور ہوں کہ جو کچھ قرآن اور سنّت سے حق پاؤں اسے حق سمجھوں بھی اور اس کا اظہار بھی کر دوں۔ آپ جو حق کو جاننے کے لئے دوسروں کے محتاج ہیں۔ آپ کے لئے یہ تجربہ کسی نہ کسی طرح درست ہو بھی سکتا ہے کہ جن علماء کو آپ معیارِ حق سمجھتے ہیں ان کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلیں۔ لیکن آپ کے لئے یہ آخر کس طرح درست ہو گیا کہ جو اپنی آنکھوں راستہ دیکھنے کی قوت رکھتا ہے۔ اس سے بھی آپ یہ مطالبہ کریں۔ کہ وہ کسی دستگیر

کا محتاج نابینا بن کر چلے یا اپنی بینائی کو آپ کی خاطر جھٹلائے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

بنام علی سفیان۔ لاہور

○

لاہور

۱۶ اپریل ۱۹۶۰ء

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم

آپ ان معترض مولوی صاحب سے کہیئے کہ عبادت اور اطاعت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بلکہ عبادت اصل ہے اور اس کی بہت سی فرعیں ہیں جن میں ذکر دعا، تسبیح، تحمید اور اطاعت سب شامل ہیں۔ قرآن میں اگر اطاعت کا الگ ذکر کیا گیا ہے اور اسی بنا پر آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اطاعت، عبادت سے الگ ایک مستقل چیز ہے تو اسی طرح قرآن میں ذکر، دعا اور تسبیح و تحمید وغیرہ کا بھی الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ پھر کیا آپ ان چیزوں کو بھی عبادت سے جدا مستقل مفہومات قرار دیں گے؟ قرآن کا تو قاعدہ ہی ہے کہ کہیں وہ ایک چیز کو مجمل بیان کرتا ہے اور کہیں دوسرے مقامات پر اس کی تفصیلات الگ الگ بیان کر دیتا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ ہی کو لے لیجیئے۔ کہیں اس کو صلوٰۃ کہا گیا ہے کہیں ذکر۔۔۔۔

کہیں رکوع، کہیں سجود، کہیں قیام، کہیں تسبیح۔ کیا اس سے آپ یہ مطلب لیں گے کہ صلوٰۃ الگ ایک چیز ہے اور یہ باقی پانچ چیزیں الگ الگ مستقل عبادتیں ہیں؟ اگر نہیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ باقی پانچوں چیزیں اسی جامع لفظ صلوٰۃ کی تشریحات ہیں اور اس طرح آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس کو قرآن معبود قرار دیتا ہے اس کو حاکم، بادشاہ، مطاع، مستعان، مسجود سب کچھ قرار دیتا ہے اور ان میں سے جس حیثیت میں بھی کسی دوسرے کو خدا کا شریک قرار دیا جائے، وہ شرک فی العبادت ہوگا

سورۂ ناس پڑھئے، پہلے ہی ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ، یہاں خدا ہی رب ہے، وہی بادشاہ ہے وہی اِلٰہ ہے اگر کوئی انسان بادشاہ ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے تو وہ رب اور اللہ ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے اگر کوئی شخص کسی انسان کی بادشاہی تسلیم کرتا ہے تو وہ شرک فی الربوبیت اور شرک فی الالوہیت کرتا ہے۔

سورۂ یوسف میں دیکھئے، جو لوگ فرمانروائے مصر کو اپنا بادشاہ مانتے تھے حضرت یوسفؑ ان سے خطاب کر کے جگہ جگہ اس فرمانروا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

اما احدکما فیسقی ربہٗ خمرا	تم میں سے ایک اپنے رب کو شراب پلائیگا
اذکرنی عند ربك	ارجع الی ربك
اپنے رب سے میرا ذکر کرنا	اپنے رب کے پاس واپس جاؤ

اس کے مقابلہ میں وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جگہ جگہ ربّی (میرا رب)، کے ساتھ کرتے ہیں یعنی تمہارا رب، وہ انسان ہے اور میرا رب اللہ ہے۔ پھر قید خانہ کے ساتھیوں کو جو شاہ مصر کے مطیع اور اس کے تابع تھے۔ اپنا دین ان الفاظ میں سمجھاتے ہیں

یاصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار ما تعبدون من دونہ الاسماء سمیتموھا انتم وآباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطٰن ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالک الدین القیم

اے زنداں کے ساتھیو! بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اکیلا اللہ بہتر ہے جو سب پر قہر و غلبہ رکھنے والا ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کرتے ہو وہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں (یعنی وہ حقیقت میں نہ رب ہیں نہ ملک نہ الٰہ) اللہ نے ان کے لئے کوئی سلطان (AUTHORITY) نہیں نازل کی ہے حکم تو صرف اللہ کے لیے ہے اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور یہی سیدھا صحیح دین ہے۔

یہاں آپ دیکھ لیجئے کہ رب کا صاف مفہوم حاکم ہے کسی کا حکم ماننا ہی اس کی عبادت کرنا ہے اور یہی مطلب اس کو رب ماننے کا بھی ہے۔ اسلام کی تعلیم کا مدعا یہی ہے کہ تمام متفرق ارباب کو چھوڑ کر اللہ واحد قہار کو رب مانا جائے اور اس کو رب ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے سوا کسی کو حاکم تسلیم نہ کیا جائے اور اس کے حکم کے آگے سر جھکا دینا ہی اس کی عبادت ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ یہی سیدھا اور صحیح دین ہے اور اس کے مقابلہ میں ٹیڑھا اور غلط دین کیا ہے؟ خدا کے سوا کسی دوسرے قانون و آئین کی اطاعت کرنا۔ کیونکہ آگے چل کر شاہ مصر کے قانون کو بھی دین کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی سورۂ یوسف کے نویں رکوع میں ہے۔

ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک " یوسف اپنے بھائی کو اس

بادشاہ کے دین (یعنی اس کے قانون) کی رُو سے نہیں پکڑ سکتے تھے"۔

دیکھ لیجیے! اس بادشاہ کا قانون "دین الملک" ہے۔ اور اللہ کا حکم "دین اللہ" ہے۔ مولوی صاحب کی خدمت میں، میری طرف سے عرض کر دیجیے کہ آپ لوگوں نے عبادت کے مفہوم کو پوجا پاٹ میں محدود کر کے اور اطاعت کو عبادت سے الگ کر کے ہی مسلمانوں کے لیے غیر اللہ کی بندگی کا دروازہ کھولا ہے۔ براہ کرم اپنی اس غلطی کو سمجھیے اور اس کی تلافی کیجیے کہ ایک دن مالکِ یَوْمِ الدِّین کے سامنے جانا ہے اور وہاں پوچھا جانے والا ہے کہ لمن الملک الیوم؟ دنیا میں تو تم نے دوسروں کی بادشاہی مان لی، مگر آج بتاؤ کہ کس کی بادشاہی ہے؟

خاکسار

ابوالاعلیٰ

بنام چوہدری علی احمد خان پھلور

O

لاہور
یکم ستمبر ۱۹۴۰ء

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم

جس بے چینی کا آپ ذکر کرتے ہیں یہ ایمان کی زندگی کی علامت ہے اسے بڑھنے دیجئے۔ اس کو روکنے کی دو صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ آپ تاویلیں کر کے اپنے دل کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں اور رفتہ رفتہ اسے ان حالات سے موافقت کرنے پر راضی کر لیں جن میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پاکر وہ بے چین ہوتا ہے دوسرے یہ کہ قبل از وقت اُن حالات سے نکل جائیں جن کے خلاف دل بغاوت کر رہا ہے، یہ دونوں صورتیں مصنوعی ہیں۔ پہلی صورت اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایمان میں جو زندگی پیدا ہو رہی ہے وہ موت سے بدل جائے گی۔

دوسری صورت اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فوری جذبہ کے تحت عمل کرنے سے فوری تسکین تو ہو جائے گی مگر جب مخالف گروہ کا Hard Reaction سے سابقہ پڑے گا اور اس وقت دوسری قسم کی سخت تکلیفیں پہنچیں گی تو مسرت اور اطمینان کے بجائے پشیمانی کا جذبہ پیدا ہونے لگے گا کیونکہ ایمان کے پختگی تک پہنچنے سے پہلے اقدام کیا گیا تھا۔ اس صورت میں بسا اوقات پشیمانی کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اپنے ایمان لانے پر بھی پشیمان ہونے لگتا ہے خدا اس حالت سے بچائے لہٰذا میں آپ کو ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار

کرنے کا مشورہ نہ دوں گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اس بے چینی کو اس کی فطری رفتار کے ساتھ بڑھنے دیں۔ یہاں تک کہ جب وہ بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ جائے کہ آگ میں ڈال دیا جانا بھی آپ کو اس زندگی کی بہ نسبت عزیز تر معلوم ہونے لگے۔ جو غیر اسلامی اصول پر بسر ہوتی ہو تب اپنے ضمیر کے فتوے پر عمل کریں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آپ ہر اس کام کو اپنے لئے خوشگوار پائیں گے۔ ہر اس حالت میں پوری خوشی محسوس کریں گے جس کے اندر ایمان کی سلامتی ہو۔ بلا لحاظ اس سے کہ جسم و جان کا اس میں کتنا ہی زیاں ہو۔ اس وقت آپ کو کامل سکون و اطمینان حاصل ہو گا جو کچھ بھی آپ کریں گے قلب کے پورے اطمینان کے ساتھ کریں گے اور خواہ کتنی ہی تکلیفیں آپ کو پہنچیں۔ کبھی آپ کے دل میں اس بات پر پشیمانی راہ نہ پا سکے گی کہ ایسا راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ نہ کبھی مصائب سے بھری ہوئی اسلامی زندگی کو آسائش سے بھری ہوئی غیر اسلامی زندگی سے بدلنے کا خیال تک آپ کے دل میں آ سکے گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

بنام چوہدری علی احمد خان پھلور

لاہور
۱۹۳۹ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ ملا۔ الحمدللہ کہ بخیر ہوں۔ فتنہ خاکسار بجز اس کے کہ مسلمانوں کی بدقسمتی کا ایک نشان ہے اور کچھ نہیں۔ جو قوم اپنے دین سے جاہل ہو۔ اور جس کا ذہن بالکل پراگندہ ہو چکا ہو، اور جس میں حق اور باطل کی کوئی تمیز باقی نہ رہی ہو حتیٰ کہ جس کا معیار آدمیت بھی حد سے زیادہ پست ہو چکا ہو۔ صرف ایسی ہی قوم میں اس قسم کی تحریکیں فروغ پا سکتی ہیں۔ مشرقی صاحب کی پرائیویٹ زندگی سے بحث نہیں۔ پبلک زندگی میں وہ جھوٹے اور بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ سخت غیر مدبر آدمی ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی اصول نہیں۔ کئی لاکھ مسلمانوں کا لیڈر رہنے کے باوجود جو شخص علی الاعلان جھوٹ

لہ ۱۹۳۸ء میں ایک صاحب نے کانپور سے مولینا ابوالاعلیٰ مودودی سے خاکسار تحریک اور اس میں شمولیت سے متعلق استفسار کیا جس کے جواب میں مولینا نے یہ مکتوب لکھا جسے اس وقت کے کئی اسلامی جرائد نے شائع کیا۔ اگرچہ موجودہ حالات میں جب خاکسار تحریک موجود نہیں ہے اسکی اشاعت بظاہر بے وقت معلوم ہوتی ہے لیکن اس خط میں مولینا نے جس اعلیٰ درجے کی بصیرت کے ساتھ اس تحریک کا تجزیہ کیا ہے اور اس تجزیے کے لفظ لفظ کی صداقت پر جس طرح آنے والے حالات نے گواہی دی ہے، یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا ایک دردناک اور حیرت انگیز باب ہے جس کا مطالعہ کسی صورت بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ (ا۔ گ) (فراہم کردہ محبوب شاہ ہاشمی، سرگودھا)

ہوئے ہو جو خود اپنی تحریر سے انکار کر جاتے ۔ جو معافی مانگ کر رہائی حاصل کرے اور پھر اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے اپنے عہد کو توڑ دے ، جو یوپی گورنمنٹ کے دباؤ سے بچنے کے لئے ۵۰ ہزار مسلمانوں کی خدمات بے تکلف انگریزی فوج کے لئے پیش کر دے ۔ ایسے شخص کی قیادت اگر مسلمان تسلیم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نام نہاد مسلمان اب اخلاقی تنزل کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں اور جس قوم کا معیار اخلاق اتنا پست ہو جاتا ہے ۔ اس کے حق میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کبھی دنیا میں ایک باعزت قوم کا مرتبہ حاصل کر سکے گی ۔ مشرقی صاحب کے طرز تحریر کو دیکھئے تو اتنا پایہ شرافت سے گرا ہوا ہے کہ مسلمان تو درکنار ، ہر شریف آدمی کی طبیعت اس کو دیکھ کر نفرت کرے گی ۔ انہوں نے پبلک کو دھوکہ دینے اور جھوٹ بول بول کر لوگوں کو مسحور کرنے کے جو ڈھونگ اختیار کئے ہیں ، اور جن طریقوں سے گذشتہ چند برسوں میں اپنی تحریک کو فروغ دیا ہے وہ ایک صداقت پسند آدمی کو ان کی تحریک کی طرف کھینچنے کے بجائے اس سے نفرت دلاتے ہیں مگر میں یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر انہی طریقوں سے مشرقی صاحب کو فروغ حاصل ہوا ہے ۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دیکھ کر مسلمانوں سے میری مایوسی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ۔

میں حیران ہوں کہ جس قوم میں ایسے ذلیل طریقے فروغ پا سکتے ہیں ، اور جو اتنے پست اخلاق اور گھٹیا درجے کے آدمیوں کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اس کا اخلاقی وقار دنیا میں کیسے باقی رہ سکتا ہے ۔ دو چار یا ہزار دو ہزار آدمی ایسے ہوتے تب بھی کوئی بات نہ تھی مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ لاکھوں مسلمان اس کے پیچھے

ہیں۔ لاکھوں اس سے ہمدردی رکھتے ہیں مسلمانوں کے بکثرت اخبارات اس کی حمایت کر رہے ہیں اور بعض بڑی ذمہ دار مسلمان انجمنیں اس کی تائید پر ہیں۔ یہ صورت حال اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ اخلاقی پستی ایک وبائے عام کی طرح مسلمانوں میں پھیل چکی ہے اور ان کا معیارِ انسانیت و شرافت بالعموم گرتا جا رہا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا وہ عصبیتِ جاہلیہ نہیں ہے جس کو دین منع کرتا ہے۔ البتہ آدمی کا حق و باطل سے بے نیاز ہو کر ہر حال میں اپنی قوم والے کی حمایت کرنا خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر، یہ عصبیتِ جاہلیہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو دین مٹانا چاہتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں یہی عصبیتِ جاہلیہ پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ مشرقی صاحب نے جس طریقہ سے قضیہ مدح صحابہ میں مداخلت فرمائی۔ کوئی انصاف پسند، سچا اور معقول آدمی اس کو جائز طریقہ نہیں کہہ سکتا۔ اس زمانہ کے "الاصلاح" کے مضامین دیکھئے۔ صریح طور پر فریقین کے لیڈروں کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ فریقین کو خطرناک اقدام کا خوف دلایا گیا اور کہا گیا کہ ہم بزور اس جھگڑے کو دبائیں گے۔ فرمائیے کونسی حکومت اس طرزِ عمل کو گوارا کر سکتی تھی؟ یو۔پی کی حکومت ہندوؤں کی حکومت سہی، میں کہتا ہوں کہ کیا کوئی اسلامی حکومت بھی اس کو گوارا کر سکتی تھی کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر کسی نزاع کے فریقین کو قتل کی دھمکیاں دے اور کسی نزاع کو بزور دبانے کا ارادہ کرے۔ پس یو۔پی گورنمنٹ نے مشرقی صاحب اور ان کے اعوان و انصار کے ساتھ جو کچھ کیا بالکل جائز کیا۔ اب اگر

مسلمان ایک خطاکار کا ساتھ صرف اس لئے دیتے ہیں، کہ وہ اپنی قوم کا آدمی ہے اور یوپی گورنمنٹ کے مقابلہ میں صرف اس لئے اس کی حمایت کرتے ہیں کہ وہ ہندو گورنمنٹ ہے تو یہ صریحاً عصبیتِ جاہلیہ ہے اخلاق کے سوال سے قطع نظر کر کے اپنی قوم والے کا ساتھ دینا غیر مسلموں کا کام ہے، مسلمان بھی اگر یہی کام کرنے لگے تو پھر ان میں اور غیر مسلموں میں فرق کیا رہا؟ کس لحاظ سے وہ غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اپنی اخلاقی برتری کا دعوےٰ کر سکتے ہیں؟ اور میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو تو دنیا بھر کی قوموں سے الگ ایک گروہ بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ یہ عصبیت جاہلیہ سے پاک ہو کر مجرد حق کی حمایت کرے اور خالصتہً اخلاقی اصولوں کا علمبردار بن کر اٹھے۔ اگر اس نے اپنی یہ خصوصیت کھو دی، اور وہی پوزیشن اختیار کر لی جو غیر مسلموں کی ہے، تو پھر اس نئی جماعت کے وجود کی حاجت ہی کیا باقی رہی کیا اسلام بس اس لئے آیا تھا کہ اپنے نام سے ایک قوم بنا کر دنیا کی باطل پرست قوموں میں ایک اور قوم کا اضافہ کر دے؟

خاکسار تحریک کی مذہبی حیثیت کے متعلق مجھے آپ سے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود صاحب علم ہیں۔ مشرقی صاحب کی کتابوں کو دیکھ کر خود معلوم کر سکتے ہیں کہ ان حضرت نے اسلام کے اصولوں کو کس طرح مسخ کیا ہے خیالات اور نظریات کے اعتبار سے ان میں اور ان دوسرے مادہ پرستوں میں کوئی فرق نہیں ہے جنہوں نے یورپ سے مادہ پرستی کا سبق حاصل کیا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس مادہ پرستی کو الگ مذہب جان کر اختیار کرتے ہیں اور اسے "اسلام" نہیں قرار دیتے۔ مگر مشرقی صاحب اسے عین اسلام

قرار دینے اور قرآن سے اس کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح مشرقی صاحب ان سب کی بہ نسبت اسلام اور مسلمانوں کے لئے زیادہ خطرناک ہیں۔ جو چیز عین اسلام کی ضد ہے، جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا ہے خود اسی کو اسلام قرار دینا اور مسلمانوں کو یقین دلانا کہ اسی کو لے کر محمد رسول اللہؐ تشریف لائے تھے یہ وہ کارنامہ ہے جو مشرقی صاحب نے اس بیسویں صدی میں انجام دیا ہے۔ افسوس کہ عام مسلمان اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان اپنے دین سے اس قدر ناواقف ہو چکے ہیں کہ وہ اس جعل کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے سامنے جب ایک شخص حرکت عمل، جہاد، تنظیم، اطاعت، امیر، اور غلبہ و تمکن فی الارض کے ظاہر فریب نام لیتا ہے تو اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ بس آگیا ہمارا نجات دہندہ۔ مگر ان میں یہ سمجھنے کی تمیز نہیں کہ باطل حرکت و عمل اور حق کی حرکت و عمل میں کیا فرق ہے، جہاد فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل الطاغوت میں کیا جوہری اور روحی امتیاز ہے۔

فرعونی تنظیم اور نمرودی اطاعتِ امیر کیا ہے اور اسلامی تنظیم و اطاعت امیر کن حقائق کی بنیاد پر اس سے ممتاز ہوتی ہے۔ خدا سے بغاوت کرنے والوں کا غلبہ و تمکن جو عاد اور ثمود اور فرعون و نمرود کو حاصل تھا اس خلافتِ الٰہی سے کس بنیاد پر ممیز ہوتا ہے جسے محمد رسول اللہؐ نے قائم کیا تھا۔ یہ لوگ ان امور کو نہ تو خود سمجھنے کے اہل ہیں اور نہ طغیان جاہلیت ان کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص انہیں سمجھائے تو ٹھنڈے دل سے اس کے دلائل پر غور کریں۔ ایسی حالت میں سوا اس کے کیا چارہ ہے کہ آدمی صبر کرے اور ان جاہلوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ حق کی تبلیغ میں مشغول رہے یہی طریقہ میں نے اختیار کیا ہے۔ آپ دیکھتے

ہیں کہ میں نے خاکسار تحریک کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ ہر طرف سے مطالبہ ہو رہا ہے کہ اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرو۔ مگر میں خاموش بیٹھا ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں خاکساروں سے ڈرتا ہوں۔ یا ان کے لیڈر کی بد زبانیوں اور گالیوں سے خوف زدہ ہوں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت مجھے عام مسلمان اس موڈ میں نظر نہیں آتے کہ وہ کسی معقول بات کو سن کر قبول کریں گے۔ ان پر پریشانی اور گھبراہٹ مسلط ہے۔ اور اس حالت میں وہ ہر رہزن کو رہنما مان کر اس کے پیچھے دوڑ چلنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی انہیں سمجھائے گا۔ کہ بھائی یہ رہزن ہے جس کے پیچھے تم جا رہے ہو تو یہ الٹا اسی کو دشمن سمجھنے لگیں گے۔ لہٰذا ان کا علاج یہی ہے کہ جدھر یہ جا رہے ہیں ادھر جانے دیجئے اور صبر کے ساتھ دیکھتے رہیئے۔

جب یہ رہزنوں کے پیچھے چلنے کے تلخ نتائج خوب اچھی طرح دیکھ لیں گے چوٹیں کھائیں گے۔ ذلتیں سہیں گے، تب ان کو ہوش آئے گا اور خدا کی دی ہوئی بینائی سے کام لینے پر آمادہ ہوں گے۔ سرِدست تو میں صرف اسی کو دین کی خدمت سمجھتا ہوں کہ فتنوں اور فتنہ پردازوں کی طرف سے بالکل بے پرواہ ہو کر دین کے اصول اور اس کی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے اور پھیلانے کی کوشش کی جائے، اور جن جن لوگوں میں قبولِ حق کی صلاحیت ہے انہیں دائرۂ اسلام میں لایا جاتا رہے۔ عام اس سے کہ وہ پیدائشی مسلمان ہو یا پیدائشی الخ۔ اس کے بعد اگر اللہ کو منظور ہوگا تو وہ کوئی راہ پیدا کرے گا۔

خاکسار تحریک سے اگر آپ کسی سیاسی فائدے کی توقع رکھتے ہیں تو اسے

بھی دل سے نکال دیجئے. میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ تحریک کسی پہلو سے بھی مسلمانوں کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی. کسی تحریک کے بانی اور لیڈر کے عقائد و نظریات کسی حال میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے. درحقیقت یہی چیز ہر تحریک کی روح رواں ہوتی ہے. لہٰذا ہر صاحب فکر آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہے اسلئے کہ خاکسار صاحبان ہر جگہ مشرقی صاحب اور ان کے تذکرہ کی. مدافعت کرتے اور ان کے حق میں مناظرہ کرتے نظر آتے ہیں. اب یہ ظاہر بات ہے کہ جس تحریک کی بنیاد ان عقائد و نظریات پر ہو اور جس کے پیرو وں میں عام طور پر یہ عقائد و نظریات پھیلے ہوئے ہوں، اس سے وہ لوگ کبھی موافقت نہیں کر سکتے جو اسلام کا کچھ بھی علم رکھتے ہیں لا محالہ وہ اس کی مخالفت ہی کریں گے اور عام مسلمان جو ان کے زیر اثر ہیں. یا ان پر اعتماد رکھتے ہیں. وہ بھی اس تحریک کی مخالفت کریں گے. نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ تحریک خود مسلمانوں میں باہم ایک زبردست تفرقہ کی بنیاد ڈال دے گی. گھر گھر اور محلہ محلہ اور مسجد مسجد خاکساروں اور ان کی مخالفت کرنے والے مسلمانوں میں جھگڑے برپا ہوں گے، یہاں تک کہ ایک نیا فرقہ اور جنگجو فرقہ وجود میں آجائے گا. اس خانہ جنگی کے سوا یہ تحریک کوئی اور نتیجہ پیدا کرتی نظر نہیں آتی لہٰذا اس سے کسی خیر کی توقع کرنا سخت غلطی ہے.

علاوہ بریں مشرقی صاحب کی تحریر و تقریر اور ان کی حرکات سب کی سب اس کا پتہ دیتی ہیں کہ وہ ایک غیر متوازن دماغ کے آدمی ہیں ان کی قیادت میں جو تحریک چلے گی اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی جیسے کسی موٹر کو کوئی مخمور آدمی چلا رہا ہو نہیں کہہ سکتے کہ شراب کے نشے میں وہ موٹر کو کس درخت سے ٹکرا دے گا یا کس گڑھے

میں پھینک دے گا۔ سیاسی تحریکوں کو چلانے کے لئے نرے اشتعال اور جوش اور غضب سے کام نہیں چل سکتا اس کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے سنجیدہ غور و فکر اور متوازن قوت فیصلہ کی ضرورت ہے، اور یہ چیز مشرقی صاحب کو نصیب نہیں ہے۔ مذہبی عقائد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ سیاسی حیثیت ہی سے مسلمانوں کو کسی صحیح راستہ پر چلا کر بخیریت منزل کامیابی تک پہنچا دیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ۔۔۔۔۔ بس یہی کر سکتے ہیں کہ یونیفارم، قواعد پریڈ نعروں اور جھنڈوں کی نمائش سے سطح بین عوام کو اپنی طرف کھینچیں اور بناوٹی الفاظ جھوٹے پروپیگنڈے اور اشتعال انگیز مضامین کی شراب پلا کر انہیں اس فریب میں مبتلا کر دیں کہ وہ ایک طاقت بن گئے ہیں۔ یہ فریب کچھ دن خوب چلے گا۔ اور بالآخر ایک عظیم صدمہ کے ساتھ اس بری طرح ٹوٹے گا کہ مدتوں کے لئے مسلمانوں پر یاس و ناامیدی اور بے اعتباری چھا جائے گی اور وہ مدتوں اس قابل نہ ہو سکیں گے کہ کسی تحریک اور کسی رہنما پر اعتبار کر سکیں۔

احقر

ابوالاعلیٰ (۲۸ شعبان ۱۳۵۸ھ)

○

لاہور
دسمبر ۱۹۴۷ء

مکرمی و محترمی السلام علیکم و رحمۃ اللہ

حیدر آباد کے مسلمانوں سے دینی اخوّت کی بنا پر میرا جو تعلق ہے اگرچہ اس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ میں اس نازک موقع پر ان کو ایک خیرخواہانہ مشورہ دوں لیکن اس کے علاوہ حیدر آباد سے اس بنا پر میرا ایک ذاتی تعلق ہے کہ اورنگ آباد میرا پیدائشی وطن ہے اور میری زندگی کا نصف سے زائد حصہ حیدر آباد ہی میں بسر ہوا ہے۔ اس دوہرے قلبی تعلق کی وجہ سے میں اس تمام تشویش اور فکرمندی میں بُعدِ مقام کے باوجود حیدر آباد کے مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوں جس

مولانا نے یہ خط سقوطِ حیدر آباد (ستمبر ۱۹۴۸ء) سے کم و بیش ۹ مہینے قبل حیدر آباد کے مسلم رہنماؤں کی خدمت میں لکھا تھا جس کا مقصد ان دشوار حالات سے وہاں کے مسلمانوں کو عہدہ برآ ہونے میں مدد دینا تھا۔ افسوس کہ اس وقت اسے کوئی اہمیت نہ دی گئی لیکن بعد کے واقعات نے اس مشورے کی افادیت کو پوری طرح ثابت کر دیا اور مولانا کی سیاسی بصیرت پر بھی صداقت کی گواہی پیش کر دی۔ جوش بلا ہوش کی سیاست جو مسلمان کو مدت سے برباد کرتی چلی آرہی ہے۔ حیدر آباد کا سانحہ اس کا ایک دردناک نمونہ ہے۔ مولانا مودودی واحد آدمی تھے جنہوں نے پاکستان میں بیٹھ کر حیدر آباد کے مسلمانوں کو سخن کی حد تک بہترین امداد پہنچائی لیکن ایسے پر آشوب حالات میں کم ہی لوگ کسی ہمدرد کی نصیحت سے استفادہ کیا کرتے ہیں۔ (ا۔ گ)
(فراہم کردہ مولانا ابو منظور شیخ احمد بنگلور)

میں وہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی وجہ سے اپنے آپ کو مبتلا پا رہے ہیں۔ یہی چیز مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ میں بلا طلب اپنا مشورہ ان حضرات کی خدمت میں پیش کروں جو اس وقت مسلمانان حیدر آباد کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور سرسری طور پر انہیں نظر انداز نہ کر دیں گے۔ تاہم اگر وہ ایسا کریں تو میں اپنی اخلاقی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاؤں گا اور میرا ضمیر مطمئن رہے گا کہ اپنے بھائیوں کا جو حق مجھ پر عائد ہوتا تھا اسے ادا کرنے کی میں نے کوشش کر دی۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے ابھی ابھی اپنا جو انجام دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں وہ دراصل خمیازہ ہے ان کوتاہیوں کا جو پچھلی صدیوں میں ہمارے حکمراں ہمارے امراء، ہمارے مذہبی پیشواؤں کا ایک بڑا گروہ اور بااستثناء چند ہمارے عام اہلِ ملت، اپنے اس فرض کی ادائیگی میں برتتے رہے ہیں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر وہ اسلام کی صحیح نمایندگی کرتے۔ اگر وہ اپنے اخلاق اور معاملات اور اپنی سیرتوں میں اسلام کا صحیح نمونہ پیش کرتے اور وہ اپنی سیاست اور حکمرانی میں عدل و انصاف پر قائم رہتے اور اپنی طاقتوں کو اسلام کی سچائی پھیلانے میں صرف کرتے تو آج دہلی اور مغربی یو۔پی اور مشرقی پنجاب سے مسلمان اس طرح بیک بینی و دو گوش نہ نکال دیئے جاتے جیسے اس وقت نکالے گئے ہیں، اور یو۔پی بہار اور وسطِ ہند میں ان کے سر پر اس طرح تباہی منڈلا رہی نہ ہوتی جیسی آج منڈلا رہی ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کا اقتدار رہا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی

عظیم الشان جاگیریں حیدرآباد کی پائے گاہوں سے کئی گنی زیادہ بڑی جاگیریں تھا تم رہی ہیں اور جہاں مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم و فنون کے عظیم الشان مرکز موجود رہے ہیں لیکن عیش دنیا میں انہماک، فوجی طاقت اور سیاسی اقتدار پر انحصار اسلام کی دعوت پھیلانے سے تغافل اور انفرادی سیرتوں اور اجتماعی طرزِ عمل میں اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان علاقوں کی عام آبادی غیر مسلم رہی، مسلمان ان کے درمیان آٹے میں نمک کے برابر رہے اور دلوں کو مسخر کرنے کے بجائے معاشی اور سیاسی دباؤ سے گردنیں اپنے سامنے جھکوانے پر اکتفا کرتے رہے، پھر جب سیاسی اقتدار ان سے چھنا اور ایک غیر ملکی قوم ان پر مسلط ہوئی تب بھی انہوں نے اور ان کے رہنماؤں نے ان اسباب کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جن کی بنا پر وہ حاکم سے محکوم بن کر رہ گئے تھے بلکہ انہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے بل پر جینے کی کوشش کی اور اپنے سیاسی مطالبے اور دعوے کو ہمسایہ اکثریت کے مقابلے میں اس تیسری طاقت سے، جس کے اقتدار کو بہر حال خاتمے رہی ہونا تھا، منواتے رہے۔ اس تمام مدت میں زندگی کی جو مہلت مسلمانوں کو ملی تھی اس میں اپنی اخلاقی اصلاح کرنے اور اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی تلافی کرنے کے بجائے مسلمان محض معاشی اور سیاسی فائدوں کے لئے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کشمکش کر کے بظاہر یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے جینے کا سامان کر رہے ہیں لیکن دراصل اپنی قبر کھود رہے تھے اور آخر کار آج ہماری بدقسمت آنکھوں نے دیکھ لیا کہ بہت سے تو اس قبر میں دفن ہو گئے ہیں اور بہت سے زندہ در گور ہیں۔

یہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش آیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ حیدر آباد کے مسلمان اس سے سبق لیں اور جو تھوڑی سی مہلت ان کو سنبھلنے کے لئے ملی ہے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حیدر آباد کے مسلمانوں کی پوزیشن ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ یہاں بھی صدیوں کی حکومت کے باوجود باشندوں کی عظیم اکثریت غیر مسلم ہے اور مسلمان پندرہ فی صدی سے زیادہ نہیں ہیں، یہاں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اور معاشی کشمکش سے وہی قومی منافرت پیدا ہو چکی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہو چکی تھی اور اسی انتہائی تلخی کی حد تک پہنچتی جا رہی ہے جو دہلی اور پنجاب میں پائی جاتی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ یہاں مسلمان ریاست قائم ہے اور ریاست کے نظم و نسق پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں لیکن یہ فرق جو اب تک حیدر آباد کے مسلمانوں کے بچے رہنے کا موجب بنا ہوا ہے کچھ ایسا زیادہ پائدار اور مستحکم فرق نہیں کہ حیدر آباد کے مسلمان اس کے بھروسے پر زیادہ مدت تک جی سکتے ہوں۔ انڈین یونین کی ہندو اکثریت جو سابق انگریزی طاقت کی وارث ہوئی ہے۔ حیدر آباد کے چاروں طرف محیط ہے، حیدر آباد اس کے محاصرہ میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کسی طرف سے وہ مدد نہیں پا سکتا۔ ریاست کی ۸۵ فی صدی آبادی غیر مسلم ہے اور وہ مسلمان ریاست کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتی ہے موجودہ جمہوریت کے دور میں ۱۵ فیصدی مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ حکمرانی ان کے ہاتھ میں رہے یا وہ کم از کم آدھے اقتدار کے شریک ہوں، کسی طرح نہیں چل سکتا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے کسی معتد بہ عنصر کو مسلمان اپنے ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر سکیں گے یا کم از کم ۵۰ فیصدی رائے حاصل

کرسکیں گے۔ اس صورت حال میں اگر مسلمان اپنے اقتدار کو اور ان تمام امتیازی حقوق اور اختیارات اور فوائد اور منافع کو برقرار رکھنا چاہیں جو اب تک حاصل رہے ہیں تو اس کے لئے انہیں لڑنا پڑے گا، لڑائی محض ریاست کی غیر مسلم اکثریت سے نہیں ہوگی بلکہ آخر کار انڈین یونین کی فوجی طاقت سے ہوگی جس کی پشت پر پورے ہندوستان کی ہندو قوم کی متفقہ طاقت بھی ہوگی۔ مجھے امید نہیں کہ اس لڑائی میں ریاست کی طاقت حیدر آبادی مسلمانوں کا ساتھ دے گی۔ رئیس کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اور اپنے خانوادہ کے مفاد کو دیکھتا ہے، اگر وہ محسوس کرے گا کہ مسلمانوں کا ساتھ دینے سے اس کو بھی نواب جوناگڑھ کا سا انجام دیکھنا پڑے گا تو بعید نہیں کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ اپنا معاملہ طے کرلے اور اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دے۔ حیدر آباد کی فوج، پولس اور نظم و نسق پر بھی آپ یہ بھروسہ نہیں کرسکتے کہ وہ اس لڑائی میں کچھ بہت زیادہ آپ کے کام آسکیں گے اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی خالص مسلمان عناصر پر مشتمل نہیں ہے بلکہ سب میں اچھا خاصا غیر مسلم عنصر موجود ہے لہٰذا اگر خدانخواستہ لڑائی پیش آگئی تو شائد حیدر آباد کے مسلمانوں کا انجام اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ حیدر آباد کے مسلمانوں پر اگر ایک طرف خود گھر کی اکثریت، دوسری طرف گردونواح کے علاقوں کے مسلح جتھے اور تیسری طرف انڈین یونین کی فوجیں ٹوٹ پڑیں اور خود ریاست کے نظم و نسق نے ان کا ساتھ نہ دیا تو ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، نہ کہیں سے وہ مدد پاسکیں گے اور نہ وہ کہیں جا سکیں گے۔ اسی بناء پر میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس فرق

کہ جو سر دست آپ کی حالت اور ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت میں پایا جاتا ہے، کوئی بہت بڑا پائدار اور قابلِ اعتماد فرق نہ سمجھیں اور ان چند مہینوں کی مہلت کو جو خوش قسمتی سے آپ کو مل گئی ہے۔ ضائع کرنے کے بجائے ایسا لائحہ عمل بنانے میں صرف کریں جس سے مسلمانانِ حیدرآباد کی نہ صرف یہ کہ جان و مال و آبرو بچ جائے بلکہ ان کو ایک بہتر اور زیادہ شاندار مستقبل تک پہنچنے کا راستہ مل جائے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اصل چیز جو مسلمانوں کے لئے ذریعۂ تحفظ ہی نہیں بلکہ ذریعۂ ترقی اور وسیلۂ سربلندی ہو سکتی ہے۔ وہ تو یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہوں، اس کے صحیح نمائندے بنیں، اس کی دعوت اپنے قول اور عمل سے دنیا کے سامنے پیش کریں اور بحیثیت ایک قوم کے آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر بن کر کھڑے ہوں، یہی چیز ان کے لئے زندگی اور عزت کی زندگی کی ضامن ہو سکتی ہے لیکن ان خطوط پر اپنی قوم کو تیار کرنے کے لئے بہرحال کچھ وقت درکار ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ طوفان سر پر آ چکا ہے اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم کوئی ایسی تدبیر سوچیں جس سے یہ طوفان ٹل سکے اور ہمیں اتنا وقت مل جائے کہ ہم مسلمانوں کی عام اخلاقی اصلاح کر سکیں اور دعوتِ اسلامی کے کام کو منظم طریقے سے آگے چلا سکیں۔ میں اس مسئلے پر بہت غور کرتا رہا ہوں کہ ایسی تدبیر کیا ہو سکتی ہے اور آخر کار جن نتائج پر پہنچا ہوں ان کو ذیل میں نمبر وار بیان کرتا ہوں۔

۱۔ ہندوستان اور حیدرآباد کی سیاسی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا۔ کہ آپ انڈین یونین میں حیدرآباد کے داخلے کو اور

حیدر آباد میں ذمہ دار حکومت کے قیام کو روک سکیں گے۔ یہ چیز بہر حال ہو کر رہے گی، آپ کے روکے نہ رُک سکے گی اور روکنے کی کوشش کا حاصل اس کے سوائے کچھ نہ ہو گا کہ ریاست اور مسلمان دونوں تباہ ہو جائیں یا صرف مسلمان تباہ ہوں اور ریاست مسلمانوں کی بھینٹ چڑھا کر اپنے آپ کو بچالے اس صورت حال میں عقلمندی یہ ہے کہ مزاحمت کرنے کے بجائے آپ ایسی بنیادوں پر مفاہمت کرنے کی کوشش کریں جن سے انڈین یونین کی شراکت اور ذمہ دار حکومت کا قیام نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لئے کم سے کم مُضر ہو سکے بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کو ایسے مواقع حاصل ہو جائیں جن سے مذکورہ بالا مقصد کے لئے اپنی ملّی تعمیر زیادہ اچھی طرح کر سکیں۔

۲۔ مزاحمت اور کشمکش کرنے کے بجائے اگر اسوقت حیدرآبادی مسلمانوں کی قومی تنظیم یعنی انجمن اتحاد المسلمین یہ بات پیش کرے کہ وہ چند شرائط کے ساتھ انڈین یونین کے داخلہ اور مکمّل ذمہ دار حکومت کے قیام پر بخوشی راضی ہے تو مجھے امید ہے کہ اس مرحلے پر اسٹیٹ کانگریس اور انڈین یونین دونوں ہماری شرائط ماننے پر راضی ہو سکیں گی۔

۳۔ میرے نزدیک جو شرائط اس غرض کے لئے مفید ہو سکتی ہیں اور جن پر انڈین یونین اور اسٹیٹ کانگریس کو بآسانی راضی کیا جا سکتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) ریاست کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کو یہ حق دیا جائے کہ ان کے تہذیبی اور مذہبی معاملات کے لئے ان کا اپنا الگ ایک —— ORGANISATION —— ہو جسے مسلمانوں پر زکوٰۃ عائد کرنے اور

اس کو وصول اور خرچ کرنے کے لئے اور مذہبی اوقاف کا انتظام کرنے اور ان کی آمدنی کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کرنے کے لئے نیز مسلمانوں کا پرسنل لاء ان کے معاملات نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ پر جاری کرانے کے لئے ضروری قانونی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں (ایسے ہی اختیارات اگر دوسرے غیر مسلم گروہ بھی حاصل کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔)

(ب) مسلمانوں کے اس حق کو بھی دستور میں محفوظ کر دیا جائے کہ وہ اپنے خرچ پر ایک مذہبی درس گاہ قائم کر سکیں اور اسی طرح سرکاری تعلیم گاہوں میں مسلمان بچوں کے لئے اپنے خرچ پر لازمی مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکیں (یعنے مسلمان بچوں کے لئے سرکاری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم Compulsory ہو گی اور اس کا خرچ مسلمانوں کا مندرجہ بالا Organisation برداشت کرے گا۔)

(ج) ریاست کے لئے جو اسمبلی یا پارلیمنٹ بنے اس میں طریق انتخاب تو ضرور ہو لیکن لازماً کوئی ایسا طریق انتخاب اختیار کیا جائے جس سے آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے مثلاً متناسب نمائندگی (Proportional Representation) کا وہ طریقہ جس میں ملک کو یک نشستی حلقہائے انتخاب میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ پورا ملک ایک حلقۂ انتخاب ہوتا ہے اور رائیں منفرد لوگوں کے حق میں نہیں بلکہ پارٹیوں کے حق میں ڈالی جاتی ہیں۔

(د) دستور کی ترمیم پر ایسی پابندی عائد کی جائے جس کی وجہ سے

مسلمانوں کے وہ حقوق جو انہیں پہلے دستور میں دیئے گئے ہوں بعد کی کسی ترمیم میں بآسانی سلب نہ کئے جاسکیں مثلاً دستور کی ترمیم کے لئے استصواب رائے عام (Referendum) ضروری قرار دیا جائے اور کم از کم ۸۰ فیصدی یا ۸۵ فیصدی ووٹوں کے بغیر کوئی ترمیم پاس نہ ہو سکے۔

(ھ) اس بات کی ضمانت دی جائے کہ سرکاری محکموں میں اور ان کے کسی شعبے میں ان کے خلاف کوئی امتیازی پابندی عائد نہ کی جائے گی۔

(و) از روئے دستور تبدیل مذہب پر کوئی پابندی عائد نہ ہو سکے گی۔

ان شرائط کے ساتھ مسلمانوں کو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ریاست میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو اور نظام صرف ایک دستوری فرمانروا کی حیثیت سے رہیں۔ نظام کے لئے دستوری فرمانروا سے بڑھ کر کسی پوزیشن کا مطالبہ کرنے پر مسلمانوں کو اصرار نہ کرنا چاہیئے ورنہ وہ سمجھ لیں کہ یہ چیز ایک خاندان کے مفاد پر ایک پوری قوم کے مفاد کو قربان کرنے کے ہم معنی ہوگی جس کا خمیازہ آگے چل کر مسلمانوں کو بہت برا دیکھنا ہوگا۔

(م) مذکورہ بالا شرائط کے مطابق مسلمانوں کو اپنا جو قومی Organisation قائم کرنے کا حق حاصل ہو اس سے انہیں پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے زکوٰۃ اور اوقاف کی آمدنی اتنی کافی ہوگی کہ اس سے ایک عظیم الشان بیت المال قائم ہو سکے گا مسلمانوں کی تعلیم، اخلاقی اصلاح، معاشی خوشحالی اور صنعتی ترقی کے لیئے بہت سے کام کیے جاسکیں گے، ان کو سودی قرض سے نجات دلائی جا سکے گی اور ایسے ادارے قائم کیے جاسکیں گے جو دعوت دین کے لئے مسلمان

نوجوانوں کو تیار کریں۔ ملکی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر شائع کریں اور اسلامی لٹریچر کی وسیع پیمانے پر اشاعت کریں۔ ان ذرائع سے یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنی سوسائٹی کو زیادہ سے زیادہ صالح بنا کر غیر مسلم عناصر کو اپنے اندر جذب کر سکیں

(۵) ان تحفظات کے ساتھ جو جمہوری حکومت قائم ہو اس میں مسلمان اپنا اثر اس طرح بڑھا سکتے ہیں کہ ان کی سیاسی پارٹی یعنی انجمن اتحاد المسلمین کوئی ایسا پروگرام پیش کرے جسے لے کر صرف مسلمانوں ہی کے سامنے نہ جائے بلکہ غیر مسلم ووٹروں کے سامنے بھی جا سکے اور ان کی زیادہ سے زیادہ رائیں حاصل کر سکے مثال کے طور پر اس کے پروگرام میں Depressed Classes کے لئے کوئی ایسی کشش ہونی چاہیئے کہ ان کے ووٹ مسلم پارٹی کو حاصل ہوں۔ آج اگر آپ سیاسی جوڑ توڑ کر کے پست اقوام کو ہندوؤں سے توڑنے کی کوشش کریں گے تو آپ کچھ فائدہ نہ حاصل کر سکیں گے اور یہ چیز ہندوؤں میں آپ کے خلاف اور زیادہ ضد پیدا کر دے گی لیکن کل نئے دستور کے مطابق اگر انتخابات میں آپ ایسا پروگرام لائے جو پست اقوام کی اکثریت کو آپ کے ساتھ ہم آواز بنا دے تو آپ اسمبلی میں اکثریت حاصل کر سکیں گے اور رہنمائی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ بہر حال اس نقشے پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ مسلمان نئے حالات کے مطابق اپنے اندر سے ایک بہتر اور زیادہ بیدار مغز سیاسی لیڈرشپ پیدا کریں جو تنگ نظری کیساتھ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی حفاظت پر منحصر نہ ہو بلکہ بڑے پیمانے پر عدل و انصاف کے قیام سے اور عام ملک کی حقیقی ترقی اور فلاح کے کاموں سے مسلمانوں کے اصلی مفاد کی خدمت کر سکے۔

خاکسار

بنام:۔ صدر انجمن اتحاد المسلمین حیدر آباد دکن۔ ابوالاعلیٰ

۳، اکتوبر ۱۹۴۹ء

بخدمت جناب چیف سیکرٹری صاحب حکومت مغربی پنجاب بتوسط سپرنٹنڈنٹ صاحب نیو سنٹرل جیل ملتان۔

جناب محترم!

۳۰ر ستمبر ۱۹۴۹ء کے اخبارات میں وہ پریس نوٹ میری نگاہ سے گذرا جو میری اور میرے رفقاء کی معیاد نظر بندی کی تیسری ششماہی تک توسیع کرنے کے حق میں آپ کی حکومت نے شائع فرمایا ہے۔ اگر یہ توسیع بھی اسی طرح خاموشی کے ساتھ ہو گئی ہوتی جس طرح ہماری نظر بندی کی ابتداء اور اس کی پہلی توسیع ہوئی تھی تو ہم اسی طرح صبر اور خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیتے جس طرح پہلے کرتے رہے ہیں۔ لیکن حکومت کا یہ بیان ہمارے لئے تکلیف پر توہین کا اضافہ ہے اور اس میں ایک صریح ناروا زیادتی کو حق بجانب ثابت کرنے کی ایسی کوشش کی گئی ہے جسے چیلنج کئے بغیر گذر جانے نہیں دیا جا سکتا لہٰذا اپنی طرف سے اور اپنے رفقاء کی طرف سے اس پر کچھ گذارشات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ براہِ کرم انہیں حکومت مغربی پاکستان تک پہنچا دیں۔

حکومت کا پریس نوٹ تین مضامین پر مشتمل ہے۔

(۱) جس میں بجائے خود پبلک سیفٹی ایکٹ کو حق بجانب ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مغربی پنجاب کی حکومت اسے بڑی احتیاط کے ساتھ بہت ہی ناگزیر صورت میں استعمال کر رہی ہے۔

(۳) جس میں مغربی پنجاب کے چھ نظر بندوں پر نام بنام متعین الزامات عائد کرنے کے بجائے مجمل طور پر چند بہت ہی خطرناک جرائم کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے جس سے لامحالہ عوام الناس کے دل میں بھی وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے، ان سب یا ان میں سے بعض کا ارتکاب کیا ہوگا۔

مضمون اوّل کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے بارے میں یہ گنجائش تو پہلے ہی موجود تھی کہ ایک شخص ہائیکورٹ میں ہیبیس کارپس کی درخواست پیش کر کے حکومت کے "حسنِ نیت" (Bonafides) کی جانچ کرے۔ اور اب اس میں یہ اضافہ کر دیا گیا ہے کہ حکومت ایک کافی تجربہ کار سیشن جج کے سامنے وہ مواد رکھ دے گی جس کی بنا پر اس نے کسی شخص کو نظر بند کیا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قانون کی رو سے ہائیکورٹ فی نفسہٖ ان وجوہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے جن پر حکومت نے کسی شخص کو نظر بند کیا ہو؟ اگر نہیں تو صرف حکومت کے "حسنِ نیت" پر یا چند ادھر ادھر کے قانونی اسقام پر (جن کا وجوہِ نظر بندی کی معقولیت یا عدم معقولیت سے بہر حال کوئی تعلق نہیں) بحث کر لینے سے انصاف کا مقصد کس طرح پورا ہو سکتا ہے اور وجوہِ نظر بندی کو زیر بحث لائے بغیر خود حسنِ نیت کے بارے میں بھی کوئی رائے کس طرح قائم کی جا سکتی ہے۔ پھر اب جو ایک سیشن جج کے سامنے معاملہ رکھنے کا قاعدہ نئے سیفٹی ایکٹ میں بڑھایا گیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت جس سیشن جج کے سامنے اپنی بنائے کارروائی کا

مواد رکھے گی۔ کیا وہ اس مواد کے صحیح یا غلط ہونے کی تحقیق بھی کر سکے گا؟ اور کیا وہ خود نظر بند کو بھی صفائی پیش کرنے کا موقع دے گا؟ اگر نہیں، تو پھر عقل اور انصاف کی رُو سے اس کے دیئے ہوئے اس یک طرفہ مشورے کی قیمت ہی کیا ہے۔ میں تو ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ حکومت براہِ کرم اس سشن جج کا نام ضرور شائع فرمائے جس نے ایسی شرائط کے تحت نظر بندوں کے معاملے میں مشورہ دینا قبول کیا ہو۔ آخر پبلک کو معلوم تو ہونا چاہیئے کہ اس ملک کے نظامِ عدالت میں وہ کونسا منصف مزاج افسر ہے جو برسوں کی قانونی تعلیم و تربیت اور مدتوں منصبِ انصاف پر سرفراز ہونے کے بعد بھی اسے جائز سمجھتا ہے کہ حکومت کے پیش کردہ یک طرفہ مواد کو دیکھ کر ملک کے کسی شہری کی آزادی سلب کر لیئے جانے کا مشورہ دے دے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ حکومت اس قانون کے تحت ایک شخص کی نظر بندی کا فیصلہ صرف اس صورت میں کرتی ہے جب کہ وہ پوری طرح اس بات پر مطمئن ہو جاتی ہے کہ ریاست کے تحفظ کے لیئے ایسا کرنا بالکل ناگزیر ہے اور یہ کہ معمولی قانون کے تحت اس شخص پر مقدمہ چلانا خود اس تحفظ کے مقصد کو ضائع کر دے گا، یا نقصان پہنچا دے گا۔ میں ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ کسی شخص کو شرائط انصاف کے مطابق مجرم ثابت کیئے بغیر آزادی سے محروم کر دینا ایک ایسا فعل ہے جس کو اس طرح کی سخن سازیوں سے حق بجانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۳۵ء کے کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے سیفٹی ایکٹ کی دستوری پوزیشن خواہ کچھ ہو اور اس کی ضرورت خواہ کتنے ہی خوشنما الفاظ میں بیان کی جائے لیکن یہ ایکٹ ایک طرف انصاف کے اُن اصولوں کے قطعاً خلاف ہے جو اسلام نے ہم کو سکھائے ہیں

(جن پر ریاست پاکستان کی تعمیر کرنے کا فیصلہ ہماری دستور ساز اسمبلی کر چکی ہے) اور دوسری طرف اس تصورِ انصاف کے بھی خلاف ہے جس سے عام انسانی عقل قدیم ترین زمانے سے آج تک آشنا رہی ہے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ اسلام کا دستوری قانون کسی حکومت کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ مقدمہ چلائے بغیر کسی شخص کی جان، مال یا آزادی محض ایک انتظامی فیصلے کی بناء پر سلب کرے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مقدمے کے سلسلے میں اس دستوری نکتہ کو بایں الفاظ واضح کیا تھا۔

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدل (موطا کتاب احکام ظلم)	اسلام میں کسی شخص کو عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور مقدمہ میں جس میں مصر کے گورنر عمرو بن عاص نے ایک مصری کو اس کا کوئی جرم ثابت کئے بغیر قید کر رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے قیدی کو بری کرتے ہوئے اپنے گورنر کو خطاب کر کے کہا۔

یا عمرو امتیٰ اعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احراراً (الفاروق عمر تالیف محمد حسین ہیکل جلد دوم ص ۲۱۸)	اے عمرو! یہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا؟

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک سیاسی شبہ کی بنا پر مدینہ کی پولیس نے چند آدمیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس پر ان کے محلے کے ایک شخص نے عین خطبہ جمعہ میں آنحضورؐ کو ٹوک کر پوچھا کہ میرے ہمسائے کس قصور میں پکڑے گئے ہیں؟

اس کے جواب میں آنحضورؐ نے خطبہ ختم کرنے کے بعد فوراً ہی ان آدمیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ (ابوداؤد کتاب القضا)

اپنے اس فعل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو برحق قرار دیا کہ محض الزام پر کسی شخص کو قید کر دینا غلط ہے۔ یا تو اس پر الزام ثابت کر کے باقاعدہ سزا دو، اور اگر ثابت نہیں کر سکتے تو چھوڑ دو۔

یہ تو ہے انصاف کے اسلامی اصولوں کا معاملہ۔ رہے دنیا کے مانے ہوئے دستوری اصول اور عدل و انصاف کے قانونی تصورات تو میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح خود مغربی پنجاب کی حکومت بھی یہ تسلیم کرے گی کہ اس مسئلہ میں قائد اعظم مرحوم سے بڑھ کر قابل اعتماد سند کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ۸ جنوری ۱۹۳۵ء کو قدیم ہندوستانی مجلس قانون ساز میں سیفٹی ایکٹ جیسے ایک مسودہ قانون پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا

"میری آزادی اگر جائز طور پر چھینی جا سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ مجھ پر ایک مناسب عدالت میں ٹھیک ٹھیک قانونی طریقہ پر مقدمہ چلایا جائے اور اس کے سامنے مجھ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے تمام حقوق حاصل ہوں۔ کیا تم محض اپنے محکمہ جاسوسی کی دی ہوئی خبروں کے بل پر ایک آدمی کو یوں ہی قید کر دو گے؟ اس کا جواب ہمیں ہوم ممبر کی طرف سے کیا ملتا ہے؟ وہ کہتے ہیں "میرے پاس قانونی شہادت موجود نہیں ہے۔ اس لئے میں اسے عدالت کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ جب ایسی شہادت مل جائے گی تو یہ بھی کر دوں گا" اس طرح تم ترتیب الٹی کئے دے رہے ہو

ایک شخص آزاد رہنے کا حق رکھتا ہے جب تک کہ تم اس کے خلاف وہ شہادت نہ پاؤ جسے عدالت میں پیش کر سکو۔ مگر ہوم ممبر صاحب برابر کہتے ہیں: "میں اسے بند کر رکھنے کا مجاز ہوں۔ کیونکہ میرا پولیس کمشنر کہتا ہے کہ وہ اس شخص کے خلاف کچھ شہادت رکھتا ہے یا محض شبہ رکھتا ہے۔" جناب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات سخت افسوسناک ہے اور پھر یہ ان بنیادی اصولوں کے بھی خلاف ہے جنہیں ہر اس مہذب حکومت کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو کسی باقاعدہ دستوری نظام پر قائم ہو۔"

ان زبردست اسناد کے مقابلے میں مغربی پنجاب کی حکومت کے پاس وہ کونسے وزنی دلائل ہیں جن کی بنا پر وہ توقع کر سکتی ہے کہ پاکستان کے باشندے اسلام، عقل اور قانونی مسلمات کے خلاف اس نئے تصورِ انصاف کو تسلیم کر لیں گے کہ کسی حال میں انصاف کی شرطیں پوری کئے بغیر بھی ایک شہری کی آزادی سلب کر لینا جائز ہو سکتا ہے۔

(۲) حکومت کا پریس نوٹ مغربی پنجاب کی پبلک کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ حکومت بڑی ہی احتیاط کے ساتھ اس قانون کو استعمال کر رہی ہے۔ اس کے ثبوت میں مشرقی پنجاب، اور مدراس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ وہاں کی حکومتوں نے ایسے ہی قوانین کے تحت علی الترتیب ۱۷۵ اور ۶۰۰ آدمی پکڑ رکھے ہیں اور یہاں صرف ۶ آدمی مقدمہ چلائے بغیر قید کئے گئے ہیں۔ اس فرق کو آپ کی حکومت اس بات کا ثبوت قرار دیتی ہے کہ سیفٹی ایکٹ اس صوبہ میں جائز طور پر بھی استعمال ہو رہا ہے اور اس کے استعمال میں بے احتیاطی بھی نہیں برتی جا رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس عجیب استدلال پر حکومت خود مطمئن ہو لیکن مجھے معاف

کیا جائے اگر ہیں صاف گوئی سے کام لے کر کہوں کہ یہ ایسا ہی استدلال ہے جیسے ایک شخص اپنے چند گناہوں کو اس دلیل سے جائز ثابت کرے کہ دوسرے شخص نے ایسے ایسے سینکڑوں گناہ کر ڈالے ہیں جب کہ مذہب، اخلاق، عقل عام اور دنیا بھر کے مسلّم تصوراتِ انصاف کسی چیز کی رُو سے بھی قید بلا مقدمہ کو جائز ثابت نہیں کیا جا سکتا تو پھر اس سے کیا فرق ہو جاتا ہے کہ ایک حکومت نے اپنے ۶ شہریوں کی آزادی ناجائز طور پر سلب کی ہے اور دوسری نے سینکڑوں پر یہی ظلم کر ڈالا ہے۔

(۳) جزو سوم اس پریس نوٹ کا سب سے زیادہ افسوسناک اور دل آزار حصّہ ہے اور فی الحقیقت وہی سب سے بڑھ کر میری ان گذارشات کا محرک ہے پہلے تو حکومت اپنے نوٹ کی ابتدا میں فرماتی ہے کہ اس کے قبضہ میں کچھ "اطلاعات" ہیں جن پر خوب غور کرنے کے بعد اس نے میری اور میرے رفقاء کی نظر بندی میں میری ششماہی کے لئے توسیع کی ہے۔ پھر وہ مجموعی طور پر مغربی پنجاب کے نظر بندوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کرتی ہے کہ اس کو کسی فرد یا پارٹی کے سیاسی و تمدنی نظریات اور پروگرام سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مگر وہ ایسی صورتوں میں سیفٹی ایکٹ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(ا) جب کہ پاکستان کے تحفظ اور استحکام کی دانستہ بیخ کنی کی جائے۔

(ب) جب کہ تحفظ و استحکام کے اس اہم ترین بنیادی مقصد کے ساتھ اہل ملک کی وفاداری کو متزلزل کرنے کی کوشش کی جائے۔

(ج) جبکہ بیرونی اغراض کے آلہ کار لوگ جاسوسی کریں یا داخلی خلفشار پیدا کریں

(د) جب کہ کچھ لوگ پاکستان کے ساتھ وفاداری اور خود اپنے اخلاقی یا اجتماعی

تصورات کے ساتھ وفاداری کو ایک دوسرے کی ضد ٹھہرا کر ان کے درمیان ایک جھوٹ موٹ کا مگر خطرناک تصادم پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اس بیان کو جو شخص بھی پڑھے گا وہ یہ سمجھے بغیر نہ رہے گا کہ حکومت کے قبضہ میں جو "اطلاعات" ہیں وہ ضرور ان چاروں جرائم یا ان میں سے بعض ہی کے ارتکاب سے متعلق ہوں گی۔ اور ہم چھ نظربند انہی سب جرائم کے یا ان میں سے بعض کے مجرم پائے گئے ہوں گے حالانکہ حکومت نے اپنے پورے بیان میں ہم پر یا ہم میں سے کسی پر بھی تعین کے ساتھ یہ الزام نہیں لگایا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں جرم یا جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ الزام دہی کا یہ طریقہ بڑا ہی نازیبا ہے۔ ممکن ہے حکومتیں اخلاق کے معمولی تقاضوں سے بالاتر ہوا کرتی ہوں لیکن ہم عامی انسان تو اپنے آپ کو اس طرز عمل سے کسی طرح مانوس نہیں کر سکتے کہ چند آدمیوں کو پکڑ کر آپ سال بھر تک بلا مقدمہ چلائے بند رکھیں اور پھر مزید کئی مہینہ تک انہیں بند رکھنے کو جائز ثابت کرنے کے لئے ان پر پبلک میں اس طرح کے مبہم اور گھناؤنے الزامات لگائیں، جب کہ وہ ان الزامات کی تردید نہ پبلک میں کر سکتے ہوں نہ عدالت میں۔

میں آپ کی حکومت کو چیلنج کرتا ہوں کہ اس کے پاس کوئی ایسی اطلاعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے یا میرے رفقاء نے مذکورہ بالا افعال میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اپنی اطلاعات کو چھپا کر نہ رکھے۔ بلکہ انہیں یا تو شائع کرے اور مجھے پبلک میں جواب دہی کا موقع دے۔ یا پھر بالفاظ قائداعظم مرحوم مجھ پر ایک مناسب عدالت میں ٹھیک ٹھیک قانونی طریقہ پر مقدمہ چلائے جس کے سامنے مجھ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے تمام حقوق حاصل ہوں۔

الزام الف کے متعلق میں پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے اور میرے رفقاء نے اس کے سوا کوئی قصور نہیں کیا کہ قیام پاکستان کے بعد اس ریاست کو فی الواقع ایک اسلامی ریاست بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اور جب اربابِ اقتدار کو اس معاملہ میں تساہل کرتے دیکھا تو بالکل جائز آئینی اور جمہوری ذرائع سے ان پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اگر اس ضمن میں اس کے سوا حکومت کوئی اور "اطلاعات" رکھتی ہے تو وہ انہیں ضرور پبلک میں یا عدالت میں سامنے لائے اور اگر ہمارا قصور واقعی وہی ہے جو میں نے خود بیان کر دیا ہے تو حکومت ذرا ہمت کر کے صاف صاف یہ کہے تو سہی کہ ہماری پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کوشش ہی اس کے نزدیک اس ریاست کے تحفظ اور استحکام کی دانستہ بیخ کنی (deliberately calculated to undermine) کی حامل (prejudicial to the safety and stability) تھی۔ پھر میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری اس کوشش پر جتنا غصہ بھی آپ کی حکومت کو تھا اسے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو سرد ہو جانا چاہیئے تھا جب کہ دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کی۔ اور جماعت اسلامی نے بلا توقف اعلان کر دیا کہ اس قرار داد سے ریاست پاکستان، ایک اسلامی ریاست ہو گئی ہے،

الزام ب کے سلسلہ میں ہمارا کوئی قصور اس کے سوا نہیں بتایا جا سکتا کہ ہم اسلامی ریاست کے اعلان سے پہلے ملازمین سرکار سے حلفِ وفاداری لئے جانے کو قبل از وقت قرار دیتے تھے۔ اس معاملہ میں ہماری پوزیشن جائز قانونی حدود کے اندر تھی یا ان کے باہر۔ اس نکتہ کو بڑی آسانی کے ساتھ ایک عدالت میں ہم پر مقدمہ چلا کر صاف کیا جا سکتا تھا اور ہم اس کے لئے بالکل تیار تھے۔ مگر یہ بات حکومت خود ہی بتا سکتی ہے کہ اس نے یہ سیدھا اور صاف طریق کار اختیار کرنے سے کیوں پہلو بچایا۔ تاہم

اس معاملہ میں بھی ہمارا اور حکومت کا اختلاف ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ختم ہو گیا۔ قرار داد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد ہم صرف سرکاری ملازمین ہی کا نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فرض اور عین تقاضائے ایمان سمجھتے ہیں کہ کہ ریاست پاکستان کا خیر خواہ اور مخلص خیر خواہ ہو۔

الزام ج اس قدر گھناؤنا ہے کہ اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں دلی نفرت محسوس کرتا ہوں لیکن چونکہ حکومت نے اپنے پریس نوٹ میں اس کا بھی ذکر کر دیا ہے اس لیے میں صرف اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ جو شخص ان جرائم کا مرتکب ہو وہ یقیناً واجب القتل ہے نہ صرف از روئے قانون ملکی بلکہ از روئے شریعت اسلامی بھی۔

الزام د کے بارے میں گذارش ہے کہ میں اور میرے رفقاء اسلام اور خالص اسلام کے سوا اور کوئی اخلاقی یا اجتماعی تصورات رکھتے ہی نہیں میں سال سے جو کچھ میں نے اور مولانا امین احسن صاحب نے لکھا ہے وہ ساری دنیا کے سامنے ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں ہم نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا اخلاقی یا اجتماعی تصور پیش کیا ہے۔ بلاشبہ ہم پہلے بھی یہ کہتے رہے ہیں اور آج بھی کہتے ہیں کہ ہم سب سے پہلے خدا اور اس کے دین کے وفادار ہیں اور پھر اس معاشرے اور ریاست کے جو خدا اور اس کے دین کی مطیع و وفادار ہو۔ قرار داد مقاصد کے پاس ہونے سے پہلے صرف پاکستان کا معاشرہ خدا اور دین خدا کا وفادار تھا۔ مگر ریاست کا معاملہ معلق تھا۔ اس لیے ہم نے کوشش کی کہ اسے بھی اسی وفاداری میں منسلک کر لیا جائے تاکہ ہم ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ اس کے وفادار ہو سکیں۔ جب قرار داد مقاصد پاس ہو گئی تو یہ نزاع بھی ختم ہو گئی۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کون

سا سچا یا جھوٹا تضاد اور تصادم ہے جو اپنے اخلاقی و اجتماعی تصورات کی وفاداری اور ریاست پاکستان کی وفاداری میں ہماری طرف سے پیدا کیا جا رہا ہے۔

میں اپنے مدعا کی طویل ترجمانی کے لئے معذرت خواہ ہوں اور اسے ختم کرتے ہوئے صرف اتنی بات اور عرض کئے دیتا ہوں کہ حکومت جس چیز کا بھی ہم سے انتقام لینا چاہے لے اور جب تک چاہے لیتی رہے۔ انشاء اللہ وہ ہم کو بالکل صابر پائے گی لیکن اگر وہ چاہتی ہے کہ اس کی یہ کارروائی اخلاقی حیثیت سے بھی درست مانی جائے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ غیر اخلاقی طریق کار چھوڑ کر ایسے سیدھے اور معقول طریقے اختیار کئے جائیں جو اخلاقی مسلمات کے مطابق ہوں خواہ ان سے انتقام کے مقاصد پورے ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ انسانی عقل اصولی طور پر اس حقیقت کو جانتی ہے اور اس کے اس وجدانی علم کو کبھی محو نہیں کیا جا سکتا کہ جو روشنی میں آنے سے گھبراتا ہو اور تاریکی ہی میں کام کرنے پر اصرار کرے وہ ضرور اپنے دامن کردار پر کوئی داغ رکھتا ہے جس کے ظاہر ہو جانے کا اسے خوف ہے۔ میری اس صاف گوئی کو احترام حکومت کے منافی نہ سمجھا جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کوئی بات بے احترامی کی نیت سے نہیں لکھی ہے بلکہ جو کچھ بھی لکھا ہے صرف اپنے نقطۂ نظر کو واضح طور پر پیش کرنے کی غرض سے لکھا ہے۔

۳، اکتوبر ۱۹۴۹ء

خاکسار

ابو الاعلیٰ مودودی

نئی سنٹرل جیل ملتان
۲۳ نومبر ۱۹۴۹ء

بھائی صاحب السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

پچھلے خط میں آپ کو اطلاع دے چکا ہوں کہ جو کاغذات آپ نے مانگے تھے میں نے انہیں آپ کے حوالے کرنے کے لئے اجازت طلب کی تھی۔ اب ایک لمبی مدّت کے بعد اس کا جواب مل گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ احکام نظر بندی کی نقلیں دی جا سکتی ہیں۔ رہی میری اس چٹھی کی نقل جو میں نے حکومت کو بھیجی تھی، تو اس کے متعلق سکوت ہے نہ صاف انکار ہی ہے اور نہ اجازت ہی۔ لہٰذا وہ تو میں آپ کو نہ دے سکوں گا۔ البتہ احکامِ نظر بندی کی نقلیں آپ لینا چاہیں تو آئندہ ملاقات کے موقع پر وہ آپ کو دے دوں گا۔

آپ لوگ جب کبھی میری رہائی کے لئے کسی کوشش کا خیال ظاہر کرتے ہیں، میں آپ کو اس سے منع نہیں کرتا، صرف اس وجہ سے کہ آپ لوگوں کی خصوصاً والدہ صاحبہ کی دل شکنی مجھے گوارا نہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ ایک فضول اور غیر ضروری کام ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ ذرا صبر کے ساتھ دیکھتے رہیں کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوتا ہے میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں جنہوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے کیونکہ میدان کے مقابلہ سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت

ہے۔ اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرماں روائی کے لیے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے، اور جن کے لئے حقیقت و صداقت کا روشنی میں آجانا "خطرے" کا حکم رکھتا ہے اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے "سیفٹی" قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولھے پر نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ یہ چیز عقل کے خلاف ہے۔ قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور ہزارہا برس کے تاریخی تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر جینے والے تھوڑی دیر کے لیے چاہے کتنا ہی زور باندھ لیں بہرحال وہ دیر تک نہیں جی سکتے۔ میں اپنی خاطر نہیں خود ان لوگوں کی خاطر ہی یہ چاہتا تھا کہ یہ ہوش کے ناخن لیں اور سیدھے سیدھے بھلے آدمیوں کی طرح کام کریں۔ اس لئے میں نے باہر بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور اب اندر سے بھی اتمامِ حجت کر دیا۔ اب اگر یہ دنیا کی ہزاروں مرتبہ آزمائی ہوئی حماقتوں کا تجربہ کرنے ہی پر مُصر ہیں تو انہیں تجربہ کر لینے دو۔

ابوالاعلیٰ مودودی

بنام جناب ابوالخیر مودودی صاحب لاہور

○

نئی سنٹرل جیل ملتان
۱۳؍ جنوری ۱۹۵۰ء

عزیزم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۸؍ دسمبر ۴۹ء کل ۱۲؍ جنوری کو ملا۔ میں نے پہلے اڑتی ہوئی سی خبر سنی تھی کہ آپ کو بھی نظربندی کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ اب آپ کے خط سے اس کی تصدیق ہوئی۔ اس سعادت کے معاملہ میں کسب کو کچھ دخل نہیں۔ یہ تو ایک وہبی چیز ہے۔

آپ نے اپنی جس اخلاقی لغزش کا ذکر کیا ہے اس میں آپ کے مبتلا ہونے کی اصل وجہ آپ کا بے جا زعم اور اپنی اخلاقی طاقت پر غلط اعتماد تھا۔ آئندہ کے لئے یہ بات بطور اصول ذہن نشین کر لیجئے کہ جو کوئی اپنی طاقت کا غرہ رکھتا ہو اور جان بوجھ کر آزمائش کو دعوت دے اللہ تعالیٰ اُسے ضرور آزمائش میں ڈال دیتا ہے اور پھر اس کی مدد نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے جو شخص خود اپنی عاجزی کا معترف ہو اور خدا سے ہمیشہ عافیت مانگتا رہے اور دعا کرتا رہے کہ ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ، تو اللہ اگر اس پر آزمائش بھیجتا بھی ہے تو اس کے غرور کا سر کچلنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی تربیت کرنے کے لئے بھیجتا ہے اور اس آزمائش کے دوران میں اگر اس بندے کا اخلاص برقرار رہے تو خدا خود اس کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اس سے کامیاب ہو کر نکلے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور سمجھ لیجئے. خالق نے انسان کی فطرت کے لئے جو خوبی رکھی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہی نہ ہو۔ یہ خوبی انسان کے لئے نہیں بلکہ فرشتوں کے لئے رکھی گئی ہے. انسان کے لئے اصل خوبی یہ ہے کہ جب کبھی بشری کمزوری سے کوئی قصور اس سے سرزد ہو جائے تو جلدی سے جلدی وہ سنبھلے اور اس پر شرمسار و نادم ہو اور اصلاح کی کوشش اور اپنے اس قصور کی تلافی کرے اس معاملہ میں جو شخص تساہل برتتا ہے اور جھوٹی تاویلیں کر کر کے اپنے نفس کو خود — [illegible] کر دیتا. چلا جاتا ہے اس کا حال بالآخر چوہڑے جیسا ہو جاتا ہے. کہ ہر وقت گندگی میں پڑا رہتا ہے اور اسے کچھ احساس نہیں ہوتا کہ کس حال میں مبتلا ہے. بخلاف اس کے جو شخص ہر لغزش پر سنبھل جاتا ہے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے. اور اصلاح و تلافی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اس سے اگر ہزار مرتبہ بھی لغزش ہو جائے تب بھی اس کی فطرت گندی نہیں ہو سکتی. گندگی صرف اوپر ہی اس کو لگے گی اور بار بار دھلتی رہے گی۔ بلکہ اگر وہ نیک نیتی و اخلاص کے ساتھ توبہ و اصلاح کرتا رہے تو اسی چیز سے بالآخر اس کے اندر اتنی قوت بھی پیدا ہو جائے گی کہ وہ آزمائشوں کا مقابلہ زیادہ مضبوطی سے کر سکے گا.

ابوالاعلیٰ مودودی

بنام نذر الرحمٰن صاحب حافظ آباد

نئی سنٹرل جیل ملتان
۲۸ اپریل ۱۹۵۰ء

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

عنایت نامہ مورخہ ۱۴ اپریل مجھے ۲۷ اپریل کو وصول ہوا صحرائی صاحب کی مجھ سے یا میرے رفقا سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس بات کی تو سرکاری ذرائع سے بھی تحقیق کی جا سکتی ہے کہ آخر وہ مجھ سے کب ملے اور کیسے مل سکتے تھے؟ آپ کے باقی ماندہ سوالات ایسی صورت میں غیر متعلق ہو جاتے ہیں جب کہ سرے سے کوئی ملاقات ہوئی ہی نہیں۔

برادرم! میں اس وقت ایسی پوزیشن میں ہوں کہ اپنے خلاف کسی الزام کی تردید کرنا تو درکنار، اکثر حالات میں یہ جاننا بھی میرے لئے مشکل ہے کہ باہر کیا الزام مجھ پر لگایا جا رہا ہے، یہ ایک نادر موقع ہے جس کے لئے بھی مجھ پر حملہ آور ہونا مفید ہو سکتا ہو اس کو ضرور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ انسان کا گوشت ویسے ہی ایک لذیذ چیز ہے پھر جب کہ وہ مفت بٹ رہا ہو تو ہمارے موجودہ اخلاقی ماحول میں بھلا ایسے زاہد کتنے نکل آئیں گے جو اس سے متمتع ہونے میں تامل کر جائیں۔

صحرائی صاحب نے تو جو کچھ کیا اس کا مجھے کوئی رنج نہیں، کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے اور جانتے بھی ہوں تو ان کے کرنے کا کام وہی ہے جو انہوں نے کیا۔ مگر آپ نے جو مجھ سے یہ پوچھا کہ: کیا تو نے پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار کیا اور کیا تو نے قائد اعظم

مرحوم کو گالیاں دیں، اس سے فی الواقع مجھے بڑی اذیت ہوئی، کیونکہ آپ سے میری توقعات کچھ اور تھیں۔ برادرِ عزیز! کیا اب کوئی ذلیل سے ذلیل بہتان بھی میرے مرتبے سے اتنا فروتر نہیں رہا کہ آپ اسے سُن کر سُبحانَکَ ھٰذا بہتان عظیم کہہ سکیں اور مجھ سے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں؟ اور بالفرض اگر تحقیق کرنا ضروری ہی تھا تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی اجنبی اور غیر معروف آدمی تو نہیں ہوں۔ کم و بیش تیس سال سے پبلک لائف میں ہوں۔ برسوں اخبار نویسی کر چکا ہوں۔ سترہ اٹھارہ برس سے "ترجمان القرآن" نکال رہا ہوں۔ کتابوں اور رسالوں کی شکل میں میرے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے موجود ہیں جن کو بلا مبالغہ لاکھوں آدمی پڑھ چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں ہزارہا آدمی ایسے موجود ہیں جنہوں نے اپنے کانوں سے میری تقریریں سنی ہیں۔ ہزاروں آدمی ذاتی طور پر میرے جاننے والے موجود ہیں۔ خود شہر لاہور میں برسوں رہ چکا ہوں۔ آپ نے کیوں نہ پبلک میں اعلان کیا کہ جو شخص ابوالاعلیٰ کو ایک بدزبان اور یاوہ گو انسان کی حیثیت سے جانتا یا جس نے اس کو کبھی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن و بدخواہ کی حیثیت سے جانا ہو وہ اپنی شہادت پیش کرے؟ آپ نے کیوں نہ میرے نئے اور پرانے ہمسایوں سے پوچھا کہ انہوں نے کبھی کوئی گالی یا بیہودہ بات میری زبان سے سنی ہے؟ آپ نے کیوں نہ میرے ذاتی ملازموں سے پوچھا کہ میں نے کبھی ان کو سخت سست کہا ہے؟ نہیں، بلکہ جو لوگ وقتاً فوقتاً مجھ کو گالیاں دیتے رہتے ہیں اور آج بھی گالیوں سے نواز رہے ہیں۔ آپ نے انہی سے قسم دے کر پوچھ لیا ہوتا کہ کبھی میں نے بھی ان کی گالی کا جواب گالی سے دیا ہے؟ یہ ساری شہادتیں اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہوتیں،

تو البتہ آپ حق بجانب تھے کہ مجھ سے دریافت فرماتے۔)

"پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار"۔ اور وہ بھی میری زبان سے! سبحان اللہ! میرے عزیز! تھوڑی دیر کے لئے دین و ملت کے سوال کو بھی نظر انداز کر دیجئے۔ خالص مادی نقطۂ نظر ہی سے دیکھئے تو بھلا یہ کوئی عقل میں آنے کی بات ہے کہ جو شخص خود اپنے بال بچوں سمیت اس کشتی میں سوار ہے وہ اس میں چھید کرے گا؟ کیا وہ خود یہ چاہے گا کہ اس کا اور اس کی بیوی اور بیٹیوں اور بچوں کا وہی حشر ہو جو اس کی آنکھیں مشرقی پنجاب میں اپنی قوم کی بہنوں اور بیٹیوں کا دیکھ چکی ہیں؟ اس قسم کا عجیب سوال مجھ سے کرنے کے بجائے آپ نے جیل کے ڈاکٹر سے پوچھا ہوتا کہ ابوالاعلیٰ اس قید کے زمانہ میں کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ اگر میں عقل و خرد سے محروم نہیں ہوں تو کیا غیرت، حمیت، شرافت سب آپ ہی لوگوں کے حصہ میں آ گئی ہے۔ میرے اندر اس کا شائبہ بھی نہیں رہا؟

ابوالاعلیٰ مودودی

بنام شورش کاشمیری۔ مدیر چٹان، لاہور

○

نئی سنٹرل جیل ملتان

۶۔ اپریل ۵۰ء

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ یکم مارچ مجھے یہاں یکم اپریل کو ملا۔ جواب میں مزید تاخیر اس لئے ہوئی کہ میرے پاس خط لکھنے کا کاغذ موجود نہ تھا۔ امید ہے کہ میری مجبوری کو پیش نظر رکھ کر تاخیرِ جواب کو معاف فرمائیں گے۔ آپ کی اور سب احباب کی یاد فرمائی کا میں بھی شکر گذار ہوں اور میرے دونوں ساتھی بھی۔ ہم بھی آپ سب کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کا رہنما اور ولی و مددگار ہو۔

میری جس عبارت کا آپ نے حوالہ دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں میری جو گفتگو نقل کی ہے، ان دونوں میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ مقدم الذکر عبارت کا اصل منشا صرف یہ بتانا ہے کہ اسلام کا مزاج موجودہ زمانے کی انقلابی تحریکوں کے مزاج سے مختلف ہے۔ آج کل کی انقلابی تحریکیں اوّل تو ان سب لوگوں کے خلاف سخت انتقامی کارروائیاں کرتی ہیں جو ان کی کامیابی کی راہ میں مزاحم رہے ہوں، دوسرے وہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام قائم کرنے میں سخت اکھیڑ پچھاڑ اور توڑ پھوڑ کا طریقہ استعمال کرتی ہیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتیں کہ اس تغیر و تبدل سے کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ بندگانِ خدا تباہ ہو جائیں گے۔ اسلام اس کے برعکس جب کامیابی (یعنی حکمرانی) کے مرحلے پر پہنچتا ہے تو وہ بالعموم انتقام

کے بجائے عفو و درگزر کی پالیسی پر عمل کرتا ہے ۔ اور سابق نظام کی خرابیوں کو بدلنے اور ان کی جگہ اپنا اصلاحی پروگرام نافذ کرنے میں بھی اس کی عام پالیسی یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نرمی اور تدریج کے ساتھ اصلاح کی جائے اور انسانی زندگی کو طوفان خیز تغیرات سے جس حد تک بھی ممکن ہو بچایا جائے ۔ اسلام کی اس پالیسی کو بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ روح اسلام سے نابلد لوگ اصلاح کے غیر حکیمانہ جوش میں دنیا کے چلتے ہوئے انقلابی مسلکوں کی جو نقل اتارنا چاہتے ہیں اور پھر اپنی اس نقالی پر اسلام کا لیبل بھی چپکا دیتے ہیں ۔ ان کے طریق فکر کی غلطی واضح کردوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو صریح اور ثابت شدہ بے انصافیاں ہمارے نظام معاشی یا نظام معاشرت میں موجود ہوں ان کا تدارک کرنے میں اسلام کی مذکورہ بالا پالیسی مانع ہو ۔ اگر ہمیں تحقیق سے معلوم ہو جائے کہ ایک چیز قائم ہی ظلم پر ہوئی ہے اور اس بات کا ثبوت مل جائے کہ اس چیز کے لئے فی الاصل کوئی بنیاد موجود نہیں ہے تو ہم اس میں تغیر ، تبدل ، تنسیخ سب ہی کچھ کر سکتے ہیں ۔ بشرطیکہ یہ جو کچھ بھی کیا جائے اسلامی نظریات کی بنا پر کیا جائے ، نہ یہ کہ نظریات و تصورات تو لائے جائیں کہیں اور سے ، اور استعمال کیا جائے اس کے لئے اسلام کا نام ۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جب اسلامی نظام کے قیام سے قبل ایک مدت دراز تک سارا لین دین اور معاشی کاروبار غیر اسلامی قوانین پر چلتا رہا ہو تو اس مدت کی ساری ہی ملکیتیں مشتبہ ہو جاتی ہیں ۔ خواہ وہ زمینیں ہوں ، یا مکانات ، یا کپڑے اور برتن اور فرنیچر اور سواریاں یا بینکوں کے ڈیپازٹ یا تجارتی کمپنیوں کے حصے یا اور دوسری قسم کی جائدادیں ۔ اب یہ بہر حال ممکن نہیں ہے کہ اسلامی نظام قائم

ہونے پر ان سب کو منسوخ کر کے نئی تقسیم کی جائے، یا ان میں سے ہر ایک کی حیثیت معلوم کی جائے اور صرف ان ملکیتوں کو باقی رکھا جائے جو اسلامی قانون کے لحاظ سے جائز طریقہ پر حاصل کی گئی ہوں۔ بالعموم تو وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو قرآن میں متعدد مواقع پر کسی چیز کی حرمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پہلے جو ہو چکا ہے سو ہو چکا (یعنی یہ حکم Retrospective effect نہیں رکھتا، آئندہ کے لئے اپنے عمل کی اصلاح کرو۔ البتہ جن خاص امور میں ہم کو متعین طور پر معلوم ہو کہ ظلم اور بے انصافی کی کوئی مخصوص شکل کسی بڑے پیمانے پر رائج رہی ہے، اور اس کی تحقیق و تلافی انصاف کے ساتھ کی جا سکتی ہو ایسے معاملات میں مذکورہ بالا عام اصول سے ہٹ کر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک زمینوں کی ملکیت اور سابق حکومتوں کی عطا کردہ اراضی اور جاگیرات کا تعلق ہے، ان سب پر کوئی ایک حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ جن زمینداروں کی اصل اتنی قدیم ہے کہ ان کی تحقیق ممکن نہیں ہے۔ وہ منسوخ کرنے کی نہیں بلکہ برقرار رہنے کی مستحق ہیں، کیونکہ اصول یہ ہے کہ منسوخ اسے کیا جائے گا جس کا ناجائز ہونا ثابت ہو جائے نہ کہ ہر اس جائداد کو جس کا جائز ہونا ثابت نہ ہو۔ اسی طرح زر خرید زمین کو بھی خواہ اس کا رقبہ کتنا ہی ہو، نہیں چھینا جا سکتا۔ البتہ وہ زمینداریاں منسوخ کرنے کے لائق ہیں جن کی نوعیت دراصل نائب تحصیلداری کی تھی مگر سابق حکومت نے زبردستی، سراسر ناجائز طور پر ان کو مالکانہ حیثیت دے دی تھی، علیٰ ہذا القیاس سابق حکومتوں کے سارے عطیے باطل ہی نہ تھے۔ ہر ایک کے کاغذات کو دیکھ کر ہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ان میں سے کون جائز نوعیت کے تھے، اور کون ناجائز۔ اسی بنا پر

میں نے اپنی کتاب "ملکیت زمین" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بے لگام انقلابی فلسفوں کی تقلید میں اندھا دھند احکام لگانے کے بجائے تمام زمینداریوں اور جاگیروں کی باقاعدہ تحقیق ہونی چاہیئے نیز یہ کہ جس انصاف کے مستحق کاشتکار ہیں وہ ان کے ساتھ اور جس انصاف کے مستحق مالکان ہیں وہ ان کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ اگر زمینداروں کی خاطر کاشتکاروں کی حق ماری ظلم ہے تو کاشتکاروں کی خاطر زمینداروں کی حق ماری بھی ظلم ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی

بنام جناب چوہدری غلام محمد صاحب۔ کراچی

○

دارالاسلام پٹھانکوٹ
۱۹۴۱ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کی تحریر میں نے رات ہی کو دیکھی۔ اس کے بعد سونا چاہا مگر سو نہ سکا اس لیے رات ہی کو لکھنے بیٹھ گیا۔ میرے لیے اس میں کوئی چیز رنج پہنچانے والی نہیں ہے۔ بلکہ میں خوش ہوں کہ آپ نے جو کچھ محسوس کیا اور سوچا سمجھا اسے صاف صاف لکھ دیا۔ صرف افسوس اگر ہے تو اس کا کہ آپ نے بات کے انتہائی حدود تک پہنچ جانے کے بعد مجھ سے رجوع کیا۔ ورنہ ابتدائی مراحل ہی میں آپ مجھے اپنے خیالات

سے آگاہ کر دیتے تو شاید حل اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا اب ہو گیا ہے۔ البتہ جس چیز نے مجھے نیند سے محروم کر دیا وہ دراصل یہ ہے کہ میں برسوں کی سعی و جہد کو اس نتیجہ پر ختم ہوتے ہوئے ٹھنڈے دل سے گوارہ نہیں کر سکتا۔ اگر یہ سعی و جہد اپنی ذات کے لئے ہوتی تو خدا کی قسم اس سے بھی زیادہ کسی بُرے نتیجہ پر اس کے ختم ہونے کی مجھے کچھ پرواہ نہ ہوتی۔ مگر جبکہ یہ خدا کے لئے اور اس کے دین کے لئے تھی، تو میرے لئے بہت مشکل ہے کہ میں اس بدانجامی پر اس کے ختم ہونے کو اطمینان کے ساتھ برداشت کر لوں اس لئے میں ایک آخری کوشش اس کے بچانے کی کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ مصرف القلوب ہے ممکن ہے کہ آپ اور دوسرے لوگ جو ایک پہلو سے سارے معاملہ کو دیکھ رہے ہیں اگر ان کے سامنے وہ دوسرا پہلو بھی رکھ دوں شاید یہ کام بربادی سے بچ جائے۔

پہلا سوال جس پر آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والوں کو غور کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اس کام کی طرف جس چیز کی کشش نے کھینچا وہ کیا چیز تھی؛ اگر وہ میری ذات کی کشش تھی تو وہ بجائے خود نہایت غلط چیز تھی، اس کی طرف آپ کو کھنچنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ اور اب خدا کا بڑا فضل ہوا کہ وہ کشش باقی نہ رہی ایسے ایک نامبارک تألف و اجتماع سے لاکھ درجہ زیادہ بہتر ہے کہ آپ سب بکھر جائیں۔ اور اگر وہ اقامتِ دینِ حق کے نصب العین کی کشش تھی اور اگر اس کی طرف کھنچنے کے لئے آپ لوگوں کو مجبور کرنے والی طاقت دراصل اس احساس کی طاقت تھی کہ اس نصب العین کے لئے کوشش کرنا مسلمان ہونے کا عین اقتضا ہے اور اس کوشش کی صحیح صورت یہی ہے کہ اجتماعی طور پر کام کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ محض ایک میرے نااہل ثابت ہو جانے سے آپ لوگ اس قدر

جلدی اور تن آسانی سے بکھر جانے پر کیسے آمادہ ہو گئے۔ کیا اس نصب العین میں اب کشش نہ رہی؟ ایک شخص کی نالائقی سے وہ نصب العین حق نہ رہا؟ یا اب یہ انکشاف ہوا کہ اس کے لئے کوشش کرنا مسلمان ہونے کا اقتضا نہیں؟ یا اجتماعی سعی اب اس کے لئے غیر ضروری ہو گئی؟ اگر ان میں سے کوئی صورت نہیں ہے بلکہ صرف ایک شخص نالائق ثابت ہوا ہے تو بجائے اس کے کہ آپ اس شخص کو اس کام پر قربان کرنے پر آمادہ ہوتے، آپ نے اس ایک حد تک بنے ہوئے کام کو اس پر قربان کرنے کا کیوں ارادہ کر لیا۔ اشخاص نصب العین کے لئے۔۔۔۔ ہوتے ہیں، نصب العین اشخاص کے لئے نہیں ہوتے۔ نصب العین اگر عزیز تر ہے تو آپ کو ہر اس محبت اور تعلق پر چھری چلا دینی چاہیئے جو اس کی راہ میں روڑا بنتی ہو، چاہے وہ باپ اور بیٹے کی محبت ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا سوال جس پر آپ حضرات کو اپنی قوتِ فکر صرف کرنی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں آپ کی مسئولیت کس چیز پر ہے۔ آیا اس پر ہے کہ اس نصب العین کے لئے آپ جو کچھ کر سکتے تھے وہ آپ نے کیا یا نہیں؟ یا اس پر کہ جو کچھ نہیں کر سکتے تھے وہ کیا یا نہیں؟ آپ سے یہ پوچھا جائے گا کہ جو اسباب و وسائل تم کو میسر تھے ان سے تم نے کیا اور کتنا کام لیا؟ یا یہ پوچھا جائے گا کہ جو اسباب و وسائل میسر نہ تھے ان سے کیوں کام نہیں لیا؟ نیز کیا آپ یہ جواب دہی کر سکیں گے کہ ہم جس معیار کے اسباب و وسائل چاہتے تھے، چونکہ وہ میسر نہ آئے تھے لہٰذا ہم نے کام نہیں کیا اور جو تھوڑا بہت کام ابتداء میں کیا بھی تھا اسے بھی ملیا میٹ کر آئے ہیں؟ خصوصاً جب کہ وہ معیار جو آپ نے اسباب و وسائل کے لئے تجویز

کیا ہے منصوص نہیں ہے اور خدا اور رسولؐ نے اس معیار کے اسباب و وسائل کی فراہمی کو اس خدمت کی انجام دہی کے لیے شرط نہیں ٹھہرایا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ محض یہ عذر کہ اس معیار کے وسائل فراہم نہیں ہوئے. آپ کو کام نہ کرنے اور شروع کیے ہوئے کام ملیامیٹ کر دینے پر خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا اور اس پر جو مواخذہ ہوگا وہ غالباً اس مواخذہ سے شدید تر ہوگا جس کا خطرہ آپ نے اپنی تحریر میں ظاہر کیا ہے۔

ان دو سوالات پر غور کرنے سے مجھے امید ہے کہ آپ کو بآسانی وہ راستہ سوجھ جائے گا جو اس حالت میں اختیار کرنا چاہیے سب سے پہلی بات جو آپ لوگوں کو قطعی طور پر طے کر لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ اقامتِ دین کے لیے اجتماعی کوشش بہرحال کرنی ہے اور یہ کوشش جس مرحلہ تک پہنچی ہے یا پہنچ چکی ہے اسے اس سے پیچھے نہیں جانے دینا ہے بلکہ آگے بڑھانا ہے۔ اور اس کے آگے بڑھانے میں جو چیز بھی سدِ راہ ہو اسے اٹھا کر پھینک دینا ہے۔ خواہ وہ امیرِ جماعت ہو یا اپنی جماعت کا کوئی رفیق ہو یا ہمارے باپ بھائی، اولاد، اقارب ہوں یا ہمارے شخصی کاروبار اور وسائل معیشت ہوں۔

دوسری بات جو طے کر لینی ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ جو اسباب و وسائل ہمیں میسر ہیں انہی سے کام لینا ہے۔ کیونکہ ہم خدا کے سامنے انہی پر مسئول ہیں اسباب و وسائل کی تعریف میں جس طرح روپیہ آلات اور مادی قوی آتے ہیں اسی طرح انسان بھی اسی تعریف میں آتے ہیں۔ جو انسان ہمیں میسر ہیں ہم کو اپنے مقصد کی راہ میں جدوجہد کرنے کے لیے انہی سے کام لینا ہے فرشتے

لانے کے لئے ہم مکلف نہیں ہیں۔ نہ یہ کسی نص میں تصریح ہے کہ اس معیار کے آدمی اگر فراہم نہ ہوں تو اقامتِ دین کی سعی کا فرض تم سے ساقط ہے۔ نہ یہ کہیں لکھا ہے کہ اقامتِ دین کی سعی اگر تم نے شروع کی اور کسی مرحلہ پر جاکر معلوم ہوا کہ فلاں فلاں معیار کے اشخاص موجود نہیں ہیں تو جتنا کام تم کر چکے ہو اسے بھی فوراً ملیامیٹ کر دو ورنہ خدا کے ہاں پکڑے جاؤ گے۔ ایسی کوئی ہدایت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہیں ہے۔ اپنی خود ساختہ شرطوں اور معیاروں کو لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے۔ ایک شخص اگر نالائق ثابت ہوا ہے تو پھر سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور اسے ہٹا کر اپنے میں سے کسی دوسرے شخص کو لیڈر بنانا چاہیئے اور مسلسل کام کرتے رہنا چاہیئے تا آنکہ اللہ تعالٰی کوئی ایسا شخص پیدا کر دے جس کی کاملیت پر سب لوگ یا بیشتر لوگ مطمئن ہو جائیں۔ بہرحال جو اشخاص موجود ہیں اور میسر آسکتے ہیں انہی میں سے کسی اصلح آدمی کو منتخب کرنا لازم ہے۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یکے بعد دیگرے دس آدمی بھی میری طرح مایوس کن ثابت ہوں تو ہم گیارھویں آدمی کو ان کی جگہ لے آئیں۔ میرا دل اس منطق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ تو نااہل ثابت ہوا اور میں خود اپنے کو بھی نااہل سمجھتا ہوں اور کوئی تیسرا آئے تو مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں مجھ سے اور تجھ سے زیادہ نااہل نہ نکل آئے۔ لہٰذا یہ ساری بساط لپیٹ دی جائے۔

بر سبیل تذکرہ یہ بھی عرض کر دوں کہ اب تک میں نے جس طریق پر کام کیا ہے اس کی بنیاد انہی دو امور پر ہے جن کا اوپر ذکر کر آیا ہوں اولاً میں نے اپنے دل میں اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ اقامتِ دین کے لئے اجتماعی کوشش بہرحال کرنی

ہے خواہ بُری یا بھلی، دوسرے یہ کہ جو اسباب و وسائل میسّر ہیں انہی سے کام لینا ہے اور بلند معیار تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے ساتھ جیسا کچھ پست معیار اسوقت پایا جاتا ہے اس کو انتہائی ممکن حد تک استعمال کرنا ہے۔ جہاں تک میری اپنی کمزوریوں کا تعلق ہے آپ اس سے جس قدر واقف ہیں میں اس سے بہت زیادہ ان کو جانتا ہوں مگر ان کو جاننے کے باوجود میں نے اس بارِ عظیم کو اٹھانے کی ہمت صرف اس لئے کی کہ جو قوتیں مجھ میں نہیں ہیں یا جن کی میرے اندر کمی ہے ان کے فقدان یا قلت سے دل شکستہ ہو کر ان قوتوں سے بھی کام نہ لینا جو میرے اندر ہیں میرے نزدیک حرام ہے اور میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ اگر اونچے درجہ کا کام نہیں ہو سکتا تو جس درجہ کا کام ہو سکتا ہے وہ بھی نہ کیا جائے اسی طرح میں اپنے رفقاء سے بھی فرداً فرداً اکثر و بیشتر کی کمزوریوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے قریبی رفیقوں میں، مدتوں سے کام کرنے والوں میں، اور ان لوگوں میں جن پر میں نے ذمہ داری کے کاموں کا بوجھ ڈالا ہے۔ متعدد اشخاص ایسے ہیں جن سے مجھے نہایت تلخ تجربے ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں لیکن میں ان سے مایوس نہیں ہوا نہ کبھی میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ایسے ناقدر شناس ناکارہ اور اخلاقی کمزوریوں سے بھرے ہوئے لوگوں کو لے کر کیا کام کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ نہایت صبر کے ساتھ ان کی کمزوریوں کو برداشت کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ برے یا بھلے جیسے آدمی بھی میسّر ہیں انہیں ساتھ لے کر کام کرنا چاہیئے اور ساتھ ساتھ ان کی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اس بلند معیار سے واقف نہیں ہوں جو اس کام کے لئے مطلوب

ہے۔ نہیں، معیار میری نگاہ میں بھی اسی طرح واضح ہے جس طرح آپ کی نگاہ میں ہے۔ اور اس کے لحاظ سے میں اپنی اور سب لوگوں کی پستی و بلندی کا اندازہ قریب قریب صحت کے ساتھ کرتا ہوں، لیکن میرے اور آپ لوگوں کے نقطۂ نظر میں فرق صرف یہ ہے کہ میں اعلیٰ معیار کو کام کرنے کے لئے شرط نہیں سمجھتا بلکہ صرف مطلوب سمجھتا ہوں جسے حتی الامکان تلاش اور حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن کم سے کم ناگزیر معیار تک جتنے لوگ بھی ملیں ان سے کام لینے میں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ ٹھنڈے دل سے اس طرزِ عمل پر غور کریں اور اگر دل گواہی دے کہ کام اسی طرح ہو سکتا ہے تو یہی طرزِ عمل اختیار کریں۔۔۔۔ بورڈ کی تجویز کو میں ناقابلِ عمل سمجھتا ہوں، اگر بورڈ بنا یا بھی جائے تو بہرحال صدر ناگزیر ہے، جس کے ہاتھ میں بڑی حد تک امارت کے اختیارات دینے پڑیں گے ورنہ وہی حشر ہو گا جو میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈ کا ہوتا ہے۔ خصوصاً ایک تحریک کو چلانے کے لئے بورڈ کبھی موزوں نہیں ہوتے۔ ان کے لئے لیڈر بہرحال ضروری ہے۔ لہٰذا جماعت کا ایک اجتماع کر کے لیڈر ضرور منتخب کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ معیار مطلوب سے نیچا ہی کیوں نہ ہو، رہا میں، تو میں نہ پہلے اس منصب کا خواہشمند تھا نہ اب ہوں بلکہ خدا سے چاہتا ہوں کہ کوئی دوسرا شخص مجھے اس بار سے سبکدوش کر دے۔ البتہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کہ سر سے یہ بار ہی اتار کر پھینک دیا جائے اور ساری بساط لپیٹ کر ہم سب حسب سابق انفرادی وعظ گوئی میں لگ جائیں۔

یہاں تک جماعت اور اس کے مستقبل کے متعلق گفتگو تھی۔ اب میں

اپنی ذات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس کی غرض نہ اپنی صفائی پیش کرنا ہے اور نہ امارت اور قیادت کے لیے اپنی اہلیت ثابت کرنا بلکہ میں جس غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتا ہوں بعض امور میں آپ سے رہنمائی چاہتا ہوں اور بعض معاملات کو جن کا آپ نے ذکر کیا ہے صاف کرنے کے لئے کچھ تجویزیں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان میں آپ مجھے مشورہ دے سکیں۔

سب سے پہلے میں غلط فہمیوں کو صاف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ سے جن صاحب نے یہ بیان کیا کہ میں نے اپنے موجودہ طرز معیشت کو حق بجانب ثابت کرتے ہوئے ان سے یہ کہا کہ "اگر میں اس حیثیت سے اپنے معیار کو نیچے اتار لوں تو پھر لوگوں پر میرا کوئی خاص اثر اور اقتدار نہیں رہے گا اور پھر میری بات میں وزن نہیں مانا جائے گا"۔ انہوں نے اصل بات کو بالکل غلط رنگ میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مجھ سے مطالبہ فرمایا تھا کہ میں ترجمان القرآن اور رسالہ دینیات وغیرہ کو بھی اپنی دوسری کتابوں کی طرح جماعت کی ملک بنا دوں اور جماعت کے فنڈ سے تنخواہ لیا کروں۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اور ان سے کہا کہ اولاً آپ کا یہ مطالبہ غیر شرعی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ سب لوگ اپنے وسائل معیشت جماعت کے حوالہ کر دیں اور جماعت کے تنخواہ دار کارکن بن کر رہیں۔ یہ مارکس اور لینین کی شریعت کا قاعدہ ہے نہ کہ خدا اور رسولؐ کی شریعت کا۔ ثانیاً اگر میں آپ کے اس مطالبہ پر عمل کر دوں تو میرے لیے اخلاق حسنہ کی پرورش کا ایک دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا جب تک میں اپنی معیشت میں آزاد ہوں، میرے لئے موقع ہے کہ خدا کے کام میں اپنے

اختیار سے جہاں جتنا چاہوں خرچ کروں لیکن آپ مجھے پابند بنا کر باختیار خود راہ خدا میں خرچ کرنے کا دروازہ مجھ پر بند کرنا چاہتے ہیں۔ ثالثاً جماعت کے فنڈ سے تنخواہ لے کر کام کرنے کی صورت میں میری بات کا وہ وزن نہیں ہو سکتا جو اب ایک بے غرض اور بے لاگ آدمی ہونے کی حیثیت سے ہے اور قریبی دور کے تجربہ سے یہی معلوم ہوا ہے کہ جس نے بھی جماعتی فنڈ سے تنخواہ لے کر کام کیا ہے وہ پھر جماعت کی قیادت کا کام نہیں کر سکا ہے۔ یہ تھی اصل بات جس کو اس طرح مسخ کر کے آپ سے بیان کیا گیا۔ لوگوں کے ساتھ میرے طرزِ عمل کے متعلق جو شکایات ہیں ان کو میں قطعاً بے اصل سمجھتا ہوں، جہاں تک میرا اندازہ ہے اس معاملہ میں آپ نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ آپ کے اپنے احساسات نہیں ہیں بلکہ وہ روایات ہیں جو میرے چند عنایت فرما ایک مدت سے میرے متعلق پھیلا رہے ہیں، اور صرف آپ ہی سے نہیں بلکہ اکثر لوگوں سے نہایت ہمدردانہ اور خیر خواہانہ رنگ میں انہیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں کو بدگمان کرنے اور جماعت کے اندر بددلی پھیلانے میں ان حضرات نے کافی سعی کی ہے اور یہی نہیں تاہنوز اس عنایت کا سلسلہ جاری ہے۔ میں اب تک خود نہیں سمجھ سکا ہوں کہ یہ کس گناہ کی سزا ہے جو مجھے دی جا رہی ہے جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے ان کے ساتھ ہمیشہ بھلائی ہی کی حتیٰ کہ ان کے ایسے قصوروں تک سے چشم پوشی کی ہے جن پر میں سختی سے بازپرس کر سکتا تھا، لیکن ان کا طرزِ عمل میرے ساتھ یہ ہے کہ میری حرکات و سکنات کو خوردبین لگا کر دیکھتے رہتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب معنی نکال نکال کر اپنی مجلسوں میں اکثر انہیں موضوعِ گفتگو بنایا کرتے ہیں اور دوسرے

لوگوں کے سامنے نہایت اخلاص کے ساتھ انہیں بیان کرتے ہیں۔

آپ نے خود اگر یہ محسوس کیا ہے کہ بعض لوگوں کیساتھ میں بے رُخی برتتا ہوں تو اس کو غلط رنگ میں دیکھنے پر آپ مجبور ہیں، کیونکہ آپ کو حقیقت کا علم نہیں ہے میں ان لوگوں سے واقف ہوں اور اب میرے دل میں ان کے لئے کچھ زیادہ جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ اس لئے فطرتاً ان کے ساتھ حسن التفات نہیں برت سکتا لیکن آپ کو اس معاملہ کا علم نہیں ہے اس لئے آپ کا اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا حق بجانب ہے۔ جہاں تک تقوے کا تعلق ہے میں خود اس معاملہ میں اپنے اندر بہت کمی محسوس کرتا ہوں اور اصلاح کی کوشش کر رہا ہوں آپ کو معلوم ہے کہ میں کبھی اس بات پر بُرا نہیں مانتا کہ کوئی شخص میری کسی غلطی یا کوتاہی یا گناہ کو دیکھے اور مجھے اس پر ٹوک دے، بُرا ماننا تو درکنار میں تو ایسے شخص کا شکر گزار ہوتا ہوں۔ لہٰذا جہاں جو کوتاہی بھی آپ لوگ دیکھیں اس پر مجھے متنبہ کر دیں، اپنی اصلاح کے لئے میں خود کوشاں ہوں اور آپ لوگوں سے بھی مدد کا متوقع ہوں۔ البتہ یہ بات میرے لئے خلاف توقع ہے کہ میری کمزوریوں کو اس کام ہی کے ختم کر دینے کیلئے حیلہ بنا یا جائے

میری معاشرت کا جو معیار ہے اس میں جس قسم کا تغیر آپ حضرات کے نزدیک ضروری ہے اس کے متعلق مجھے بے تکلف مشورہ دیجئے۔ اگر موجودہ حالات میں میرے لئے یہ ممکن ہوا کہ باسانی وہ تغیر کر سکوں تو بہتر ہے اور اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ اس حد تک تغیر کو میرے اہل وعیال برداشت نہ کر سکیں گے تو مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے۔ جو چیز بھی نصب العین کی راہ میں رکاوٹ ہو اسے میں راستہ سے ہٹا دوں گا خواہ وہ بیوی ہو یا اولاد یا کوئی اور چیز۔

آپ کا یہ اندازہ کہ میں ایک نیا دار المصنفین یا ایک جدید قسم کا دار العلوم بنا دینے سے زیادہ کوئی عزم نہیں رکھتا، ایک غلط اندازہ ہے۔ اگر آپ اس معاملہ میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کر لیتے۔ تو آپ کو اس نقشہ کا علم ہو جاتا جس پر میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ معلوم ہو جاتا کہ میرا عزم کیا ہے؟ آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تو اس کے سوا کچھ کرنے کا اہل نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی رائے قائم کرنے کا آپ کو اور ہر شخص کو حق ہے لیکن میرے عزم کے متعلق مجھ سے پوچھئے کہ کیا ہے۔ خود اپنے گمان سے ایک عزم میری طرف منسوب نہ کر دیجئے۔

آپ کا یہ اندازہ بھی صحیح نہیں ہے کہ کسی اجتماعی کام کو منظم کر کے چلانے اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت یا طاقت نہیں رکھتا اور شاید ان ذمہ داریوں کا پورا احساس بھی مجھے نہیں ہوتا۔ اس قسم کے خیالات قائم کرنے سے پہلے کبھی میری مشکلات اور مجبوریوں کو بھی پوچھئے۔ اگر آپ بھی ایک بیرونی ناظر کی طرح معاملات کو دیکھیں اور چند قیاسات قائم کر کے الگ ہو جائیں تو یہ ستم ہے۔ ذرا شریک کار بن کر دیکھئے کہ کس قسم کے آدمیوں سے کام لینا پڑ رہا ہے اور کن مشکلات سے میں گذر رہا ہوں۔ میں نے اب تک یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ شریک کار ہیں بلکہ اس کے برعکس میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ کو اس کام میں وہ دلچسپی نہیں ہے جو آدمی کو اپنے کام سے ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے ابھی تک آپ کو حقیقی صورت حال سے آگاہ بھی نہیں کیا ہے کیونکہ (معاف کیجئے) میں آپ کو اب تک اس درجہ میں سمجھتا ہوں کہ جس اوکھلی میں میں نے سر دیا ہے اس کے دھمکوں سے آپ کو باخبر کر دوں تو آپ اس میں میرے ساتھ اپنا سر رکھنے کے بجائے الٹے بانس بریلی

واپس تشریف لے جائیں گے۔

مالی معاملات کے متعلق یہ عرض ہے کہ پریس پر جماعت کا جو روپیہ صرف ہوا ہے میں اپنے ذمّہ لینے اور اس کو اپنی ذمّہ داری پر چلانے کے لئے تیار ہوں۔ جماعت کے بکڈپو کو میں ترجمان سے پہلے ہی الگ کر چکا ہوں۔ اب میرا خود یہ ارادہ ہے کہ چند ذمّہ دار لوگ یہاں موجود ہوں تو مالیات پورے کے پورے ان کے حوالے کر دوں۔ میں نہ جماعت کا سرمایہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہوں نہ بکڈپو کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھنا پسند کرتا ہوں۔ اور نہ میں اس بات ہی کو صحیح سمجھتا ہوں کہ جماعت کے سرمایہ کو تنہا اپنی صوابدید پر خرچ کروں۔ لیکن مجھے بتایئے کہ وہ کون سے ذمّہ دار لوگ ہیں جو یہاں میرے ساتھ شریک کار بن کر رہنے کو تیار ہیں۔ رہے پچھلے حسابات تو میں آج سے نہیں تقریباً سال ڈیڑھ سال سے کہہ رہا ہوں کہ کوئی آدمی کام سنبھالنے والا دیجئے میں شاہ صاحب کو الگ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر جو لوگ مجھ پر نکتہ چینی کرتے ہیں، نہ انہوں نے خود کام سنبھالا نہ کوئی آدمی دیا۔ آپ اب مجھے کوئی آدمی دیں، میں ابھی شاہ صاحب کو رخصت کئے دیتا ہوں۔ میں انکی خطاؤں سے واقف ہونے کے باوجود ان کو صرف اس لئے الگ نہ کر سکا کہ ان کی جگہ کسی اناڑی آدمی کو رکھتا تو دوسری بار اتنا ہی نقصان ہوتا جتنا اب ہو رہا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ قریبی تاریخوں میں جماعت کا ایک اجتماع کر لیا جائے اور اس میں پوری صورت حال پیش کر دی جائے۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ میری اور آپ کی یہ تحریریں بھی پوری جماعت کے سامنے رکھدی جائیں۔

ابوالاعلیٰ

بنام محمد منظور نعمانی صاحب

نوٹ، اس خط کے سلسلہ میں چند تشریحات ضروری ہیں جو ذیل میں کی جارہی ہیں۔

مولانا منظور نعمانی صاحب جماعت اسلامی کے اولین ارکان میں سے تھے۔ ابتدا میں جو نقشہ کار جماعت اسلامی نے بنایا تھا اس میں ایک ایسے مرکز کا قیام تھا جو تحریک اسلامی کی علمی، فکری اور دینی رہنمائی کر سکے۔ اور ملک میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بن جائے اس سلسلہ میں طے ہوا تھا کہ جماعت کے سربرآوردہ لوگ اس مرکز میں منتقل ہو جائیں گے اور وہیں سے تحریک کی رہنمائی کریں گے۔۔۔۔ مولانا منظور نعمانی صاحب بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کو اس مرکز میں منتقل ہونا تھا مولینا مودودی صاحب اس فیصلہ کے فوراً بعد دارالاسلام منتقل ہو گئے۔ لیکن مولینا منظور صاحب نے منتقلی کی بجائے صرف چند دن کے لئے مرکز میں قیام کیا اور ان (تقریباً) دو ہفتوں کے قیام کے بعد واضح رہے کہ ان دنوں میں بھی مسلسل بارش ہوتی رہی تھی اور بالکل جھڑی لگی ہوئی تھی آپ نے اپنے خیال میں تمام حالات کا "جائزہ" لے کر مولینا مودودی صاحب اور جماعت سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر دیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مولانا مودودی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ اس خط میں مولانا منظور صاحب کا استدلال یہ تھا۔

۱۔ آپ کی زندگی ایسی متقیانہ اور پرہیزگارانہ نہیں ہے جو آپ کے منصب کے مناسب ہو۔ نیز آپ میں تواضع و مواسات، اور مساوات وغیرہ اخلاق حمیدہ کی بھی کمی ہے۔

۲۔ آپ کی معاشرت و معیشت کا معیار نہایت بلند ہے اور اس سے متعلق مفاسد کا اندیشہ ہے مثلاً۔

(ا) تحریک سے متاثر ہو کر اعلیٰ معیار زندگی کو ترک کر کے آنے والے بد دل ہو جائیں گے۔

(ب) غربا میں احساس کمتری پیدا ہو گا۔

(ج) آپ میں نہیں تو آپ کے گھر والوں میں احساس برتری پیدا ہو گا۔

(د) اس غلط معیار زندگی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے ایک دفعہ اپنے ایک مخلص دوست کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ اگر میں یہ معیار قائم نہ رکھوں تو میری بات کا وزن نہیں رہے گا۔

۳۔ آپ میں انتظامی قابلیت نہیں ہے۔

۴۔ آپ کے پیش نظر لٹریچر کی اشاعت، ایک اعلیٰ دار المصنفین اور ایک اعلیٰ دار العلوم کے قیام کے سوا کچھ اور نہیں (اگرچہ یہ بھی غنیمت ہے) اس سے آگے نہ آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔

۵۔ مالی معاملات میں آپ کماحقہٗ سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ دوسرے جس طرح چاہتے ہیں خرد برد کرتے ہیں مگر آپ حالات کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ پریس وغیرہ کی خریداری میں بھی آپ نے سخت دھوکہ کھایا ہے اور ایک ناکارہ پریس خرید لیا ہے وغیرہ۔

ان حالات میں مولانا منظور صاحب کا استدلال یہ تھا کہ:

٭ ان کی نگاہ میں مودودی صاحب اس کام کو کرنے کے اہل نہیں۔

٭ اور خود وہ اس بارِ گراں کے تحمل کی استعداد نہیں رکھتے۔ اس لیے بہتری کی کوئی صورت نہیں۔

ان حالات کا نتیجہ تھا کہ قیام کے بعد ہی جماعت اسلامی ایک شدید انتشار

سے دوچار ہو گئی۔ مولینا مودودی صاحب کا یہ خط منظور نعمانی صاحب کے مذکورہ بالا خط کا جواب ہے اور ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ خط کی مستند تلخیص یہاں دے دی گئی ہے تاکہ جواب کو سمجھنے میں آسانی ہو اور ان کا نقطۂ نظر بھی سامنے آجائے۔

مولینا منظور نعمانی صاحب کو اس خط کا چھپنا ناپسند تھا اور وہ شروع ہی سے اسے چھاپنے سے منع کرتے رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ دنوں اپنی ایک سرگذشت میں (مطبوعہ الفرقان) انہوں نے کہیں اشاروں میں اور کہیں تفصیل کے ساتھ اس کے مندرجات کا ذکر کیا ہے۔ ان حالات میں یہ مناسب معلوم ہوا کہ ہم اس کو چھاپ دیں، مولینا موصوف نے اس خط کی اشاعت کی اجازت بھی دے دی ہے ——— یہ ایک تاریخی خط ہے جو ملت کی امانت ہے اور اس سے اسے محروم رکھنا کسی طرح درست نہیں۔ ہم یہ خط ایڈیٹر چراغ راہ کراچی کے مندرجہ بالا نوٹ اور شکریہ کے ساتھ یہاں شامل اشاعت کر رہے ہیں۔ (ا۔گ)

○

اچھرہ لاہور

۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم و رحمتہ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۳ مارچ وصول ہوا۔ عدیم الفرصتی کے سبب سے جلدی جواب نہ دے سکا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم سے میرے تعلقات کوئی بہت زیادہ وسیع تو نہ تھے۔ البتہ قلبی حیثیت سے گہرے ضرور تھے۔ میں جب حیدرآباد سے رسالہ ترجمان القرآن نکالا کرتا تھا اس زمانے میں مجھے خبر تک نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے واقف ہیں۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ برابر اس رسالہ کو منگوا کر میرے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھوا کر سنتے رہتے تھے۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کی دلچسپی کا علم اس وقت ہوا جب ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ان کا عنایت نامہ مجھے ملا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ میں حیدرآباد چھوڑ کر پنجاب چلا آؤں اور لاہور میں رہ کر فقہ اسلامی کی تدوین جدید میں ان کے ساتھ تعاون کروں۔ اس کے بعد کچھ مراسلت شروع ہوئی اور ۳۷ء کے آخر میں لاہور آکر دو تین مرتبہ ان سے ملا۔ ان ملاقاتوں میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری اور ان کی بہت پرانی واقفیت ہے اور ہم ایک دوسرے کے دل سے بہت قریب ہیں۔ یہاں میرے اور ان کے درمیان یہ بات طے ہو گئی کہ میں پنجاب منتقل ہو جاؤں اور پٹھان کوٹ کے قریب اس وقف کی عمارات میں جس کا نام ہم نے بالاتفاق "دارالاسلام" تجویز کیا تھا ایک ادارہ قائم کروں جہاں دینی تحقیقات اور تربیت کا کام کیا جائے

انہوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میرے وہاں منتقل ہو جانے کے بعد وہ بھی ہر سال چند مہینے وہاں آکر قیام فرمایا کریں گے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق میں نے حیدرآباد چھوڑ کر ہجرت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور مارچ ۳۸ء میں نقل مقام کر کے دارالاسلام پہنچ گیا۔ مگر افسوس کہ مرحوم کی زندگی کے وہ آخری ایام تھے۔ دوسرے ہی مہینہ ان کا انتقال ہو گیا اور میں اس کام کے لئے تنہا رہ گیا جسے ان کے ساتھ مل کر کرنا چاہتا تھا۔

بس یہ میرے اور ان کے تعلقات کی مختصر داستان ہے۔ رحمہ اللہ علیہ

خاکسار

ابوالاعلیٰ

○

چند مزید توضیحات

۷ اپریل ۱۹۵۷ء

(۱) کیا یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال مرحوم لاہور میں آپ کی تشریف آوری کا سبب بنے تھے؟

(۲) اور وہ کون سے تاثرات اور دواعی تھے جن کی بنا پر علامہ مرحوم نے آپ کو پنجاب میں آنے کی دعوت دی تھی؟

(۳) کیا آپ کو علامہ مرحوم کے ساتھ کبھی تبادلۂ خیالات کا موقع بھی ملا تھا۔ بالمشافہ یا کسی اور طریق سے ــ یا نہ؟ علامہ مرحوم کو آپ کے نظریہ حیات اور تشریح و تعبیر سے کس حد تک دلچسپی تھی یا آپ کو مرحوم کے پیغام سے کہاں تک

دلچسپی ہے۔ آپ کے نزدیک مرحوم کا آخری پیغام کیا ہے؟

جوابات

(۱) جی ہاں، میں پنجاب سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ بلکہ یہاں کی صحافت اور سیاست اور مذہبی مناظرہ بازیوں کا رنگ دیکھ کر دور ہی سے اتنا بدگمان تھا کہ پنجاب آنا پسند بھی نہ کرتا تھا مگر ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے توجہ دلائی کہ دکن کو چھوڑ کر پنجاب میں قیام کروں۔ پہلی نگاہ میں تو مجھے اس تجویز نے کچھ زیادہ متاثر نہ کیا۔ مگر جب ۱۹۳۷ء کے اواخر میں میں نے دکن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی دوسرے مستقر کی تلاش میں حیدرآباد سے نکلا تو مرحوم سے مشورہ کرنے کے لئے لاہور حاضر ہوا۔ اور ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ آئندہ میرے لئے پنجاب ہی میں قیام کرنا زیادہ مناسب ہے۔

(۲) اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں پہلے یہ بھی نہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم مجھ سے واقف ہیں۔ یہ بات لاہور آ کر مجھے معلوم ہوئی کہ وہ ترجمان القرآن کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

(۳) جی ہاں مگر بہت کم۔ ۱۹۳۶ء کے اواخر میں جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ ان کا نوازش نامہ آیا تھا اس کے بعد کچھ تھوڑی سی مراسلت ہوتی رہی پھر ۱۹۳۷ء کے اواخر میں لاہور آیا اور یہاں صرف دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد میں یہ فیصلہ کر کے حیدرآباد واپس چلا گیا کہ جلدی سے جلدی پنجاب منتقل ہو جاؤں۔ چنانچہ مارچ ۳۸ء میں مستقل طور پر ہجرت کر کے پنجاب آیا اور ابھی دم

بھی نہ لینے پایا تھا کہ اپریل میں مرحوم اپنے رب سے جا ملے۔

مجھے جس حد تک معلوم ہوا ہے مرحوم میرے خیالات سے بڑی حد تک متفق تھے اور ترجمان القرآن کے مضامین کی تحسین و تعویب فرماتے رہتے تھے۔ رہا میں۔ تو میرے نزدیک وہ اکابر مفکرین اسلام میں سے تھے اور انہوں نے خصوصیت کے ساتھ شعر کی طاقت سے اسلام کی خدمت سرانجام دینے میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

آپ کا یہ سوال کہ ان کا آخری پیغام کیا ہے؟ میرے نزدیک کچھ عجیب سا ہے! اگر پیغام دینے والا خود بھی ظاہر نہ کر سکا ہو کہ اس کا پیغام کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میرے نزدیک تو ان کا پیغام ان کے آخری زمانہ کے کلام میں بالکل واضح ہے۔ والسّلام

خاکسار

ابوالاعلیٰ

(بشکریہ چٹان لاہور)

○

دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سنہ ۶۱ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

ہندوستان کے ایک شہر جبل پور میں ۱۱ اور ۱۴ فروری سنہ ۶۱ء کے درمیانی عرصہ میں وہاں کے بے بس مسلمانوں پر جو حادثہ گذرا ہے امید ہے اس کی خبریں آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہوں گی۔ ہمارے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ہمارے عرب بھائیوں کو ان واقعات کی خبر نہ ہوئی ہوگی۔ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں عرب سفارت خانے قائم ہیں اسی طرح دہلی بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں عرب اخبارات کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ ان واقعات کی مفصل روداد یں پاکستان کے اخبارات میں بھی شائع ہوئی ہیں بلکہ پاکستان کے عوام نے ہر جگہ ان واقعات پر احتجاج کیا ہے اور یہاں بھی تمام عرب ممالک کے سفارت خانے موجود ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے ابھی تک نہ کسی عرب حکومت نے ان واقعات کے خلاف کوئی احتجاج کیا ہے اور نہ کسی عرب اخبار ہی نے ان پر افسوس و مذمت کا کوئی حرف لکھا ہے بلکہ ان واقعات کی خبریں تک عربی اخبارات میں نہیں آئی ہیں۔ کجا کہ حکومتِ ہند سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا اور ان مظالم کے انسداد کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو تقسیم ملک کے بعد سے مسلسل وہاں کے مسلمانوں پر توڑے جا رہے ہیں۔ عرب بھائیوں کی طرف سے یہ بڑی افسوسناک روش سامنے آ رہی ہے جو ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں کے مسلمانوں میں اپنے ناگوار اثرات

چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ہمارے عرب بھائی غیر عرب مسلمانوں سے تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ فلسطین، الجزائر برہی اور دوسرے مسائل میں ان کی ہر طرح کی تائید کریں لیکن دوسرے مسلمانوں پر اگر قیامت بھی ٹوٹ پڑے تو وہ خود ہمدردی کا ایک کلمہ اور احتجاج و مذمت کا ایک لفظ تک زبان سے نکالنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال ہے کہ عرب بھائی ہندوستان میں رونما ہونے والے فسادات کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ اگر ان کے متعلق انہوں نے حکومتِ ہند کی مسلم کش کارروائیوں کے خلاف کوئی احتجاج کیا تو ان کی یہ دوست حکومت ناراض ہو جائے گی۔ کیا اسی اساس پر پاکستانی مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بھی جواب میں ایسا ہی نقطۂ نظر اختیار کر لیں اور یہ سوچنے لگیں کہ اگر الجزائر کے مسئلہ میں انہوں نے اپنے عرب بھائیوں کی تائید کی تو فرانس بگڑ جائے گا۔ قضیۂ فلسطین پر ان کا ساتھ دیا تو اسرائیل بلکہ دنیا بھر کے یہودیوں کی ناراضی مول لینی پڑے گی جن کا اثر و نفوذ ساری دنیا میں اور خاص طور پر امریکہ میں جتنا کچھ پایا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ برمی کے معاملہ میں ان کی حمایت کی تو انگریز کو ناگوار گزرے گا لیکن ہم ان تمام باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ہمارے سامنے وہ دینی رشتہ ہے جو ہمیں عربوں کے ساتھ مربوط کئے ہوئے ہے اور جو ہر دوسرے رشتہ سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم بہر حال اپنے ملکی اور قومی مفادات کو اہمیت دیے بغیر عربوں کے ہر قضیہ میں ان کی حمایت کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن ہمیں تعجب ہے کہ عرب آخر ان تمام وحشیانہ مظالم پر کیوں چپ سادھے ہوئے ہیں

جو ان کی آنکھوں کے سامنے حکومتِ ہند وہاں کی مسلم اقلیت پر مسلسل توڑ رہی ہے یہ صورتِ حال کئی سالوں سے مشاہدے میں آ رہی ہے۔ وہ مصر جس کو اب تک ہم سے شکایت رہی ہے کہ پاکستان کے ایک سابق وزیرِ اعظم سہروردی صاحب نے۔ نہ کہ پاکستان کے عوام نے قضیۂ سویز میں اُس کی حمایت نہیں کی، آج جبل پور کے مسلمانوں پر ہندوؤں کے ہاتھوں بے پناہ مظالم ڈھائے جانے پر بھی کیوں شرمناک خاموشی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

میں ان گزارشات کے ساتھ جبل پور کے مظالم کی مختصر روداد بھیج رہا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ وہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں کن شرمناک وحشیانہ دراز دستیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ تمام تفصیلات میں آپ کو خاص طور پر اس لئے بھیج رہا ہوں کہ سعودی عرب اور دوسرے کسی عرب ملک میں آپ کے سوا مجھے کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا جو اس معاملہ کی اہمیت کو سمجھے اور اس کے متعلق کوئی عملی اقدام کرے اور اس طرح عدل و انصاف اور اپنے ہندی بھائیوں کے ساتھ دینی رشتہ کے تقاضوں کو پورا کرے۔ اگر میں اس کے متعلق براہِ راست کسی عرب ملک کے اخبار کو کچھ لکھوں تو مجھے یہ بھی توقع نہیں کہ وہ اس آواز پر کان دھرے اور اسے اپنے صفحات میں جگہ دے گا

اس کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے کہ بلادِ عرب اور بلادِ ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے درمیان اگر موجودہ روش برقرار رہی تو دیر یا سویر اس کا اِدھر کے مسلمانوں میں بھی لازماً بُرا ردِّ عمل رونما ہوگا اور اخوتِ اسلامی کے رہے سہے جذبات بھی ماند پڑتے چلے جائیں گے۔ کیا وہ وقت بہت پسندیدہ ہوگا

جب ہر مسلمان ملک بس اپنے ہی مفاد کو دیکھتا رہے اور ایک پر کوئی آفت آئے تو دوسرے ٹس سے مس نہ ہوں۔

والسلام

ابوالاعلیٰ

بخدمت محترم محمد احمد باشمیل صاحب
سیکرٹری ہیئۃ امر بالمعروف مکہ معظمہ

○

سنٹرل جیل لاہور
۱۸ اگست ۵۳ء

عزیزم السّلام علیکم

مجھے خطوط مل تو جاتے ہیں مگر میرا جواب مکتوب الیہ تک نہیں پہنچنے دیا جاتا اور ویسے بھی مجھ کو پندرہ دن میں صرف ایک خط لکھنے کی اجازت ہے اس لیے مجھ سے مراسلت کرنا بے فائدہ ہے۔ جب تک میں قید میں ہوں آپ کے کچھ زیادہ کام نہیں آسکتا۔

آپ نے اپنے مطالعہ کا جو پروگرام لکھا ہے وہ مناسب ہے۔ آگے اپنے ہی اجتہاد سے اپنا راستہ بنائیے۔ کام کرتے کرتے خود بخود ترقی کرتے چلے جائیں گے میں صرف تین چار باتوں کا آپ کو مشورہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

۱۔ اپنے مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیجئے اور ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت

پیدا کر لیجئے۔

(۲) مطالعہ کے دوران میں اپنی قوت تنقید کو ہر وقت بیدار رکھئے تاکہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے رہیں اور کام کی باتیں چن لیں۔

(۳) اپنی ایک بنیادی فکر ذہن میں محفوظ رکھئے تاکہ تمام معلومات اسی نیوکلس کے گرد جمع ہوتی رہیں۔

(۴) کسی ایک شعبۂ علم کو انتخاب کر لیجئے جس میں آخر کار آپ کو مہارت پیدا کرنی ہو۔

آپ کے والد صاحب کی خرابی صحت کا حال معلوم کر کے افسوس ہوا اللہ تعالیٰ انہیں صحت عطا فرمائے۔

ابوالاعلیٰ

بنام خورشید احمد صاحب کراچی

علم و ادب کا مخزن

مولانا مودودی علم و ادب، فکر و تحقیق اور عمل و جہد کے ہر میدان کے شہسوار ہیں وہ ایک نظامِ حیات کے داعی اور مبلغ ہیں۔ اس دور میں جب کہ اس نظام کی کوئی مثالی صورت کہیں نافذ نہیں ہے۔ وہ اس کے علمبردار ہیں۔ اس دور میں جب کہ روشن خیالی نے مذہب کو ایک قدیم چیز اور ہر قدیم کو از کار رفتہ شے سمجھ کر رد کر رکھا ہے وہ مذہبی بنیادوں پر ایک، نظامِ فکر و عمل لے کر اٹھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں سب سے کٹھن کام یہی ہے کہ کوئی شخص مذہب کا حامی اور علمبردار ہو اور پھر ان میں بھی اسلام کو لے کر اٹھے جس کے خلاف جدید یورپ نے تعصب اور تنگ دلی کو اپنے اسلاف سے ورثے میں پایا ہو اور مولانا مودودی کو یہ نظام فکر جن لوگوں کے سامنے اور در میان اور مقابلے میں پیش کرنا ہو۔ ان کے نزدیک مغرب سے آئی ہوئی ہر شے وحی و الہام ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی کو اسلام بطور ایک نظامِ حیات کے پیش کرتے ہوئے سخت ذہنی اور عقلی رکاوٹوں سے واسطہ پیش آ رہا ہے جو ذہنی اور عقلی سے بڑھ کر مغرب کی مرعوبیت پر مبنی ہوتی رہی ہیں۔ پھر انہیں ان لوگوں کی مخالفتوں اور اور اعتراضات سے بھی واسطہ پڑا جو مذہب کے قدیم علمبردار چلے آ رہے تھے اور جنہوں نے مذہب کی ایک منجمد شکل کو اپنے حلقے میں محفوظ اور مرتب کر کے اسی کے

گروہ اپنے حصارِ عقیدت کی فصیل بنادی تھی اور جسے دنیا کے دیگر مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی جو قیصر کا قیصر کو اور خدا کا خدا کو دینے کے اصول پر دین و دنیا کا علیحدہ علیحدہ دائرہ کھینچ کر بیٹھ گئے تھے اور دنیا داروں کی ایک حقیر سی نیکی پر انہیں بخشوانے کا اطمینان دلانے پر مامور ہو گئے تھے یا کم از کم دین کو انہوں نے اس بات پر مطمئن کر دیا تھا کہ وہ زندگی کے دوسرے مسائل پر غالب آنے کی تمنا نہ کرے اس لئے کہ کافروں اور خود دین کے بعض پیروؤں کو یہ ناگوار گزرتا تھا۔

ایسی صورتِ حال میں جو شامت کا مارا بھی اپنا فرضِ ایمانی سمجھ کر اسلام کو پوری متاعِ زندگی پر غالب کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو ظاہر ہے کہ اس کی ہر حرکت دوسروں کو کتنی کچھ ناگوار نہ ہو گی۔ جھنجلا جھنجلا کر اعتراض کرنے والے۔ سوالات اٹھانے والے الزامات لگانے والے۔ بہتانات تراشنے والے اور مزاحمت کرنے والے کتنے ہی پیدا ہو جائیں گے۔ مولینا مودودی کو ان سب اقسام کے حضرات سے پالا پڑا۔ دین کے قدیم علمبرداروں نے اعتراضات اٹھائے اور عقلیت کے فریب میں آئے ہوئے دنیاداروں نے اعتراضات اٹھائے اور ان سب اعتراضات کا مقابلہ مولینا مودودی کو ذہنی میدان میں بھی کرنا پڑا اور عملی میدان میں بھی۔

مولانا مودودی کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ جس فکر کے داعی ہیں اور جس نظامِ حیات کے علمبردار ہیں اس نظامِ حیات کا گوشہ گوشہ نمایاں کریں، تشریح کریں اور کوئی چیز مبہم نہ چھوڑیں۔ مولانا مودودی نے حقیقت یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر ان کا یہ بھی فرض تھا کہ دنیا کے چلتے ہوئے نظاموں کی کمزوریاں اسلام کے مقابلے میں واضح کریں اور جن نظریات پر دنیا میں جھاڑی

تھی اللہ دورِ جدید کی پیداوار سمجھ کر ان پر شیدا تھی۔ انہیں اسلام کے مقابلے میں ناقص اور نقصان دہ ثابت کریں انہوں نے یہ بھی ثابت کیا اور حق یہ ہے کہ اس کا بھی حق ادا کر دیا۔

یہ سارا کام انہوں نے تقریباً تنتیس سال کے عرصے میں کیا ہے اب تک کئے جا رہے ہیں چنانچہ ہر موضوع پر ان کے مدلل مضامین کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو مل جاتا ہے ان کا تیار کیا ہوا لٹریچر علم و ادب اور فکر و تحقیق کا ایک خزانہ بلکہ ایک کان ہے کہ جس میں بڑے بڑے قیمتی گوہر موجود ہیں۔

میں نے اس نقطۂ نظر سے جب مولانا کے علمی اور ادبی ذخیرے کا جائزہ لیا تاکہ اس میں غوطہ زن ہو کر اس میں سے قیمتی قیمتی جواہر چن کر قارئین کے سامنے رکھوں اور ان کو مولانا کے فکری عجائب خانہ کے نوادرات سے متعارف کراؤں تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اس مقام پر آ کر بڑا ہی بے بس محسوس کیا۔ وہ جو ایک بات سنتے آئے تھے کہ ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است،

وہی معاملہ میرے ساتھ پیش آیا مجھے توقع نہ تھی کہ میں کتاب کے اس باب میں الجھن پریشانی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ لٹریچر کے ایک سرسری مطالعے کے بعد جب میں نے اپنے نشان زدہ اقتباسات کا جائزہ لیا تو وہ خود ایک علیحدہ کتاب کی ضخامت رکھتے تھے جب کہ ان اقتباسات کے انتخاب میں بھی مجھے برابر یہ احساس رہا تھا کہ مجھے مولانا پر ایک مختصر کتاب تیار کرنا ہے اور اس مختصر کتاب کا بھی یہ ایک نہایت مختصر باب ہونا چاہیے ظاہر ہے کہ یہ باب جو میں نے ان اقتباسات میں سے صرف ایک چوتھائی

لے کر مرتب کیا ہے میرے نزدیک کتنا کچھ تشنہ ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ مولٰینا کے علم و ادب اور فکر و تحقیق کے چمن میں سے ایک ایسا گلدستہ مرتب ہو جائے جو مختلف مسائل پر ان کے نظریات کی ایک بڑی حد تک نمائندگی کر سکے مولانا کو اپنی دعوت اور مشن کے پیش نظر سب سے زیادہ دینیات۔ اجتماعیات۔ اور سیاسیات پر لکھنا پڑا ہے چنانچہ ان موضوعات پر چھانٹی کے باوجود اقتباسات دوسرے عنوانات کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ باقی میں نے نظریات، اخلاقیات عمرانیات۔ معاشیات اور تعلیمات کے موضوعات پر اقتباسات جمع کر دیے ہیں تاکہ ان موضوعات پر بھی مولانا کا نکتۂ نظر سامنے آجائے۔

موضوع چاہے کوئی بھی ہو مولٰینا کا فکری محور اسلام کا نظریۂ زندگی ہی رہتا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو اسی کے لئے وقف کیا ہے کہ اس دور جدید میں اسلام کو جدید ذہنوں کے لئے جدید مسائل کی روشنی میں جدید تقاضوں کے مطابق نکھار کر پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ ان کا قابل عمل ہونا بھی ثابت کریں اور یہ ثبوت صرف عقلی اور علمی ہی نہ ہو بلکہ عملی بھی ہو یہی وجہ ہے کہ مولٰینا مودودی گذشتہ ۷ابرس سے اسلامی نظام حیات کو بالفعل برپا کرنے کے لئے مسلسل اجتماعی کوشش کر رہے ہیں اور یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے ... جو انہیں تاریخ میں اکابرین ملت کے درمیان ہمیشہ نمایاں جگہ دے گا۔

اب میں ترتیب وار مختلف موضوعات پر وہ اقتباسات پیش کرتا ہوں جو میں نے مولانا مودودی کے لٹریچر میں سے اخذ کئے ہیں۔

دینیات

• فہم قرآن • سنتِ رسولؐ • تجدد اور تجدید
• الامام المہدی • فتنۂ تکفیر • مسلم • عبادت
کا وسیع مفہوم

فہم قرآن

—— آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا۔ جب تک کہ وہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا ہے۔

—— اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے۔ اور سابقین اولین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے یہ ایک اور ہی قسم کا "سلوک" ہے جس کو میں "سلوک قرآنی"

کہتا ہوں اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آکر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے"۔

(مقدمہ تفہیم القرآن۔ صفحہ ۳۳، ۳۴)

سنتِ رسولؐ

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد سے رحلت تک تقریباً ربع صدی کا جو زمانہ بسر کیا وہ محض قرآن پڑھنے اور سنانے ہی میں بسر نہیں ہوا ہوگا بلکہ آپ تلاوت آیات کے علاوہ بھی شب و روز اپنے دین کی تبلیغ فرماتے رہتے ہوں گے۔ گمراہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش بھی فرماتے ہوں گے۔ ایمان لانے والوں کو تعلیم بھی دیتے ہوں گے اور اپنی عبادات، اپنے اخلاق اور اپنے اعمال حسنہ کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کی تربیت اور اصلاح کرنے میں مشغول رہتے ہوں گے۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرة۔ ۱۸۰)

نیز قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلمانہ زندگی ایسی شدید مصروفیت

میں بسر ہوتی تھی کہ آپ کو اپنے آرام کا ذرہ برابر خیال نہ تھا۔ ہر لمحہ یا تو عبادات میں بسر ہوتا تھا یا وعظ و نصیحت اور تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس میں، حتیٰ کہ بار بار اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتا تھا کہ آپ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں؟ اپنے آپ کو ہلاک کیوں کئے ڈالتے ہیں؟ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسی سرگرم مبلغانہ زندگی میں آیات قرآنی کے سوا کوئی بات بھی آپ کی زبان سے نہ نکلتی تھی جو یاد رکھنے اور بیان کرنے کے قابل ہوتی؟ کوئی کام بھی آپ کی زندگی کا ایسا نہ تھا جس کو لوگ اپنے لئے نمونہ سمجھتے اور دوسروں کو اس پاکیزہ نمونہ کی تقلید کا مشورہ دیتے؟ آپ کے اقوال و اعمال کے متعلق تو اہل ایمان کا اعتقاد تھا اور قرآن نے بھی ان کو یہی اعتقاد رکھنے کا حکم دیا تھا کہ آپ کا ہر اشارہ حق ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم - ۱) اور آپ کا ہر عمل واجب التقلید ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے تو مسلمان یقیناً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد کو دل سے سنتے ہوں گے۔ ہر عمل پر نگاہ رکھتے ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کے سامنے حضورؐ کے اقوال و اعمال کے چرچے کرتے ہوں گے جہاں رسالت یا کسی قسم کے تقدس کا اعتقاد نہیں ہوتا وہاں بھی بڑے لوگوں کی باتوں اور حرکات و سکنات پر لوگ نظر رکھتے ہیں اور ان کے اقوال و اعمال کے چرچے کیا کرتے ہیں پھر کیونکر ممکن تھا کہ صحابہ کرام جس مقدس انسان کو خدا کا رسولؐ اور اسلام کا مکمل نمونہ سمجھتے تھے۔ اس سے صرف قرآن لے لیتے اور اس کے دوسرے تمام ارشادات اور اس کے تمام اعمال کی طرف سے کان اور آنکھیں بند کر لیتے۔" (تفہیمات اوّل صفحہ نمبر ۲۷۱)

تجدّد اور تجدید

"عموماً لوگ تجدد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر متجدد کو مجدد کہنے لگتے ہیں ان کا گمان یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو نیا طریقہ نکالے اور اس کو ذرا زور سے چلا دے وہ مجدد ہوتا ہے خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو بر سر انحطاط دیکھ کر اس کو دنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانہ کی بر سرِ عروج جاہلیت سے مصالحت کر کے اسلام اور جاہلیت کا ایک نیا مخلوطہ تیار کر دیتے ہیں یا فقط نام باقی رکھ کر اس قوم کو پورے جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں ان کو مجدد کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے حالانکہ وہ مجدد نہیں ہوتے اور ان کا کام تجدید نہیں تجدد ہوتا ہے۔ تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا نام تجدید نہیں ہے اور نہ اسلام اور جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے بلکہ دراصل تجدید کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزا سے چھانٹ کر الگ کیا جائے اور کسی نہ کسی حد تک، اس کو اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدد جاہلیت کے مقابلہ میں سخت غیر مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے اور کسی خفیف سے خفیف جز میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا!" (تجدید و احیائے دین ص۲۸)

الامام المہدی

"مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی ان

متجددین سے جو اس امر کے قائل نہیں ہیں اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ وصوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے۔ تسبیح ہاتھ میں لئے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے۔ آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے علماء اور مشائخ کتابیں لئے ہوئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کرکے انہیں شناخت کریں گے پھر بیعت ہوگی اور اعلان جہاد کردیا جائے گا۔ چلے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے بقیۃ السلف ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لئے برائے نام چلانی پڑے گی اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے ہوگا۔ پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے جس کافر پر نظر ماریں گے تڑپ کر بیہوش ہوجائے گا اور محض بد دعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے۔ عقیدۂ ظہور مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل اہم کو وہ خوب سمجھتا ہوگا عقلی و ذہنی ریاست سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ وہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں

سے کچھ بہت مختلف ہو گا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہو گی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہو گا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا جیسا کہ میں۔۔ پہلے اشارہ کر چکا ہوں نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے مہدویت دعوٰی کرنے کی چیز نہیں کر کے دکھلانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔" (تجدید و احیائے دین صفحہ ۴۴)

فتنۂ تکفیر

—— "مسلمان کی تکفیر کے معاملے میں انتہا درجہ کی احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے اتنی ہی احتیاط جتنی ایک شخص کے قتل کا فتوے صادر کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے ہر شخص جو مسلمان ہے اور لا الہ الا اللہ کا قائل ہے اس کے حق میں یہی گمان ہونا چاہیئے کہ اس کے دل میں ایمان ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کرتا ہے جس میں کفر کا شائبہ پایا جاتا ہو، تو اس کے حق میں یہ امید رکھنی چاہیئے کہ اس نے کفر کے ارادے سے ایسی بات نہ کی ہو گی بلکہ محض جہل اور نا سمجھی سے کی ہو گی اس لیئے اس کی بات سنتے ہی فوراً اس پر کفر کا فتوے نہ جڑ دینا چاہیئے بلکہ مدد

طریقے سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اگر وہ پھر بھی زمانے اور اپنی بات پر اصرار کرے تو اس بات کو جس پر وہ اصرار کررہا ہے کتاب اللہ پر پیش کر کے دیکھا جائے کہ آیا وہ کفر وایمان کے درمیان فرق کرنے والی صریح نصوص کے خلاف ہے یا نہیں؟ اور اس شخص کے زیر بحث قول یا فعل میں کسی تاویل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر صریح نصوص کے خلاف نہ ہو تو کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا زیادہ سے زیادہ ایسے شخص کو گمراہ کہا جاسکتا ہے اور وہ بھی اس خاص مسئلہ میں نہ کہ بالکلیہ۔ البتہ اگر اس کا اعتقاد نصِ صریح کے خلاف ہو اور وہ شخص یہ معلوم کرنے کے بعد بھی کہ اس کا اعتقاد کتاب اللہ کی تعلیم کے خلاف ہے اپنی بات پر قائم رہے اور اس کے قول کی کوئی مناسب تاویل بھی نہ کی جاسکتی ہو تو ایسی صورت میں مسئلہ کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے فسق یا کفر کا حکم لگایا جاسکتا ہے لیکن اس پر بھی مدارج ومراتب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تمام جرائم اور تمام مجرم یکساں نہیں ہیں۔ ان میں بھی فرق مراتب ہوتا ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس فرق کو ملحوظ رکھ کر سزا تجویز کی جائے۔ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا یقیناً بے انصافی ہے۔" (تفہیمات حصہ دوم ص ۱۶۷)

مُسلم

——— "اسلام کے معنی عربی زبان میں اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔ مذہب اسلام کا نام "اسلام" اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب ایک قاعدے اور قانون

کی تابع ہیں چاند اور تارے سب ایک زبردست قاعدے میں بندھے ہوئے ہیں جس کے خلاف وہ بال برابر جنبش نہیں کر سکتے۔ زمین اپنی خاص رفتار کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ اس کے لئے جو وقت اور رفتار اور راستہ مقرر کیا گیا ہے اس میں ذرا فرق نہیں آتا۔ پانی اور ہوا۔ روشنی اور حرارت سب ایک ضابطے کے پابند ہیں۔ جمادات، نباتات اور حیوانات میں ہر ایک کے لئے جو قانون مقرر ہے اسی کے مطابق یہ سب پیدا ہوتے ہیں بڑھتے ہیں اور گھٹتے ہیں جیتے ہیں اور مرتے ہیں خود انسان کی حالت پر بھی تم غور کرو گے۔ تو تم کو معلوم ہو گا کہ وہ بھی قانون قدرت کا تابع ہے جو قاعدہ اس کی پیدائش کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق سانس لیتا ہے۔ پانی اور غذا اور حرارت اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کے دل کی حرکت۔ اس کے خون کی گردش اس کے سانس کی آمد و رفت اسی ضابطے کی پابند ہے۔ اس کا دماغ اس کا معدہ، اس کے پھیپھڑے اس کے اعصاب اور عضلات۔ اس کے ہاتھ پاؤں، زبان آنکھیں کان اور ناک غرض اس کے جسم کا ایک ایک حصہ وہی کام کر رہا ہے جو اس کو بتا دیا گیا ہے۔ یہ زبردست قانون جس کی بندش میں بڑے بڑے سیاروں سے لے کر زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرہ تک جکڑا ہوا ہے ایک بڑے حاکم کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ساری کائنات اور کائنات کی ہر چیز اس حاکم کی مطیع اور فرمانبردار ہے کیونکہ وہ اسی کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت اور فرمانبرداری کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے۔ سورج چاند اور تارے سب مسلم ہیں زمین

بھی مسلم ہے۔ ہوا اور پانی اور روشنی بھی مسلم ہیں۔ درخت اور پتھر اور جانور بھی مسلم ہیں:" (رسالہ دینیات صفحہ نمبر ۱۱)

عبادت کا وسیع مفہوم

"—— مومن صالح صرف اسی وقت اللہ کا عبادت گزار نہیں ہوتا جب وہ دن میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہے اور بارہ مہینوں میں ایک مہینے کے روزے رکھتا ہے اور سال میں ایک وقت زکوٰۃ دیتا ہے اور عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرتا ہے بلکہ اس کی ساری زندگی عبادت ہی عبادت ہے جب وہ کاروبار میں حرام کے فائدوں کو چھوڑ کر حلال کی روزی پر قناعت کرتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا؟ جب وہ معاملات میں ظلم اور جھوٹ اور دغا سے پرہیز کر کے انصاف اور راست بازی سے کام لیتا ہے تو کیا یہ عبادت نہیں ہے؟ جب وہ خلق خدا کی خدمت اور حقداروں کی حق رسانی کے لئے کمر بستہ ہوتا ہے تو کیا اس کی ہر حرکت عین عبادت نہیں ہوتی؟ جب وہ اپنے افعال و اقوال میں خدا کے قانون کی پیروی کرتا ہے اور اس کی حدود کا لحاظ رکھتا ہے۔ تو کیا اس کا ہر قول و فعل عبادت میں شمار نہ ہوگا؟ پس حق یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی پیروی اور اس کی شریعت کے اتباع میں انسان دین اور دنیا کا جو بھی کام کرتا ہے وہ سراسر عبادت ہے حتیٰ کہ بازاروں میں اس کی خرید و فروخت اور اپنے اہل و عیال میں اس کی معاشرت اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں اس کا انہماک بھی عبادت ہے:" (تفہیمات ص۵۵)

نظریات

• ڈارون کا نظریۂ ارتقاء • مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ • انسان خدا کی پیدائشی رعیت • اسلام میں نظریۂ خلافت

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

———— "عام انسانی ذہن نے ڈارون کے بیان سے متاثر ہو کر کائنات کا جو تصور قائم کیا وہ یہ تھا کہ یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جہاں ہر آن ہر طرف زندگی اور بقا کے لئے ایک ابدی جنگ برپا ہے۔ نظام فطرت ہے ہی کچھ ایسا کہ جسے زندہ اور باقی رہنا ہو اسے نزاع اور کشمکش اور مزاحمت کرنی پڑتی ہے اور مزاجِ فطرت واقع ہی کچھ اس طرح ہوا ہے کہ اس کی نگاہ میں وہی بقا کا مستحق ہے جو قوتِ بقا کا ثبوت دے دے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے۔ وہ اس لئے فنا ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ اور اسے فنا ہو نا ہی چاہیئے اور جو باقی رہتا ہے وہ اس لئے باقی رہتا ہے کہ وہ طاقت ور ہے اور اسے باقی ہی رہنا چاہیئے۔ زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائل زندگی غرض یہاں جو کچھ بھی ہے طاقت ور کا حق ہے جس نے زندہ رہنے کا ثبوت دے دیا ہو۔ کمزور کا ان چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے۔ اسے طاقت ور کے لئے جگہ خالی کرنی چاہیئے۔ اور طاقت ور سراسر برسرِ حق ہے۔ اگر وہ اسے

ہٹا کر یا مٹا کر جگہ لیتا ہے۔

غور کیجئے یہ تصور کائنات جب دماغوں میں بیٹھ جائے اور نظام فطرت کو اس نگاہ سے دیکھا جانے لگے تو انسان انسان کے لئے کیا کچھ بن کر رہے گا؟ اس فلسفۂ زندگی میں ہمدردی، رحم، محبت، ایثار اور اس طرح کے دوسرے شریفانہ انسانی جذبات کے لئے کیا جگہ ہو سکتی ہے؟ اس میں عدل و انصاف، امانت و دیانت اور صداقت و راستبازی کا کیا کام؟ اس میں حق کا وہ مفہوم کہاں باقی رہتا ہے جو کبھی کمزور کو بھی پہنچ سکتا ہو اور ظلم کے وہ معنی کب ہو سکتے ہیں جن سے کبھی طاقت ور بھی گناہ گار ٹھہرایا جا سکتا ہو؟ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر پہلے اسے فساد سمجھا جاتا تھا اور اب وہ عین تقاضائے فطرت ہے کیونکہ کائنات تو ہے ہی ایک میدان جنگ۔ ظلم پہلے بھی دنیا میں ہوتا تھا مگر وہ ظلم تھا اور اب اسے ایسی منطق مل گئی ہے جس سے وہ طاقت ور کا حق بن گیا ہے۔ اس فلسفے کے بعد یورپ والوں کو ان تمام مظالم کے لئے جو انہوں نے دوسری قوموں پر ڈھائے، ایک محکم دلیل ہاتھ آ گئی۔ انہوں نے اگر امریکہ اور آسٹریلیا اور افریقہ کی پرانی نسلوں کو مٹایا اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنایا تو یہ گویا ان کا حق تھا جو انہوں نے عین قانون فطرت کے مطابق حاصل کیا۔ مٹنے والے مٹنے ہی کے مستحق تھے اور ان کی جگہ لینے والوں کا یہی حق تھا کہ وہ ان کی جگہ لیں۔ اس بارے میں اگر اہل مغرب کے ضمیر میں پہلے کوئی خلش تھی بھی تو ڈارون کی منطق نے اسے دلائل و شواہد سے دور کر دیا۔ سائنس میں اس نظریے کی حیثیت

جیسی کچھ بھی ہو معاشرت، تمدن اور سیاست میں تو اس نے انسان کو انسان کے لئے بھیڑیا بنا کر رکھ دیا ہے۔" (ماضی بحال اور مستقبل کیلئے لائحہ عمل)

مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ

"ہیگل نے فکر کی دنیا کو رزم گاہ بنا کر پیش کیا تھا ڈارون نے کائنات اور نظامِ فطرت کو میدان جنگ بنا کر دکھا دیا اور مارکس نے یہی تصور خود انسانی معاشرے کی بنیاد بنا کر دکھا دیا۔ اس تصویر میں انسان ہم کو شروع سے لڑتا جھگڑتا نظر آتا ہے اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لئے اپنے ہم جنسوں سے لڑے۔ وہ سراسر خود غرضی کی بنا پر مختلف طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ سراسر خود غرضی کی بناء پر ان طبقوں میں کشمکش اور نزاع برپا رہی ہے اور انسانی تاریخ کا سارا ارتقاء اسی خود غرضانہ طبقاتی کشمکش کی بدولت ہوا ہے۔ قوموں اور قوموں کی لڑائی تو درکنار خود ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کی لڑائی بھی اس تصویر میں ہم کو سراسر ایک تقاضائے فطرت نظر آتی ہے اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ صرف اغراض و مفاد کے اشتراک کا رشتہ ہے ان رشتہ داروں سے ملنا اور متفق ہو کر ان سب لوگوں سے لڑنا جن سے آدمی کی معاشی اغراض متصادم ہوں بخواہ وہ اپنے ہی ہم قوم اور ہم مذہب کیوں نہ ہوں۔ سراسر حق ہے اور یہ حرکت کسی جرم کا ارتکاب نہیں بلکہ اس

سے اجتناب خلاف فطرت ہے مارکس کے پیرو ان تمام مذہبی، اخلاقی اور قانونی تصوّرات کو جو کسی خاص تاریخی عہد میں پائے جاتے ہوں، اسی خاص دور کے معاشی نظام کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ وہ تصوّرات اور اصول و قوانین اپنے ہی دور کے معاشی نظام کی حمایت و حفاظت کے لئے وضع کیئے گئے ہوتے ہیں لہٰذا منطقی طور پر ان کے اس عقیدے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب انسان کی معاشی ضروریات مہیا کرنے کا طریقہ (System of Production and distribution) بدل جائے تو اس کے ساتھ ہی مذہب اخلاق، قانون ہر چیز کو بدل جانا چاہیئے۔ کیونکہ ان کا جوڑ صرف پرانے نظامِ معیشت کے ساتھ تھا۔ نئے نظام کی روح سے ان کو کوئی مناسبت نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس مارکسی نظریہ پر جو شخص اعتقاد رکھتا ہو وہ صدیوں پہلے کی کسی مذہبی تعلیم یا کسی شریعت یا کسی اخلاقی سسٹم پر ایمان رکھ سکتا ہے۔" (تفہیمات حصّہ دوم ص ۲۱۸)

انسان ـــ خدا کی پیدائشی رعیّت

ـــــــ "الکتاب اور الرسول نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو ہمیں صریحاً ایک نظام میں جکڑی ہوئی ایک مقررہ قانون پر چلتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ دراصل ایک

خدا کی حکومت ہے خدا ہی اس کا مالک ہے۔ وہی اس کا خالق ہے اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو اس کی بے پایاں سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہان ہست و بود کا ہر حصہ جکڑا ہوا ہے تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیت Born Subject ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لئے تمہارے ذہن میں اپنی خودمختاری کا اگر کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرار حمل سے لے کر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانون طبعی (Laws of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے اور تمہارے اوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو ان کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو۔ ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارا ان سے آزاد ہونا ممکن نہیں ہے۔"

(اسلامی قانون ۹ - ۱۰)

اسلام میں نظریۂ خلافت

"اسلام میں اصل حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے اٹھیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیئے تو آپ کا ذہن خود بخود پکارے گا کہ وہ اصل حاکم کے نائب قرار پائے چاہئیں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔	اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریۂ ریاست (Theory of State) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں

پہلا نقطہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت (Sovereignty.) کے بجائے خلافت (Vicegerency.) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے چونکہ اس کے نظریے کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو اسے لامحالہ حاکم

اعلیٰ کا خلیفہ (VICE GERENT) ہونا چاہیئے جو تفویض کردہ اختیارات (DELEGATED POWERS) استعمال کرنے کا مجاز ہو گا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے وہ عمومی خلافت (Popular vicegerency) ہے کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جوابدہ ہے (کُلُّکُم رَاعٍ وَکُلُّکُم مَسئُولٌ عَن رَعِیَّتِہٖ) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلے میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔"

(اسلام کا نظریہ سیاسی۔ ۳۶۔ ۳۷)

اخلاقیات

● اسلام میں خدا کا تصور ● تصوّف ● باطن کی اصلاح

اسلام میں خدا کا تصوّر

اسلام اس پوری فکری اور عملی انارکی کو ختم کر دیتا ہے جو انسان کو بے خدا فرض کر کے اس کے لئے ایک نظام اخلاق تجویز کرنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلام خدا کا جو تصوّر پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان

کا اور ساری کائنات کا مالک، خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اس کی خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے ہاں بجز دعائے خیر کے اور کوئی سفارش کی گنجائش بھی نہیں جو زور سے منوائی جاتی ہو اور رد نہ کی جاسکتی ہو۔ اس کے ہاں ہر شخص کی کامیابی و ناکامی کا مدار اس کے اپنے طرز عمل پر ہے نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے نہ کسی کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جاتی ہے اور نہ کسی کے عمل کا صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اس کے ہاں جانبداری نہیں کہ ایک شخص یا خاندان یا قوم یا نسل سے اس کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی ہو۔ سب انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہیں سب کے لئے ایک ہی قانون اخلاق ہے اور فضیلت جو کچھ بھی ہے۔ اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے۔ وہ خود رحیم ہے اور رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود فیاض ہے اور فیاضی کو پسند کرتا ہے وہ خود عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود ظلم سے تنگ نظری و تنگ دلی سے، بے رحمی سے اور سنگدلی سے۔ تعصب اور نفسانی جانبداری سے پاک ہے۔ اس لئے انہی کو پسند کرتا ہے جو ان صفات سے پاک ہوں۔ پھر کبریائی تنہا اسی کا حق ہے اس لئے متکبر اسے ناپسند ہے۔ خدائی صرف اس کے لئے ہے اور دوسرے اس کے بندے ہیں۔ اس لئے ایک بندے پر دوسرے کی خداوندی اس کو پسند نہیں۔ مالک وہ اکیلا ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے۔ امانت کی حیثیت سے ہے اس لئے کسی بندے کی خود مختاری اور کسی کا کسی کے لئے قانون بنانا اور کسی کا کسی کے لئے بذات خود واجب الاطاعت ہونا یہ سب فی الحقیقت غلط ہے۔ سب کا مطاع وہی ایک ہے

اور سب کے لئے خیر اسی میں ہے کہ اس کی بے چون وچرا اطاعت کریں۔ پھر وہ محسن ہے۔ اور شکر احسان مندی اور محبت کا مستحق ہے وہ منعم ہے۔ اور اس کا حقدار ہے۔ کہ اس کی نعمتوں میں اسی کے منشا کے مطابق تصرف کیا جائے وہ منصف ہے اور لازم ہے کہ انسان اس کے انصاف میں سزا پانے کا خوف اور جزا پانے کی طمع رکھے۔ وہ علیم وخبیر ہے۔ اور دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے۔ اس لئے ظاہری حسن اخلاق سے اس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا وہ محیط ہے اس لئے کوئی یہ امید نہیں کر سکتا کہ جرم کر کے اس کی پکڑ سے بچ نکلے گا۔ (اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر صفحہ ۳۵-۳۶)

تصوّف

—— "تصوف کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ بہت سی مختلف چیزیں اس نام سے موسوم ہو گئی ہیں۔ جس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں وہ اور چیز ہے اجس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں وہ ایک دوسری چیز ہے۔ اور جس تصوف کی ہم اصلاح چاہتے ہیں وہ ایک تیسری چیز ہے۔

ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیا میں مثلاً فضیل بن عیاضؒ، ابراہیمؒ ادھم، معروف کرخیؒ وغیرہم رحمہم اللہ اس کا کوئی الگ فلسفہ نہ تھا۔ اس کا کوئی الگ طریقہ نہ تھا۔ وہی افکار اور وہی اشغال واعمال تھے جو کتاب وسنت سے ماخوذ تھے اور ان سب کا وہی مقصود تھا

جو اسلام کا مقصود ہے یعنی اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ۔ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ اس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں اور صرف تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ اس کو زندہ اور شائع کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرا تصوف وہ ہے جس میں اشراقی اور رواقی اور زردشتی اور ویدانتی فلسفوں کی آمیزش ہو گئی ہے جس میں عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے شامل ہو گئے ہیں جس میں مشرکانہ تخیلات و اعمال تک خلط ملط ہو گئے ہیں جس میں شریعت اور طریقت اور معرفت الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک دوسرے سے کم و بیش بے تعلق بلکہ بسا اوقات باہم متضاد بن گئی ہیں اور جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے کی بجائے اسے بالکل مختلف دوسرے کاموں کے لئے ہی تیار کیا جاتا ہے۔ اس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک اس کو مٹانا خدا کے دین کو قائم کرنے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جاہلیت جدیدہ کو مٹانا۔

ان دونوں کے علاوہ ایک اور تصوف بھی ہے جس میں کچھ خصوصیات پہلے قسم کے تصوف کی اور کچھ خصوصیات دوسرے قسم کے تصوف کی ملی جلی پائی جاتی ہیں۔ اس تصوف کے طریقوں کو متعدد ایسے بزرگوں نے مرتب کیا ہے جو صاحب علم تھے نیک نیت تھے مگر اپنے دور کی خصوصیات اور پچھلے ادوار کے اثرات سے بالکل محفوظ بھی نہ تھے انہوں نے اسلام کے اصلی تصوف کو سمجھنے اور اس کے طریقوں کو

جاہلی تصوف کی آلودگیوں سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اس کے باوجود ان کے نظریات میں کچھ نہ کچھ اثرات جاہلی فلسفہ تصوف کے اور ان کے اعمال و اشغال میں کچھ نہ کچھ اثرات باہر سے لئے ہوئے اعمال و اشغال کے باقی رہ گئے جن کے بارے میں ان کو یہ اشتباہ پیش آیا کہ یہ چیزیں کتاب و سنّت کی تعلیم سے متصادم نہیں ہیں یا کم از کم تاویل سے انہیں غیر متصادم سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں اس تصوف کے مقاصد اور نتائج بھی اسلام کے مقصد اور اس کے مطلوبہ نتائج سے کم و بیش مختلف ہیں۔ نہ اس کا مقصد واضح طور پر ہر انسان کو فرائض اخلاق کی ادائیگی کے لئے تیار کرنا اور وہ چیز بتانا ہے جسے قرآن نے لِتَکُونُوا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور نہ اس کا نتیجہ ہی یہ ہو سکا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ایسے آدمی تیار ہوتے جو دین کے پورے تصور کو سمجھنے اور اس کی اقامت کی فکر انہیں لاحق ہوتی اور وہ اس کام کو انجام دینے کے اہل بھی ہوتے۔ اس تیسری قسم کے تصوف کی نہ ہم کلی تصدیق کرتے ہیں اور نہ کلّی تردید بلکہ اس کے پیرووں اور حامیوں سے ہماری گذارش یہ ہے کہ براہِ کرم بڑی بڑی شخصیتوں کی عقیدت کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے آپ اس تصوف پر کتاب و سنّت کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالیں اور اسے درست کرنے کی کوشش کریں نیز جو شخص اس تصوف کی کسی چیز سے اس بناء پر اختلاف کرے کہ وہ اسے کتاب و سنّت کے خلاف پاتا ہے تو قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی رائے سے موافقت کریں یا مخالفت بہرحال اس کے حقِ تنقید کا انکار نہ فرمائیں اور اسے

خواہ مخواہ نشانۂ ملامت نہ بنانے لگیں"۔

(ترجمان القرآن بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۷۱ھ فروری ۱۹۵۲ء)

باطن کی اصلاح

——— "لباس اور چہرہ کی وضع قطع کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے۔ اس کا جواب تو میں دیئے دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ظاہر کی اصلاح باطن کی اصلاح پر مقدم نہ ہونی چاہیئے۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو قرآنی معیار کے مطابق حقیقی مسلمان بنانے کی کوشش کیجئے پھر ظاہر کی تبدیلی اس حد تک کرتے جائیے جس حد تک باطن میں واقعی تبدیلی ہوتی جائے۔ ورنہ مجرد ضابطہ و قانون کو سامنے رکھ کر اگر آپ نے اپنے ظاہر کو اس نقشہ پر ڈھال لیا جو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ایک متقی انسان کے ظاہری نقشہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اندر حقیقی تقویٰ پیدا نہ ہوا تو آپکی مثال ایسی ہوگی جیسے تانبہ کے سکہ پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہوا ہو۔ اشرفی کا ٹھپہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے بہت آسانی سے جس سستی سے سستی دھات پر چاہیں اس کو لگا سکتے ہیں لیکن زرِ خالص بہم پہنچانا ایک مشکل کام ہے اور بہت مدت کی کیمیا گری سے یہ چیز حاصل ہوا کرتی ہے بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک مدت سے ظاہر پر غیر معمولی زور دیا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشرفی کے ٹھپہ کے ساتھ تانبے لوہے جیسے اور ہر قسم کی گھٹیا دھاتوں کے سکے چل پڑے ہیں۔ عملی دنیا کا بازار ایسا ہے لاگ صراف

ہے کہ زیادہ مدت تک اس جعلسازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ کچھ مدت تک تو ہمارے دھوکے کی اشرفیاں چل گئیں لیکن اب بازار میں کوڑی بھر بھی ان کی قیمت نہیں رہی ہے پس ہمیں اپنے اندر جس قسم کی دینداری پیدا کرنی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اشرفی کا ٹھپہ لگانے سے پہلے سونے کا سکہ بننے کی کوشش کریں ۔۔۔

۔۔۔ قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلہ کے لئے نکلیں اس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لئے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبات منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلان جنگ کریں یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر شرابیوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ تضاد ہماری تحریک کے لئے تباہ کن ہے پہلے خود خدا کے آگے سر جھکائیے پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجئے ۔۔۔ (ترجمان القرآن جلد ۲۵ عدد ۳، ۴ صفحہ ۱۰، ۱۴)

اجتماعیات

● اسلامی تحریک ● قومیت اسلام ● دنیا کے لئے فلاحی نظریہ

● خدا کے قانون کی ایک اہم دفعہ ● ایمان اور اطاعت

● اصلاح اور قیادت ● اصلاح کا صحیح طریق کار

اسلام ایک تحریک

——— "مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے۔ وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے اور اس کے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک عالمگیر تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور کچھ اصول لے کر آئی تھی اور مسلمان کا لفظ اس جماعت کے لئے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لئے اٹھائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی اس کا مقصد فراموش کر دیا گیا اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑ دیا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھو دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے بعد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے۔ جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں اور جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔"

(سیاسی کشمکش سوئم صفحہ ۲۸)

قومیتِ اسلام

——— "اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے ایک گھر کے دو آدمی اس دائرے

سے جدا ہو سکتے ہیں اور مشرق و مغرب کا بعد رکھنے والے دو آدمی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

اس دائرے کا محیط ایک کلمہ ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسی کلمہ پر دوستی بھی ہے اور دشمنی بھی۔ اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کر دیتا ہے۔ جن کو اس نے جدا کر دیا ہے، ان کو نہ خون کا رشتہ جمع کر سکتا ہے نہ خاک کا، نہ زبان کا، نہ روٹی کا، نہ حکومت کا۔ اور جن کو اس نے جمع کر دیا ہے۔ انہیں کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی۔ کسی دریا، کسی پہاڑ، کسی سمندر، کسی زبان، کسی نسل، کسی رنگ اور کسی زر و زمین کے قضیہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسلام کے دائرے میں امتیازی خطوط کھینچ کر مسلمان اور مسلمان کے درمیان فرق کرے۔ ہر مسلمان خواہ وہ چین کا باشندہ ہو یا مراکش کا۔ گورا ہو یا کالا۔ ہندی ہو یا عربی۔ سامی ہو یا آرین، ایک حکومت کی رعیت ہو یا دوسری کی، مسلمان قوم کا فرد ہے۔ اسلامی سوسائٹی کا رکن ہے۔ اسلامی اسٹیٹ کا شہری ہے۔ اسلامی فوج کا سپاہی ہے۔ اسلامی قانون کی حفاظت کا مستحق ہے۔ شریعت اسلامیہ میں کوئی ایک دفعہ ایسی نہیں ہے جو عبادات، معاملات، معاشرت، معشیت، سیاست غرض زندگی کے کسی شعبہ میں جنسیت یا زبان یا وطنیت کے لحاظ سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے مقابلے میں کمتر یا بہتر حقوق دیتی ہو۔" (مسئلہ قومیت ۲۳ - ۲۲)

دنیا کے لئے فلاحی نظریہ

"دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے

تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے۔

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے جس کا تصورِ انسانیت مغربی سائنس کے "تصورِ حیوانی" اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندومت کے "عبورِ تناسخ" سے بلند تر ہو۔

جو انسان کو مختارِ مطلق اور شترِ بے مہار نہ بنائے۔ بلکہ اسے سلطانِ کائنات کے اقتدارِ اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھہرائے

جو اخلاق کے ایک ایسے قابلِ عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق ردّو بدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو۔ جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے۔ جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو جو اجتماعی زندگی کے لئے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی عقلی و تمدنی ارتقاء میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے۔ اور مادی و اخلاقی ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کونسا ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔"

(سیاسی کشمکش سوئم صفحہ ۱۹۹ – ۲۰۰)

خدا کے قانون کی ایک اہم دفعہ

—— خدا کے قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا۔

مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارا جائے اس کے دیئے ہوئے ذرائع اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور اس سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی اسے پسند کرے گا۔ کہ اس کی دنیا بگاڑ دی جائے۔ اجاڑ دی جائے اور اس کو بدنظمی سے گندگیوں سے ظلم وستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظرِ انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ انہی کو وہ یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔

پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا جب تک ان کا بناؤ ان کے بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور کم بگاڑنے والا امیدان میں موجود نہیں ہوتا اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے سارے قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔ مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں۔ تو خدا

انہیں ہٹا کر پھینک دیتا ہے اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔ یہ قانون بالکل ایک فطری قانون ہے اور آپ کی عقل گواہی دے گی کہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ (بناؤ اور بگاڑ صفحہ ۳)

ایمان اور اطاعت

"کوئی مذہب یا تہذیب ہو۔ یا کسی قسم کا نظام جماعت ہو۔ اس کے متعلق دو ہی طرزِ عمل انسان کے لیے معقول ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں داخل ہو تو اس کے اساسی اصول پر پورا پورا اعتقاد رکھے اور اس کے قانون و ضابطہ کی پوری پوری پابندی کرے۔ اور اگر ایسا نہیں کر سکتا۔ تو اس میں داخل نہ ہو یا ہو چکا ہے تو بالاعلان اس میں سے نکل جائے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت معقول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نامعقول کوئی طرزِ عمل نہیں ہو سکتا۔ کہ تم ایک نظام میں شریک بھی ہو۔ اس کے ایک جزو بن کر بھی رہو۔ اس نظام کے تابع ہونے کا دعوے بھی کرو اور پھر اس کے اساسی اصولوں سے کلاً یا جزاً انحراف بھی کرو۔ اور اس کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرو۔ اپنے آپ کو اس کے آداب اور اس کے ضوابط کی پابندی سے مستثنیٰ بھی کر لو اس ــــ طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ تم میں منافقانہ خصائل پیدا ہوں خلوصِ نیت سے تمہارے دل خالی ہو جائیں۔ تمہارے قلوب میں کسی مقصد کے لئے گرم جوشی اور رسوخِ عزم نہ پیدا ہو سکے۔ فرض شناسی۔ اتباعِ قانون اور باضابطگی کے اوصاف سے تم عاری ہو جاؤ۔ اور تم میں یہ صلاحیت

باقی نہ رہے۔ کہ کسی نظامِ جماعت کے کار آمد رکن بن سکو۔ ان کمزوریوں اور بدترین عیوب کے ساتھ تم جس جماعت میں بھی شریک ہو گے۔ اس کے لئے لعنت بن جاؤ گے جس نظام میں بھی داخل ہو گے۔ اسے درہم برہم کر دو گے۔ جس تہذیب کے جسم میں داخل ہو گے اُس کے لئے جذام کے جراثیم ثابت ہو گے۔ جس مذہب کے پیرو بنو گے۔ اس کو مسخ کر کے چھوڑو گے اور ان اوصاف کے ساتھ تمہارے مسلمان ہونے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ جس گروہ کے اصولوں پر تمہارا دل ٹھکے اور جس گروہ کے طریقوں کی تم پوری پوری پیروی کر سکو۔ اسی میں جا شامل ہو۔ منافق مسلمان سے تو وہ کافر بہتر ہیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے دل سے معتقد ہوں اور اس کے ضوابط کی پابندی کریں۔" (تنقیحات ۱۴۰۔ ۱۴۶ ایمان اور اطاعت دسمبر ۱۹۳۴ء)

اصلاح اور قیادت

"دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رُخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں۔ جو لوگ اسمیں بیٹھے ہوئے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں۔ جس طرف گاڑی جا رہی ہے خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر گاڑی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہے جو اس سمت پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے

بیٹھا اپنی نشست کا رُخ آگے کے بجائے پیچھے یا دائیں یا بائیں پھیر دے مگر نشست کا رُخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رُخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رُخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے اور اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور فکرِ اسلامی سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے گاڑی اپنے مسافروں کو لئے ہوئے الحاد اور مادہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزلِ مقصود سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس رفتار کو بدلنے کے لئے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اٹھیں اور جدوجہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہو گا گاڑی کا رُخ نہ بدلے گا۔ اور ہمارے جھنجھلانے۔ بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔"

(تنقیحات ستمبر ۱۹۳۴ء)

اصلاح کا صحیح طریق کار

——— "اسلام کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس کے نظام اور اصول اور قوانین کو سمجھنے میں اپنی عمر کا کوئی ذرا سا حصہ بھی صرف نہ کیا ہو وہ ادھر ادھر سے چند آیات اور چند احادیث جمع کر کے چند گھنٹوں کے اندر بڑے بڑے دینی مسائل کے مجتہدانہ فیصلے کر ڈالیں اور الٹا ان لوگوں

کو احمق بنانے کی کوشش کریں جنہوں نے اپنی عمریں اس دین کے نظام اور احکام کو سمجھنے میں کھپا دی ہیں یا چند نواب زادے اور چند وکیل اور بیرسٹر صاحبان بیٹھ کر سراسر دنیوی اغراض اور مصلحتوں کی بنیاد پر ایک اصلاحی اسکیم تصنیف کریں اور پھر اسلام کے نام سے اس کو محض پیش کر دینے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ دھڑلے کے ساتھ یہ بھی فرما دیں کہ جو مولوی اور ملّا اس کے مطابق فتوے دے بس وہی دین کو جانتا ہے یہ محض جہالت ہی نہیں جہل مرکب ہے۔ اس طرح کے مصلحین کو جاننا چاہیئے کہ یہ رویہ کسی معقول آدمی کو زیب نہیں دیتا ان کو جاننا چاہیئے کہ اسلام ایک باقاعدہ نظام ہے جو اپنا ایک مستقل فلسفۂ زندگی اپنے جامع اور ہمہ گیر اصول اور اپنے مخصوص ضوابط اور قوانین رکھتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کا علم حاصل کیے بغیر جو کچھ چاہے اپنے دل سے گھڑ کر یا دوسری جگہ سے لا کر اس کے نظام میں کھپا دے یا ایک سرسری سی واقفیت کے بل بوتے پر مجتہدِ مطلق بن بیٹھے اور اپنے ذہن کی تمام پیداوار کو قطعی اور حتمی فیصلوں کی صورت میں برآمد کرنا شروع کر دے۔ ان کو جاننا چاہیئے کہ موجودہ خرابیوں کی اصلاح اور ایک نئے صالح نظام کی تاسیس اگر ہم خود اپنی صوابدید سے کریں تو اس کو اسلام کی طرف منسوب کرنا غلط ہے اور اگر یہ کام ہمیں اسلام کے طریقے پر کرنا ہو تو لامحالہ ہم کو ساری اصلاح و تاسیس ان حدود کے اندر کرنی ہو گی جو اسلام نے مقرر کی ہے اور ان اصولوں کے مطابق کرنی ہو گی جو اس نے ہم کو دیئے ہیں۔

ان پہلوؤں سے اگر لوگ اپنے ذہن کو صاف کر لیں اور ہر شخص اور گروہ اپنے حدود کار کو پہچان کر اپنی کارفرمائی اور کارگزاری کو اپنی اہلیت کی حد تک محدود رکھے تو بہت سی وہ الجھنیں دور ہوجائیں جن کی وجہ سے کام بننے کی بجائے الٹا بگڑ رہا ہے"

(مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۶۹-۷۰)

عمرانیات

● والدین اور بچے ● دورِ جدید کا مسلمان ● مسئلۂ لباس
● اسلامی معاشرت میں پردہ ● اسلام اور تہوار

والدین اور بچے

"_______ صنفی میلان کی آوارگی اور بے اعتدالی سے روک کر اس کے فطری مطالبات کی تشفی و تسکین کے لئے جو راستہ خود فطرت چاہتی ہے کہ کھولا جائے وہ صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کی صورت میں مستقل وابستگی ہو اور اس وابستگی سے خاندانی نظام کی بنا پڑے تمدن کے وسیع کارخانے کو چلانے کے لئے جن پرزوں کی ضرورت ہے وہ خاندان کی اسی چھوٹی کارگاہ میں تیار کئے جاتے ہیں یہاں لڑکیوں اور لڑکوں کے جوان ہوتے ہی کارگاہ کے منتظمین کو خود بخود یہ فکر لگ جاتی ہے کہ حتی الامکان ان کے لئے ایسے جوڑ لگائیں جو ایک دوسرے کے لئے زیادہ مناسب ہوں تاکہ ان کے ملاپ سے زیادہ سے زیادہ بہتر نسل پیدا ہو سکے پھر ان سے جو

نسل نکلتی ہے اس کارگاہ کا ہر کارکن اپنے دل کے سچے جذبہ سے کوشش کرتا ہے کہ اس کو جتنا بہتر بنا سکتا ہے بنائے۔ زمین پر اپنی زندگی کا پہلا لمحہ شروع کرتے ہی بچہ کو خاندان کے دائرہ میں محبت، خبر گیری، حفاظت اور تربیت کا وہ ماحول ملتا ہے جو اس کی نشوونما کے لئے آب حیات کا حکم رکھتا ہے درحقیقت خاندان ہی میں بچے کو وہ لوگ مل سکتے ہیں جو اس سے نہ صرف محبت کرنے والے ہوں بلکہ جو اپنے دل کی امنگ سے یہ چاہتے ہوں کہ بچہ جس مرتبہ پر پیدا ہوا ہے اس سے اونچے مرتبے پر پہنچے۔ دنیا میں صرف ماں اور باپ ہی کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ہر لحاظ سے خود اپنے سے بہتر حالت میں اور اپنے سے بڑھا ہوا دیکھیں اس طرح وہ بلا ارادہ، غیر شعوری طور پر آئندہ نسل کو موجودہ نسل سے بہتر بنانے اور انسانی ترقی کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی اس کوشش میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا وہ اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے وہ بس اپنے بچے کی فلاح چاہتے ہیں اور اس کے ایک کامیاب اور عمدہ انسان بن کر اٹھنے ہی کو اپنی محنت کا کافی صلہ سمجھتے ہیں۔

(پردہ صفحہ ۱۶۷)

دورِ جدید کا مُسلمان

——— یہی بحرانی کیفیت کا زمانہ تھا جس میں مغربی لباس مغربی معاشرت مغربی آداب و اطوار حتیٰ کہ چال ڈھال اور بول چال تک میں مغربی طریقوں کی نقل اتاری گئی مسلم سوسائٹی کو مغربی سانچوں میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں۔ الحاد، دہریت اور مادہ پرستی کو فیشن کے طور پر بغیر سمجھے بوجھے قبول کیا گیا۔ ہر وہ پختہ یا خام تخیل جو مغرب

سے آیا اس پر ایمان بالغیب لانا اور اپنی مجلسوں میں اس کو معرض بحث بنانا روشن خیالی کا لازمہ سمجھا گیا۔ شراب، جوا، لاٹری، ریس، تھیٹر، رقص و سرود اور مغربی تہذیب کے دوسرے ثمرات کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شائستگی، اخلاق معاشرت، معیشت سیاست، قانون حتیٰ کہ مذہبی عقائد اور عبادات کے متعلق بھی جتنے مغربی نظریات یا عملیات تھے ان کو کسی تنقید اور کسی فہم و تدبر کے بغیر اس طرح تسلیم کر لیا گیا کہ گویا وہ آسمان سے اتری ہوئی وحی ہیں جس پر سمعنا و اطعنا کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسلامی تاریخ کے واقعات اسلامی شریعت کے احکام اور قرآن و حدیث کے بیانات میں سے جس جس چیز کو اسلام کے پرانے دشمنوں نے نفرت یا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا اس پر مسلمانوں کو بھی شرم آنے لگی اور انہوں نے کوشش کی کہ اس داغ کو کسی طرح دھو ڈالیں۔ انہوں نے جہاد پر اعتراض کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور بھلا ہم کہاں اور جہاد کہاں! انہوں نے غلامی پر اعتراض کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ غلامی تو ہمارے ہاں بالکل ہی ناجائز ہے۔ انہوں نے تعدد ازدواج پر اعتراض کیا۔ انہوں نے فوراً قرآن کی ایک آیت پر خط نسخ پھیر ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ عورت اور مرد میں کامل مساوات ہونی چاہیے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہی ہمارا مذہب بھی ہے۔ انہوں نے قوانین نکاح و طلاق پر اعتراضات کیے۔ یہ ان سب میں ترمیم کرنے پر تُل گئے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آرٹ کا دشمن ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام تو ہمیشہ سے ناچ گانے اور مصوری اور بت تراشی کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔"

(پردہ صفحہ ۳۶، ۳۷، ۳۸)

مسئلہ لباس

——— ایک قوم کا دوسری قوم کے لباس وطرزِ معاشرت کو اختیار کرنا دراصل احساس کمتری کا نتیجہ اور اس کا اعلان ہے اس کے معنے دراصل یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود ذلیل، دُنی اور پست سمجھتی ہے اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس پر وہ فخر کر سکے۔ اس کے اسلاف کوئی ایسی چیز چھوڑ جانے کے قابل ہی نہ تھے جسے وہ شرم کئے بغیر برقرار رکھ سکتی ہو۔ اس کا قومی مذاق اتنا پست اور اس کا قومی ذہن اتنا کند ہے اور اس کے اندر تخلیقی قوتوں کا ایسا فقدان ہے کہ وہ خود اپنے لئے کوئی بہتر طرز زندگی پیدا نہیں کر سکتی وہ اپنے آپ کو مہذب دکھانے کے لئے سب کچھ دوسروں سے مانگ لاتی ہے اور بغیر کسی شرم کے دنیا کے سامنے اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ تہذیب۔ شائستگی۔ حضارت اور حسن وجمال جو کچھ بھی ہے دوسروں کی زندگی میں ہے وہی ہر کمال کا معیار ہیں اور ہم خود سینکڑوں ہزاروں برس کی قومی زندگی میں گویا جانوروں کی طرح جیتے رہے ہیں ہم کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہ کر سکے جو قدر وعزت کے لائق ہو یا زندہ رہنے کی مستحق ہو۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قوم میں خودداری کا شائبہ بھی باقی ہو وہ اس طرح اپنی ذلت وپستی کا مجسم اشتہار بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے اور خود موجودہ زمانے کے حالات جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس پر شہادت دیتے ہیں کہ اس حقیر وذلیل حیثیت کو ایک قوم دو ہی حالتوں میں گوارا کرتی ہے یا تو اس وقت جب کہ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پٹ کر اور پیہم شکستیں کھا کر ہارمان

لے اور ڈگیں ڈال دے۔ مثلاً ہندوستان، ٹرکی، ایران، مصر وغیرہ یا پھر اس صورت میں جب کہ فی الواقع اس کی پشت پر کسی قسم کی قابل فخر روایات (TRADITIONS) نہ ہوں اس کی اپنی کوئی تہذیب و ثقافت پہلے سے نہ رہی ہو اس میں اعلیٰ درجے کی تخلیقی قوتیں بھی نہ ہوں اور وہ اقوام عالم کے درمیان محض ایک نو دولتے کی حیثیت رکھتی ہو۔ جیسے جاپان۔" (مسئلہ لباس، جنوری ۱۹۳۸ء)

اسلامی معاشرت میں پردہ

"اسلامی قانون معاشرت کا مقصد ضابطۂ ازدواج کی حفاظت صنفی انتشار کی روک تھام اور غیر معتدل شہوانی تحریکات کا انسداد ہے اس غرض کے لئے شارع نے تین تدبیریں اختیار کی ہیں ایک اصلاح اخلاق دوسرے تعزیری قوانین تیسرے انسدادی تدابیر یعنی ستر و حجاب، گویا تین ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے جن کے استحکام پر اس عمارت کا استحکام منحصر ہے اور جن کا انہدام دراصل اس پوری عمارت کا انہدام ہے اگر احوال زمانہ پر ہی فیصلہ کا انحصار ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کے احوال پردے کی تخفیف کے نہیں اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں کیونکہ آپ کے نظام معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دارومدار صرف ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھئے، غور کیجئے اسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں مگر اس بچے کھچے ستون کو جو پہلے ہی کافی کمزور

ہو چکا ہے اور زیادہ کمزور نہ بنائیے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیئے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لئے دو آنکھیں موجود ہوں وہیں ان آنکھوں کو نکال لینے کے لئے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں"۔ (پردہ صفحہ ۳۹۲، ۳۹۷)

اسلام اور تہوار

"ـــــــــ ایک قوم کا تہوار منانے کا طریقہ گویا ایک پیمانہ ہے جس سے آپ اس کے مزاج اور اس کے حوصلے اور امنگوں کو علانیہ ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جتنی بلند اخلاقی کی روح کسی قوم میں ہو گی۔ اتنے ہی اس کے تہوار مہذب اور پاکیزہ ہوں گے اور اسی طرح اخلاقی اعتبار سے کوئی قوم جتنی پست ہو گی وہ اپنے تہواروں میں اتنے ہی مکروہ مناظر پیش کرے گی۔

اسلام چونکہ ایک عالمگیر اصلاحی تحریک ہے جو کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک خدا پرستانہ تہذیب کا پیرو بنانا چاہتی ہے اس لئے اس نے جہاں زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے خاص ڈھنگ پر ڈھالا ہے اسی طرح تہواروں کو بھی ایک نئی شکل دی ہے جو دنیا بھر کے تہواروں سے مختلف ہے۔ سماجی زندگی میں تہوار کی جو اہمیت ہے اور سماج میں اجتماعی تقریبات کے لئے جو ایک قدرتی پیاس پائی جاتی ہے اس کو تو اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے مگر تہوار کی تقریب اور تہوار

کے منانے کے طریقے اور تہوار کی اخلاقی روح میں بنیادی تغیر کر دیا ہے"
(عید قربان صفحہ ۳،۴)

سیاسیات

● اسلامی حکومت ● آزادی کا مفہوم ● دستور اور اس کے اثرات ● اسلامی قانون کا نفاذ ● مسئلہ کشمیر ● دفاع مشرقی پاکستان ● دفاع پاکستان

اسلامی حکومت

"ہمارے پیش نظر مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ "اسلام کی حکومت" ہے۔ اسی اسلام کی جو مجموعہ ہے۔ دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے عام اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے۔ اور ان پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ کی مسند خلافت پر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاء اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں اسلام چلا آرہا ہے۔ وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا یہودی تھا شرک اور بت پرستی، شراب نوشی اور سود

اور قمار بازی میں مبتلا تھا۔ وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لئے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔" (سیاسی کشمکش سوم صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

آزادی کا مفہوم

"آزادی کے معنے صرف غیر قوموں کی غلامی سے آزاد ہونا ہی نہیں بلکہ خود اپنی قوم کے جباروں سے بھی آزاد ہونا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ دنیا میں بیشتر آزادی کی لڑائیاں باہر کے دشمنوں سے نہیں بلکہ گھر کے جباروں اور خود اپنی قوم کے ظالم حکمرانوں کے خلاف لڑی گئی ہیں۔ ایرانیوں کو خود اپنے ملک کے قاچاری حکمرانوں کے خلاف لڑنا پڑا۔ ترکوں نے خود اپنی قوم کے ہی عثمانی سلاطین سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ چین کو خود چینی بادشاہوں اور رئیسوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی پڑی۔ انگریزوں کو جو اپنے ملک اور قوم کے بڑے خیر خواہ ہیں خود اپنے ملک کے بادشاہوں اور امراء کے خلاف لڑنا پڑا۔ فرانس اور امریکہ کی داستان بھی یہی کچھ ہے اس لئے صرف اس بات پر مطمئن نہ ہو جائیے کہ یہاں گھر کے لوگ ہی حکومت کر رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آپ کی اس ریاست کو کس شکل میں ڈھال رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں کس قسم کے اختیارات لے رہے ہیں۔" (دستوری سفارشات صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸)

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

دستور اور اس کے اثرات

——— "دستور قانون کی نسبت زیادہ گہرے اثرات رکھتا ہے۔ دستور سے مراد وہ اصول اور وہ ضوابط ہوتے ہیں جن پر کسی مملکت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ ریاست کی تشکیل کس طرح کی جائے گی۔ اس کا انتظام کرنے والی حکومت کن ضوابط اور کن اصولوں کی پابند بنائی جائے گی؟ حکمرانی کے اختیارات کن لوگوں کے ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ ان کو کون کس طرح چنے گا؟ ان کو کیا اختیارات دیئے جائیں گے؟ باشندگان ملک کے کیا حقوق اور فرائض ہوں گے اور اگر حکومت مطلق العنان ہونا چاہے تو باشندگان ملک کے پاس کون سے آئینی تحفظات اور ذرائع ہوں گے جن سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں گے؟ دستور میں یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ حکومت کے کیا فرائض ہوں گے وہ کون کون سے کام کرنے کی مجاز ہوگی۔ آپ اپنی حکومت سے کسی ایسے کام کا مطالبہ نہیں کر سکتے جس کیلئے دستور میں گنجائش نہ ہو نہ اس کو کسی ایسے کام سے روک سکتے ہیں جس کیلئے دستور میں گنجائش رکھ دی گئی ہو۔ دستور میں یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ مملکت کے قوانین کی نوعیت کیا ہوگی وہ خدا کی شریعت پر مبنی ہوں گے یا انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت پر۔ ایسے معاملات کو اگر ان کے طے کرنے میں غفلت اور سہل انگاری برتی جائے تو ایک ریاست اپنے مسلمان باشندوں کی خواہش کے خلاف ایک غیر اسلامی نقشے پر تعمیر ہو سکتی ہے اور اس کے انتظام پر ایک ایسی حکومت قابض

ہو سکتی ہے جو حدود اللہ کی پابندی سے آزاد اور خلائی قانون کو توڑنے کی مجاز ہو پھر اگر دستور میں حکومت کو اتنے وسیع اختیار دیئے جائیں یا دستوری ڈھانچے میں ایسے شگاف اور چور دروازے رہنے دیئے جائیں جن سے حکومت مطلق العنانی کے لئے راستہ نکال سکے اور باشندگان ملک کے لئے ایسے آئینی تحفظات اور ضمانتیں موجود نہ ہوں جن سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں تو اس کے نتائج نہایت ہی خطرناک ہوتے ہیں"۔

(دستوری سفارشات پر تنقید صفحہ ۴۰۵ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اسلامی قانون کا تدریجی نفاذ

"سیاسی طاقت اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے وسیع پیمانے پر اصلاح و تعمیر کا وہ کام شروع کیا جس کے لئے آپ پہلے صرف دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے کوشش فرما رہے تھے آپ نے ایک مرتب اور منظم طریقہ سے لوگوں کے اخلاق۔ معاشرت تمدّن اور معیشت کو بدلنے کی جدّوجہد کی۔ تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقے پر تھا۔ جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرز فکر کی اشاعت کی پرانی رسموں اور طور طریقوں کی جگہ نئے نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب و اطوار جاری کئے اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعے سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب رُونما ہوتا گیا۔ آپ اسی کے مطابق پورے توازن اور تناسب کے ساتھ اسلامی

قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ۹ سال کے اندر ایک طرف اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہو گیا۔"

(اسلامی قانون - ۳۳، ۳۴)

مسئلہ کشمیر

——— "میں ایک ایسے مسئلہ پر اظہار رائے کروں گا جو ہمارے لیے بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی اور ہماری قومی زندگی کے لیے غیر معمولی اہمیت بھی رکھتا ہے یہ ہے کشمیر کا معاملہ۔

اس معاملہ میں ہمارا نقطۂ نظر نہ وطن پرستانہ ہے نہ قوم پرستانہ، ہم سارے معاملات کو سراسر حق پرستی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہی ہمارا نقطۂ نظر کشمیر کے معاملہ میں بھی ہے۔ ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ کشمیر پر قبضہ کرنے میں ہندوستان نے سراسر زیادتی کی ہے اور اس کے مقابلے میں پاکستان کا دعوے بالکل حق بجانب ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے۔ کہ ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ وہ اس کا حق تھا بلکہ صرف اس وجہ سے کیا کہ تقسیم کے وقت پاکستان کمزور تھا اور ہندوستان اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اپنے حق سے زائد ایک چیز حاصل کرلے۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہماری کمزوریوں کے ساتھ ہماری کوتاہیاں کیا تھیں۔ بہرحال یہ واقعہ اپنی جگہ بالکل عیاں ہے کہ اگر پاکستان نے اس وقت کشمیر پر قبضہ کرلیا ہوتا تو کوئی معقول آدمی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ ہندوستان بھی اسی طرح کشمیر کا دعوے لے کر اٹھتا جس

طرح آج پاکستان لے کر اٹھا ہے اور وہ بھی پاکستان کی طرح چیلنج کرتا۔ کہ آؤ کشمیر میں استصواب رائے عام کرا کے دیکھ لو۔ وہ خود جانتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی تقسیم محض مذہب کی بنیاد پر ہوئی تھی وہ خود جانتا ہے کہ وہی علاقے پاکستان بنائے گئے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور وہی علاقے ہندوستان میں شامل کیے گئے جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہ خود جانتا ہے کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے دوران جو کشت وخون ہوا جو قتل عام ہوا جو لوٹ مار ہوئی وہ سراسر اس بنیاد پر ہوئی کہ ہندوؤں اور سکھوں کے نزدیک ہر مسلمان گشتنی تھا اور مسلمانوں کے نزدیک ہر ہندو اور سکھ گردن زدنی تھا۔ ان ساری باتوں کو جانتے ہوئے کون یہ مان سکتا ہے کہ کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو ہندوستان واقعی ایمان داری کے ساتھ اپنا حق سمجھتا تھا اور اگر پاکستان اس پر قابض ہوگیا ہوتا تو وہ بھی یہ دعوٰے کرنے کی جرأت کر سکتا تھا کہ استصواب رائے کرا کر دیکھ لیا جائے۔ کشمیر کے باشندے ہندوستان سے الحاق کے حق میں رائے دیں گے۔ پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ کشمیر پر ہندوستان کا قبضہ حق کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ سراسر طاقت کی دھاندلی سے ہوا ہے اور اس معاملہ کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان نے یہ صریح بے شرمانہ دھاندلی اس زمانہ میں کی جب کہ گاندھی جیسا اخلاق کا علمبردار وہاں موجود تھا اور اس شخص کے ہاتھوں کی جو انگریزوں کی غلامی کے دور میں سیاست کو طاقت کے بجائے اخلاق پر قائم کرنے کا سب سے زیادہ بلند بانگ مدعی بنا

ہوا تھا۔ یعنی پنڈت جواہر لال نہرو۔ کشمیر اور جوناگڑھ کے معاملہ میں ہندوستان
نے بیک وقت جو دو مختلف پالیسیاں اختیار کی ہیں۔ پنڈت نہرو کے سوا
اور کون آدمی ایسا ہوگا جو عقل رکھتے ہوئے ان دونوں پالیسیوں کو متضاد
ماننے سے انکار کر سکے؟ ایک جگہ آپ اس بنیاد پر قبضہ کرتے ہیں کہ وہاں
کا حکمران چاہے مسلمان ہو مگر آبادی کی اکثریت ہندو ہے دوسری جگہ آپ
اس بنیاد پر قبضہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی آبادی کی اکثریت چاہے مسلمان ہو مگر
وہاں کا حکمران ہندو ہے ایک جگہ کا حکمران پاکستان سے الحاق کا اعلان کرتا
ہے تو آپ اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں اور اس الحاق کی دستاویز کو ایک سراسر
آئینی دستاویز سمجھ کر دانتوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ ایک جگہ آپ کے نزدیک اپنے
علاقے کی قسمت کا فیصلہ کرنا وہاں کے باشندوں کا کام ہے اور حکمران کا
فیصلہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو اور حکمران
مسلمان ہے۔ دوسری جگہ اس کے بالکل برعکس حکمران کا فیصلہ آپ کے
نزدیک بالکل بامعنی اور سو فیصدی قانونی ہے اور اس کو تسلیم کرنے کے
لئے باشندوں کی مرضی معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہاں حکمران
ہندو ہے اور باشندوں کی اکثریت مسلمان کیا یہ کھلا ہوا تضاد نہیں ہے؟
یہ حرکتیں ایک ایسے سیاسی لیڈر کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔ جو حق اور انصاف
اور راستی کے بجائے قوت اور زور کی بنا پر اپنی پالیسی بناتا ہو اور بالکل ایک
ابن الوقت (Opportunist) کی طرح ہر موقع کے لئے ایک
نیا اصول گھڑ لیتا ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنے اس طرز عمل

سے اپنی اس ساری عزت و وقعت کو خاک میں ملا دیا ہے جو انہوں نے عمر بھر سیاست میں اخلاق کی علمبرداری کر کے حاصل کی تھی۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بھی ظاہر کر دوں کہ ہماری نگاہ میں کشمیر کے معاملہ کی اصل اہمیت اور غیر معمولی اہمیت کس وجہ سے ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک کے لئے ایک وسیع علاقہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اپنے ملک کی معشیت کے لئے کشمیر کو ناگزیر پاتے ہیں۔ یہ ایک قوم پرست اور وطن پرست کا نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے مگر ایک حق پرست کا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا ہمارے لئے اس معاملہ کی ساری اہمیت اس وجہ سے ہے کہ کشمیر کے 30، 35 لاکھ مسلمانوں کا مستقبل ہم کو خطرے میں نظر آ رہا ہے کون نہیں جانتا کہ جموں کے علاقے سے بیشتر مسلمان نکالے جا چکے ہیں؟ کس کو معلوم نہیں ہے کہ پٹھان کوٹ سے لے کر دلی تک کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے؟ کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ہندوستان نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت اپنے ان تمام علاقوں کو مسلمانوں سے خالی کرایا ہے جو مغربی پاکستان کی سرحد سے متصل واقع ہیں اور اب اسی پالیسی پر مشرقی پاکستان کی طرف بھی عمل ہو رہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کبھی یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اگر کشمیر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہندوستان کے حق میں ہو گیا تو وہ زیادہ مدت تک اپنے انتہائی شمالی سرے پر ایک مسلم اکثریت کے علاقے کو برداشت کرتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا جب کشمیر کی ساری مسلمان آبادی مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح گھروں

سے نکالی جائے گی اور مار مار کر اس کو بیک بینی و دوگوش پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ آج کشمیریوں کی جو مدارات ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ یہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو بس اس وقت تک ہے جب تک کشمیر کا قضیہ معلق ہے اس کے یکسو ہو جانے کے بعد یہ ہرگز امید نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان اس مسلم اکثریت کو پاکستان کے قریب یوں اطمینان سے بیٹھا رہنے دے گا اس لئے ان لاکھوں انسانوں کی خاطر جو کشمیر میں بستے ہیں ان کی جان اور مال اور آبرو کی خاطر اور ان کے پیدائشی انسانی حقوق کی خاطر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستان کے چنگل سے نکالا جائے اور ہم صاف کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے ہم آخری حدود تک جانے کو تیار ہیں۔" (ہمارے داخلی اور خارجی مسائل صفحہ ۴۱ تا ۴۵) مارچ ۱۹۵۱ء

دفاع مشرقی پاکستان

—— "ایک نہایت ضروری تدبیر یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کو دفاع کے سلسلے میں جلدی سے جلدی خود مکتفی بنایا جائے کیونکہ اس کے بغیر اس خطے کے باشندوں میں اپنی آزادی کا یقین اور اس کے بقا کا اعتماد قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی صحیح بہانہ نہیں ہے کہ وہاں کے نوجوان فوجی خدمات میں بھرتی ہونے کے لئے آگے نہیں بڑھتے۔ اگر وہ نہیں بڑھتے تو انہیں اکسانا اور شوق دلانا اور ان کی ہمت افزائی کرنا ان لوگوں کا فرض ہے جن پر اس ملک کے تحفظ کی ذمہ داری ہے۔ ان کو بنگالی نوجوانوں میں فوجی خدمت کا شوق پیدا کرنے کے

لئے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کرنا چاہیئے انہیں کم از کم ۲۰ لاکھ نوجوان کو فوجی تربیت دینی چاہیئے۔ انہیں سرحدوں کے قریب کی تمام بستیوں کو دفاع کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ اگر اس میں کوتاہی کی گئی تو وہ خطہ جو ہر طرف بھارت سے گھرا ہوا ہے خطرے کے وقت اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔"

دفاع پاکستان

"یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان پورے کا پورا سرحد ہے کوئی بڑا شہر ایسا نہیں جو سرحد پر واقع نہ ہو اس لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی ڈیوٹی سمجھے اور ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہے۔ ایسے موقع پر سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو حاصل ہوتی ہے جسے کافر و مومن سب جانتے ہیں وہ قوم کا مورال (Morale) ہے یعنی اس کی اگر اخلاقی طاقت موجود نہ ہو تو دوسری جنگی طاقت بے کار ثابت ہوا کرتی ہے اخلاقی طاقت کی کمی کو اسلحہ کی فراوانی پورا نہیں کر سکتی بلکہ اس حالت میں ایک قوم کے اپنے فراہم کردہ اسلحہ اس کے دشمن کے کام آتے ہیں۔ ہم اخلاقی قوت کو صرف حوصلے اور ہمت اور جذبہ دفاع تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ اسے پورے اخلاقی کردار پر حاوی سمجھتے ہیں اس لئے کہ جسے اللہ سے مدد حاصل کرنی ہو اسے اپنی تمام زندگی کو اس کی مرضی کے مطابق بنانا پڑتا ہے یہ سراسر ایک نامعقول بات ہے کہ ایک شخص یا قوم ایک طرف اللہ کی نافرمانی کرے اور دوسری طرف اس سے مدد بھی مانگے۔ جو قوم خدا کو سرے سے نظر

ہی نہ ہو وہ تو اس کی نافرمانیاں کر کے کچھ دیر پنپ بھی سکتی ہے کیونکہ اس کے لئے اللہ کا قانون امہال واستدراج دوسرا ہے مگر جو قوم خدا پرستی کی مدعی رہی، کتاب الٰہی کی حامل اور دین حق کی نمائندہ بنی ہوئی ہو وہ اگر احکام الٰہی کے ساتھ اس طرح کے مذاق کرنے پر اتر آئے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت خدا کی سزا سے نہیں بچا سکتی۔ یہ حرکتیں خدا کی رحمت کو نہیں بلکہ اس کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔

—— مورال کی بحالی کے لئے جوشیلی تقریریں اور بڑے بڑے اعلان بھی کام نہیں آتے اس قسم کی خالی خولی پُرجوش باتوں سے مورال اگر بحال بھی ہو جائے تو یہ مستقل نہیں عارضی ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ باتوں کی بجائے عملاً اپنا زور بڑھائیں۔

بالخصوص ہمیں اپنے عوام اور خواص کو یہ تلقین کرنا چاہیئے کہ حملے کے وقت جہاں کہیں مقیم ہوں وہیں جمے رہیں۔ وہاں سے فرار کی کوشش ہرگز ہرگز نہ کریں۔ انہیں سمجھایا جائے کہ تم موت سے تو بھاگ نہیں سکتے اگر موت کا وقت آن پہنچا ہے تو کوئی مضبوط قلعہ بھی تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا اگر میدان جنگ میں بمباری ہو رہی ہے اور موت کا وقت نہیں آیا ہے تو موت نہیں آئے گی یہ تو مسلمان کا عقیدہ ہے کہ موت سے بچ نکلنا اپنی تدبیر پر منحصر نہیں ہے۔ موت تو اپنے وقت مقررہ پر ہی آئے گی۔ ایسے موقع پر بھاگ اٹھنا اور بال بچوں کو بچانے کی کوشش کرنا ہر لحاظ سے غلط ہے۔ ان کو بتائیے کہ اب ہمارے پاس اور جگہ بھی کہاں ہے جہاں

جا کر ہم پناہ لے سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح سے یہ ٹڈی دل جہاں جس آبادی میں جائے گا اسے بھی ختم کر دے گا۔ حریف کے پاس تو کافی جگہ ہے وہ بہت دور تک پیچھے ہٹ سکتا ہے مگر ہمارے پاس کہیں بھی اتنی جگہ نہیں ہے کہ یہاں سے بھاگ کر کہیں آرام کی زندگی بسر کر سکیں اس لئے ضروری ہے کہ جہاں کہیں کوئی ہے وہیں ڈٹ کر رہے اور کٹ مرنے کے لئے تیار رہے۔

— ایک اور چیز جسے دفاع کے معاملے میں خاص اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے اندر ظلم وستم اور بے انصافیوں اور حق تلفیوں کو قطعی طور پر بند ہونا چاہئیے اگرچہ یہ چیزیں کسی حالت میں بھی معاشرے کے اندر موجود نہ رہنی چاہئیں لیکن جنگ کے موقع پر جو شخص اس طرح کی کوئی حرکت کرتا ہے وہ دراصل ہماری مدافعت کے قلعے میں شگاف کرتا ہے اور دشمن کو گھس آنے کا راستہ دیتا ہے۔ یہ ایک معمولی سمجھ بوجھ کی بات ہے کہ ایک آدمی کے دل میں اگر ملک کے بچانے کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ محسوس کرتا ہو کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں اس کے حقوق محفوظ ہیں اس کی عزت محفوظ ہے اور اس کے سارے حوصلے پورے ہو سکتے ہیں لیکن اگر اسے زندگی کے تلخ واقعات یہ محسوس کرائیں کہ یہاں نہ اس کی عزت ہی محفوظ ہے اور نہ اس کے شخصی حقوق تو کوئی وجہ نہیں کہ محض اس سرزمین کے خاک کے ذرّوں کی حفاظت کے لئے کوئی جذبہ اس کے اندر مشتعل ہو۔ یہی ہے کہ جہاں عام لوگ انصاف سے محروم ہوں۔ معاشی ظلم نے

لوگوں کو فاقہ کش بنا دیا ہو اور بالا دستوں کے ہاتھوں زیر دستوں کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہ ہو وہاں بیرونی حملوں کے موقع پر عوام میں کوئی جذبۂ دفاع پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز محفوظ ہی نہیں ہوتی جو انہیں جان سے بڑھ کر عزیز ہو اور جسے بچانے کی وہ ضرورت محسوس کریں۔ بلکہ تاریخ میں بارہا یہ مثالیں سامنے آچکی ہیں کہ ایسے حالات میں عام آبادی نے بیرونی حملوں کا سرد مہری کے ساتھ سامنا کیا ہے اور بسا اوقات مظلوم آبادی نے محض جذبۂ انتقام کے تحت باہر کے حملہ آوروں کا خیر مقدم تک کیا ہے تاکہ اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کی پامالی دیکھیں جو ان کے حقوق پامال کرتے رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تاریخ کی ان مثالوں سے ہم سبق لیں اور ہم میں کا ہر فرد دوسروں کے حقوق اور عزت و آبرو کا پاس و لحاظ کرے اور ہمارے ملک میں کامل عدل و انصاف قائم ہو ظلم سے بڑھ کر قومی دفاع کو کمزور کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے جو شخص اپنی نفسانیت کی خاطر اپنی قوم کے لوگوں کو بے غیرت اور بے حمیت بناتا ہے وہ دراصل دشمنوں کے لئے راستہ صاف کرتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سرزمین ہمارا نہیں بلکہ اسلام کا گھر ہے۔ یہاں ہمیں صدیوں کے بعد پھر موقعہ ملا ہے کہ خدا کے دین کو اس کی اصلی صورت میں قائم کریں۔ اور دنیا کے سامنے اس کی صداقت کی عملی شہادت پیش کریں ہمارے لئے یہ سب سے بڑی نعمت ہے اور ہم ہر قیمت پر اس کی حفاظت کے لئے تیار رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے

ہر مسلمان میں اس نعمت کی قدر کا جذبہ پیدا کریں اور اس کے قلب و روح میں یہ خیال جاگزیں کر دیں کہ اس نعمت کی حفاظت میں کوئی قربانی بھی گراں نہیں ہے۔ یاد رکھئے خدا اور اس کے دین کی خاطر جان دینے کا مرتبہ اپنے گھر بار، اپنے مال و آبرو کی خاطر جان دینے سے بدرجہا زیادہ بلند ہے اور اس جذبے کے تحت جو شہادت میسر ہو وہ بہت اونچے درجے کی شہادت ہے۔"

(ذمام پاکستان کے سلسلے میں چند اہم مشورے ۱۹۴۹ء)

معاشیات

● کسبِ رزق کا مساویانہ حق ● اسلام اور معاشی مسئلہ

کسب رزق کا مساویانہ حق

اسلامی نقطۂ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کے لئے بنائی ہیں اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔ کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی شخص نسل یا طبقہ پر ایسی کوئی پابندی از روئے شرع عائد نہیں ہو سکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حقدار ہی نہ رہے یا بعض پیشوں کا دروازہ اس پر بند کر دیا جائے۔ اس طرح ایسے امتیازات بھی شرعاً

قائم نہیں رہ سکتے جن کی بناء پر کوئی ذریعۂ معاش یا وسیلہ رزق کسی مخصوص طبقے یا نسل یا خاندان کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کئے ہوئے وسائل رزق میں سے اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کے لئے یکساں کھلے ہونے چاہئیں۔" (اسلامی معاشیات کے اصول) (صفحہ ۱، ۱۹۴۸ء)

اسلام اور معاشی مسئلہ

—— "اسلام نے زائد از ضرورت دولت کے جمع کرنے کو معیوب قرار دیا ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہے یا تو اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کر دیا دوسروں کو دو کہ وہ اسی سے اپنی ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت برابر گردش میں آتی رہے۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے اور جمع کرنے پر ہی اصرار کرتے ہو۔ تو تمہاری اس جمع کردہ دولت میں سے ازروئے قانون ۲ ½ % سالانہ رقم نکلوا لی جائے گی اور اسے ان لوگوں کی اعانت پر صرف کیا جائے گا۔ جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں یا سعی جہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام زکواۃ ہے اور اس کے انتظام کی صورت جو اسلام نے تجویز کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسے جماعت کے مشترک خزانے میں جمع کیا جائے۔ اور خزانہ ان تمام لوگوں کی ضروریات

کا کفیل بن جاتے جو مدد کے حاجت مند ہیں۔ یہ دراصل سوسائٹی کے لئے انشورنس کی بہترین صورت ہے اور ان تمام خرابیوں کا استیصال کرتی ہے جو اجتماعی امداد و معاونت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ـــ ـــ اسلام زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعہ سے ان ساری خرابیوں کا استیصال کرتا ہے۔ بیت المال ہر وقت آپ کی پشت پر ایک مددگار کی حیثیت سے موجود ہے آپ کو فکر فردا کی ضرورت نہیں۔ جب آپ حاجت مند ہوں بیت المال میں جائیے۔ اور اپنا حق لے آئیے۔ پھر بنک ڈپازٹ اور انشورنس پالیسی کی کیا ضرورت۔ آپ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر باطمینان تمام دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔ آپ کے پیچھے جماعت کا خزانہ ان کا کفیل ہے بیماری بڑھاپے آفات ارضی و سماوی ہر صورت حال میں بیت المال وہ دائمی مددگار ہے جس کی طرف آپ رجوع کر سکتے ہیں۔ سرمایہ دار آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ اسی کی شرائط پر کام کرنا قبول کرلیں۔ بیت المال کی موجودگی میں آپ کے بھوکے ملنے اور برہنگی اور بے سائیگی کا کوئی خطرہ نہیں۔"

(انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل صفحہ ۴۰، ۴۱)

تعلیمات

- موجودہ نظام تعلیم
- تعلیم میں جدید و قدیم کا جوڑ
- میدان علم کا امام

موجودہ نظامِ تعلیم

"موجودہ نظامِ تعلیم میں ملّتِ اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملّت کی پیشوائی کے لئے نہیں بلکہ اس کی غارتگری کے لئے تیار کرتا ہے ان درسگاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس معاشیات، قانون، سیاست، تاریخ اور دوسرے تمام وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے مگر آپ کو اسلام کے فلسفے، اسلام کی اساسِ حکمت، اسلام کے اصولِ معشیت، اسلام کے اصولِ قانون، اسلام کے نظریۂ سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر اسلامی طور پر سوچنے لگتے ہیں۔ غیر اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے ہر معاملے کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں۔ منتشر طور پر کچھ معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں مگر وہ غیر مستند اور لبا اوقات اوہام و خرافات کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اسلام سے اور زیادہ بعید ہوجاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں وہ دماغی طور پر غیر مسلم ہوجانے

کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ اسلام حق تو ضرور ہوگا اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا اور جو لوگ اس عقیدت سے بھی خالی ہو چکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔"

(خطبہ تقسیم اسناد ۱۹۴۱ء)

تعلیم میں جدید و قدیم کا جوڑ

"جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے اگر ہم اس کو بجنسہٖ لے کر اپنی نوخیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے کھو دیں گے۔ آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف ہے۔ آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں جو اپنی روح اور اپنے مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیتہً اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد کس بناء پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی۔ ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی۔ ان کی زندگی اسلامی

زندگی ہوگی۔ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے اس قسم کے عمل تعلیم سے کوئی خوشگوار پھل حاصل نہ ہوگا اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لئے لگا دیئے جائیں مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنے گا۔"

(تنقیحات ۱۳۱۔ اگست ۱۹۳۶ء)

میدانِ علم کا امام

—— "جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے اور کائناتِ فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کر کے ان سے کام لیتا ہے اس کی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے زمین پر اس کا تسلط ہو جاتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہوتی ہے حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں اس لئے انسانی حیاتِ اجتماعی کا سارا کاروبار اس ڈھنگ اور نقشہ پر چلنے لگتا ہے جس پر وہ گروہ اپنی ذہنیت اور اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ گروہ جس کو یہ تسلط دنیا اور اس کے معاملات پر حاصل ہے۔ خدا سے پھرا ہوا ہو تو اس کے حیطۂ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو جس گاڑی میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اگر اس کا ڈرائیور لے سے کلکتہ کی طرف لے جا رہا ہو تو آپ کراچی کی طرف جا ہی کب سکتے ہیں چار و ناچار آپ کو اسی طرف جانا پڑے گا

جدھر ڈرائیور جانا چاہتا ہے۔ آپ بہت بگڑیں گے تو اتنا کرلیں گے کہ اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے اپنا رُخ کلکتہ سے کراچی کی طرف پھیرلیں اور برضا و رغبت نہ سہی کشاں کشاں اس منزل پر جا پہنچیں۔ جو آپ کی منزل مقصود کے عین مخالف سمت میں واقع ہے۔"

(نیا نظام تعلیم ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۳، ۱۴)

(۱۴)

تعارفِ تصانیف

مولانا مودودی کی درجنوں تصانیف ہیں لیکن اس کے باوجود مولانا ان بے شمار مصنّفوں میں سے محض ایک مصنّف نہیں ہیں جو ہر زبان میں اس کے علم وادب کے ذخیرے میں اضافہ کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں جو تصنیف وتالیف کو پیشے کے طور پر اختیار کرتے اور پھر اسے دیگر پیشوں کی طرح پابندی سے کرتے رہتے ہیں ان کے پیش نظر اوّل تو کوئی خاص مقصدِ تصنیف وتالیف، علم وادب کی خدمت اور حصول معاش کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو اس کی خدمت بھی لوح وقلم سے آگے بڑھ کر انجام دنیا ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔

مولانا ان مصنّفین سے مختلف نوعیّت کے مصنّف ہیں۔ انہوں نے شائد ہی کوئی کتاب محض علم وادب کی خدمت کے پیش نظر لکھی ہو اور شائد ہی کوئی کتاب محض حصولِ معاش کی خاطر ترتیب دی ہو وہ ایک مقصدِ زندگی رکھتے ہیں۔ اس مقصدِ زندگی کے لئے عملی جدّوجہد میں عمر کا بہترین حصّہ صرف کر چکے ہیں اور اس مقصدِ زندگی کو برپا کرنے کے لئے باقاعدہ ایک تحریک زندگی کے میدانِ عمل میں برپا کر رکھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے سامنے پے درپے مسائل اٹھتے ہیں۔ سوالات کھڑے ہوتے اور کئے جاتے ہیں۔ لوگ ان سے ان کی بات اور مقصد سمجھنا چاہتے ہیں لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں اور زندگی کا ہر ہر شعبہ مختلف نئے نئے مسائل، سوالات اور اعتراضات کی زد

میں آتا رہتا ہے۔ مولانا ایک مشن کے داعی کی حیثیت سے ان مسائل کا حل۔ ان سوالات کے جوابات ان اعتراضات کی صفائی اور مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے رہتے ہیں پھر اس کے علاوہ خود انہیں اپنے مشن کی وضاحت کے لئے اس کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کے لئے اسلامی نظام کو قابل عمل نظامِ زندگی ثابت کرنے کے لئے۔ اس کے گوشے گوشے کو جدید ذہنوں کے مطابق بیان کرنا پڑتا ہے اور بار بار لہجہ انداز، دلائل اور طرزِ بیان بدل بدل کر بیان کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایک پھول کے مضمون کو سو سو رنگ میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ دعوت بھی اوجھل نہ ہو اور نئے مسائل بھی اپنے جدید تقاضوں کے ساتھ حل ہوتے رہیں۔ بس یہی سب کچھ مل جل کر مولانا کی تصانیف کا ڈھانچہ تیار کرتے رہتے ہیں مولانا کی موجودہ تصانیف کا بیشتر حصہ اسی پس منظر کے ساتھ تیار ہوا ہے۔

عام لوگ قرآن پڑھتے ہیں جگہ جگہ قرآن کے بیان اور ادب کے دعوے خود قرآن میں پڑھتے ہیں لیکن قرآن کی عربی سطروں کے نیچے جو اردو ترجمہ انہیں ملتا ہے وہ دل پر اثر انداز ہونا تو الگ رہا آسانی سے ذہن کے اندر بھی نہیں اترتا اس پر لوگ حیران ہوتے ہیں اور قرآن کے دعوائے بلاغت پر متحیر ہو کر چپ ہو رہتے ہیں لیکن دلوں میں بے اطمینانی رستی رہتی ہے جو آگے جا کر غلط نظریات کی قبولیت کے لئے کھاد کا کام کرتی ہے۔ مولانا اس کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کی ادبی شان قاری پر اردوئے مبین کی صورت میں ظاہر ہو اور جدید ذہن قرآن کے قریب جا سکے اور اس کے اندر اٹھنے والے نئے نئے سوالات کو جدید ضروریات کے مطابق حل کیا جا سکے بس یہی ضرورت تفہیم القرآن کی معرکۃ الآرا تفسیر لکھنے پر تیار کر دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ

ضرورت تفسیر لکھنے کی محض "سعادت" حاصل کرنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر فرض کفایہ کی نوعیت رکھتی ہے۔ لوگ سود کے بارے میں سوالات اٹھاتے ہیں۔ دارالحرب میں اس کا جواز۔ دارالکفر میں اس کی ضرورت۔ سود کی اقسام۔ جدید دور کے اقتصادی نظریات کے درمیان اس کی اہمیت جدید تجارتی لین دین۔ بین الاقوامی تجارت اور بنکنگ میں اس کی ناگزیر ضرورت اور ایک اسلامی نظام کی طرف سے سود کی ممانعت کی علت۔ غرض بے شمار سوالات ہیں جو کفار تو کیا خود مسلمانوں کو بھی سود کے بارے میں الجھاتے اور پریشان کرتے ہیں جن کے پاس دولت کے انبار ہیں وہ بھی اسے بطور اضطرار اختیار کرنا ناگزیر سمجھتے ہیں ربوٰا اور سود کا فرق جاننے اور ایک مسلم ریاست میں سود کے لئے جواز نکالنے کی ضرورت پر سمپوزیم منعقد ہو جاتے ہیں اور وقت کا یہی تقاضا "اسلام اور جدید معاشی نظریات" اور "سود" جیسی دو نہایت بلند پایہ علمی اور تحقیقی تصانیف تیار کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ بس مولانا کی بیشتر تصانیف کا پس منظر یہی ہے۔ ان میں سے ہر ہر تصنیف کو زمانے نے خود آواز دے کر اسلام کی وضاحت کے لئے بلایا ہے تو مولانا نے اس آواز کے جواب میں قلم اٹھایا ہے ان تصانیف میں سے ہر ہر کتاب اسلامی نظام حیات کی عظیم الشان عمارت کی ایک ایک اینٹ اور اس کا قلمی اور کاغذی خاکہ Blue Print ہے جس کے اندر سے اسلامی نظام کی پوری عمارت چشم تصور پر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اب میں ان بیشمار تصانیف میں سے چند اہم تصانیف کا مختصر اور ہلکا پھلکا تعارف کراتا ہوں تاکہ ان کا موضوع اور ان کی اہمیت آپ کے سامنے آسکے تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کا مطالعہ ایک جدید ذہن کو اسلام فہمی کے لئے کتنا ضروری اور

وقت کا اہم ترین تقاضا ہے اور ان کا مطالعہ کئے بغیر نہ ان تقاضوں کو اسلام کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے اور نہ انہیں پورا کیا جا سکتا ہے۔

تفہیم القرآن

یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے جو جدید ذہن کو اس ربانی کتاب کی روح تک لے جانے کے لئے لکھی گئی ہے اس میں مولانا نے دو پہلوؤں کا خصوصی اہتمام کیا ہے ایک تو قرآن کے ادبی اعجاز کو حتی الامکان ہو بہو عربی مبین سے اردوئے مبین میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ قاری یہ محسوس کر سکے کہ کیا وجہ تھی کہ عتبہ جیسے کافر کا بھی اس کی چند آیات سن کر چہرہ متغیر ہو جاتا تھا اور وہ بے تاب ہو کر پڑھنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا تھا تاکہ یہ اعجاز اس کے دل و دماغ کو مسخر ہی نہ کر لے کیا وجہ تھی کہ چند آیات سن کر ہی نجاشی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی اور وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی حیثیت قرآن کی بنائی ہوئی حیثیت سے تنکے کے برابر بھی کم و بیش نہیں ہے کیا وجہ تھی کہ تیغ بکف عمرؓ چند آیات سن کر ہی موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے بھی اس کے ورق دو میں بھی اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ وہ وجہ قرآن کا ادب اس کے بیان کی شوکت۔ اس کے الفاظ میں الوہیت کی ایک حیرت انگیز شان اور اس کے اندازِ خطاب میں دلوں کو مسخر کر لینے والی ایک بالاتر لذت تھی۔ یہ اس کی اعلیٰ درجے کی غیر انسانی الٰہی ادبی شان تھی۔ مولانا نے اپنے قلم کی ساری قوت اس پر صرف کی ہے کہ قرآن کے الفاظ و معانی کی حد کے اندر رہتے ہوئے اس کیفیت اور ادب کو اردو کی طرف بھی منتقل کیا جائے لیکن چونکہ عربی اور اردو کے اندازِ بیان اور تراکیب میں فرق ہے اس لئے مولانا نے لفظی ترجمے کی

بجائے ترجمانی کا انداز اختیار کیا ہے۔ یعنی ایک آیت جو مفہوم اور تاثر عربی میں ڈالتی ہے۔ مولینا نے کوشش کی ہے کہ اردو میں اس مفہوم اور اثر کو اپنے الفاظ میں قریب ترین لفظی پابندی کے ساتھ ادا کیا جائے یہ ایک مشکل ترین علمی کام ہے جو انہوں نے اپنے ذمے لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کا حق ادا کیا ہے۔ سورۂ انفال یا سورۂ توبہ کی ترجمانی جب رواں رواں اردو میں پڑھی جاتی ہے تو حقیقتاً دل و دماغ کو مسخر کرتی چلی جاتی ہے اور بر قرآن کے ادبی اعجاز کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جسے مولانا نے اپنی ترجمانی میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔

تفہیم القرآن کی دوسری خوبی اس کے تفسیری حاشیے ہیں جو قرآن فہمی میں جدید ذہن کی مشکلات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لغت، کلام اور منطق کی بحثوں سے بچ کر دورِ حاضر کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے اور جو جو ممکن مشکلات قاری کو مطالعہ قرآن میں پیش آسکتی ہیں ان سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی تیسری خوبی ہر سورت پر ایک تعارفی دیباچہ ہے جو اس کے مرکزی مضمون۔ اس کے عام مباحث اس کے تاریخی پس منظر، شانِ نزول اور زمانہ نزول پر بحث کرتا ہے۔ اس طرح پوری سورت کا مضمون اپنے مطالب کے ساتھ قاری کے سامنے سمٹ کر آجاتا ہے اور فہم قرآن کے لئے یہ ایک نہایت مفید ترکیب ہے۔

چونکہ مولینا اپنی زندگی میں وہی کام سرانجام دے رہے ہیں جو قرآن چاہتا ہے کہ ملتِ مسلمہ انجام دے۔ وہی نظام زندگی لانے کی سعی میں مصروف ہیں جو قرآن نے اپنے لانیوالے کے ذریعے پیش کیا ہے اس لئے قرآن کی روح پوری طرح تفہیم القرآن کے ذریعے سمٹ کر سامنے آجاتی ہے۔ قرآن متفرق شذرات کا ایک ضخیم مجموعہ نہیں بلکہ

ایک منظم، مرتب اور منضبط دعوت کا آرگن معلوم ہوتا ہے اور تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ وہی کچھ سمجھ رہا ہے جو کچھ کہ قرآن سمجھانا چاہتا ہے یہ قلبی اور ذہنی اطمینان ایک بہت بڑی دولت ہے جو تفہیم القرآن کے مطالعے سے اس کے قاری کو میسر آتی ہے۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

اس کتاب میں مولانا نے قرآن کی چار اہم ترین اصطلاحات پر بحث کی ہے الٰہ، رب، عبادت اور دین حقیقت میں یہ اصطلاحات قرآن فہمی کی کلیدیں ہیں قرآن کا قاری جب تک ان اصطلاحات کے صحیح صحیح مفہوم سے آگاہ نہ ہو وہ قران کا فہم حاصل نہیں کرسکتا۔ قرآن کا مطالعہ کرنیوالے کے ذہن میں الٰہ کا مفہوم اگر صرف اس قدر ہو کہ جسے مافوق الفطرت سمجھ کر پوجا جائے، دین کا مفہوم محض ایک ایسا مذہب ہو جو انسان کا پرائیویٹ مسئلہ ہو عبادت کا مطلب محض پوجا پاٹ ہو اور رب کا مطلب محض مالک ہو تو پھر انسان قرآن کی روح تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ یہی تو وہ سب سے بڑی چار اصطلاحات ہیں جو قرآن فہمی کے چار بڑے دروازے ہیں اور جنہیں قرآن اپنے خاص اصطلاحی معنوں میں جگہ جگہ استعمال کرتا ہے جب تک ان اصطلاحات کے جابجا استعمال کے محل موقعہ اور مفہوم سے قاری اچھی طرح آگاہ اور رمز شناس نہ ہو اسے ....قرآن کی سطح کے نیچے اتر کر اس کا حقیقی مفہوم پالینے کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مولانا نے مطالعہ قرآن کرنے اور اسلامی نظام فکر کا فہم حاصل کرنے والوں کے لیے ان قرآنی اصطلاحات کا وسیع مفہوم واضح کر کے ایک بہت بڑی قرآنی خدمت انجام دی ہے اور جب تک آدمی ان اصطلاحات کے صحیح صحیح فہم سے آگاہ

نہ ہو وہ قرآن کے ساتھ ساتھ اس کا مطلب سمجھتا ہوا چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔ یہ کتاب اپنی علمی افادیت کے لئے بڑے پائے کی کتاب ہے اور اس قابل ہے نہ اسلامیات کے ایم۔ اے کے کورس میں لگائی جائے تاکہ اسلامیات کے طلباء قرآن فہمی کے ان بنیادی نکات سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

آج کل ہمارے ہاں کلچر اور ثقافت کے بارے میں بڑا ذہنی انتشار پایا جاتا ہے اور سوسائٹی کے رہنما طبقے میں اسلامی کلچر کے بارے میں بہت کچھ غلط فہمیاں ہیں اسلام سے بے خبری کے باعث ان کے نزدیک وہ سب کچھ جو مسلمان کریں اسلامی ہوتا ہے، اور جو کچھ انہیں پسند ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتا اس لئے اسلام کو بھی اس کی تائید کرنی چاہیئے بلکہ حتے الامکان اسلام کو اس کے کار ثواب ہونے کے بارے میں فتوے دینا چاہیئے اگر اسلام کو جدید تقاضوں کا شعور اور اپنی زندگی کی ضرورت باقی ہے۔ یہ طرز فکر مغربی تہذیب سے ذہنی مرعوبیت اور شکست، اور اسلام سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

کیا اسلام بھی کچھ تہذیبی اقدار دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے؟ کیا اس نے بھی کلچر اور ثقافت کے بارے میں کوئی رہنمائی مسلمانوں کو دی ہے؟ خود کلچر اور ثقافت کیا شے ہیں اسلامی تہذیب کن بنیادوں پر قائم اور اس کے اصول کیا ہیں۔ کیا توحید رسالت اور آخرت کے تصورات بھی اپنے اندر کچھ تہذیبی اور کلچرل رہنمائی کا مواد رکھتے ہیں۔ یہ وہ سب موضوعات ہیں جن پر... مولانا مودودی نے اس کتاب میں بحث کی ہے۔ کسی غلط دکو مسلمانوں کی تہذیب صرف ایک ٹونٹی اور لوٹا اور ایک

اور تھا یا پاجامہ نظر آتا ہے اور کسی ذہین آدمی کو رقص و سرود میں بھی اسلامی تہذیب کے مظاہر نظر آجاتے ہیں اور بڑے بڑے مسلمان اساتذۂ فن کی موجودگی ان فنون کے اسلامی ہونے پہ گویا خود گواہ ہے۔ ان ساری ہی غلط فہمیوں کا مولانا نے نہایت علمی طریق سے ازالہ کیا ہے اور ایک سلیم الفطرت انسان کو اسلامی تہذیب کے تمام گوشے ایک ایک کر کے سمجھا دیئے ہیں۔ یہ کتاب بھی بہت بلند علمی پایہ رکھتی اور اسلامیات کی منتہی درسیات میں شامل کیے جانے کے قابل ہے۔ مولانا نے اس دور تہذیب و تمدن اور روشن خیالی میں یہ کتاب لکھ کر اسلام پسند طبقے کی ایک بہت بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔

الجہاد فی الاسلام

جہاد اسلام میں ایک نہایت اہم جزو دین ہے لیکن مخالفین اسلام نے اسی کو تختۂ مشق بنا کر اسلام کو زیادہ سے زیادہ بھیانک بنانے کی کوشش کی ہے ۔۔۔ دورِ زوال کے مسلمانوں نے بھی غیر مسلموں کے اعتراضات کے مقابلے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر کے اس عظیم الشان جزو دین کو عذرِ گناہ بنا کر رکھ دیا ہے خصوصاً یورپ کے مقابلے میں تو معذرت کرتے کرتے مسلمانوں کے جدید رہنما تھک تھک گئے اور خود وہ لوگ جن کی تلواروں سے بے گناہوں کے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور جن کے وحشیانہ بموں نے انسانوں کو چیونٹیوں کی طرح جھلس کر رکھ دیا تھا مسلمانوں کے جہاد کے سامنے امن کے دیوتا بنے پھرتے تھے۔ مولانا مودودی نے اس مرعوبانہ اور معذرت خواہانہ ذہن کے مقابلے میں پہلی بار جہاد کی ضرورت اور اہمیت اور اسلام کی امن پسندانہ جنگ اور وفادارانہ صلح کی اصلی تصویر پیش کی ہے

پھر اس کے مقابلے میں دوسرے مذاہب میں جنگ کی حیثیت کیا ہے اور دور جدید میں تہذیب حاضر کس طرح جنگیں برپا کر رہی اور انسانیت کو بلا امتیاز مرد و زن اور مقاتل و غیر مقاتل تباہ کر رہی تھی ہے اس کا مکمل نقشہ کھینچا ہے علامہ اقبال نے اس کتاب کے بارے میں درست فرمایا تھا کہ اردو میں اس موضوع پر اتنی جامع اور علمی کتاب میری نظر سے نہیں گزری یورپ کے مقابلے میں ہر مسئلہ زندگی میں جس طرح دب کر اور معذرت کرتے ہوئے مرعوبانہ ذہن کے ساتھ اپنی تہذیب کے ہر جزو کی بے جا تاویل کرنے کی عادت بہت سے ہمارے مصنفین میں چلی آرہی ہے مولینا نے اس کتاب میں اس روش عام سے ہٹ کر استدلال کا بالکل ایک دوسرا ہی انداز اختیار کیا ہے جو ٹھوس حقائق۔ وزنی استدلال معقول مباحث اور تقابلی مطالعہ پر مبنی ہے اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اسلام میں جنگ کا تصور ہی دراصل امن عالم کا ضامن اور ظالموں سے مظلوموں کے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ میری نظر میں یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اعلیٰ فوجی تعلیم کی درسگاہوں اور افسروں کی تربیت گاہوں کے نصاب میں شامل کی جانی چاہیئے تاکہ مسلمان فوجی جان سکیں کہ اسلام کے اندر جنگ کا کیا مفہوم ہے اور وہ کن اعلیٰ تر مقاصد کے لئے لڑی جاتی ہے اور اس کے اخروی انعامات اور دنیوی برکات کیا کچھ ہیں۔

تجدید و احیائے دین

اسلام ایک زندہ نظریہ حیات ہے جو خالق کائنات نے اپنے بندوں پر اس لئے نازل کیا ہے کہ انسان اس کے مطابق زندگی گزار کر فلاح حاصل کر سکیں حضور نے اس نظام کو مکمل کر کے اپنی تمام تفصیلات اور جزیات کے ساتھ

اسلامی معاشرے میں نافذ کر دیا۔ خلافت راشدہ نے اسے ایک طویل عرصے تک نکتہ بہ نکتہ طریق نبوی کے مطابق چلایا اور جب تاریخ کے ایک غلط الٹ پھیر سے ملوکیت کا اچانک اسلامی نظام پر قبضہ ہو گیا تو اس نے اسلامی نظام کے اندر اپنی خواہشات کے مطابق آہستہ آہستہ اپنے لئے راستے بنانے اور گنجائشیں پیدا کرنی شروع کر دیں۔ یہ راستے اور گنجائشیں ہی بالآخر اسلامی نظام کے رُوئے تاباں کو گرد آلود کرنے کا باعث بنیں اور بتدریج یہ تک پہچاننا مشکل ہو گیا کہ اصل اسلام کیا ہے اور اس کی تفصیلات کیا تھیں۔ جب بھی ملّت مسلمہ کے ضمیر میں اس ضرورت کا احساس ابھرا کہ اسلام کے چہرے پر حوادث کی جمی ہوئی تہ بہ تہ گرد صاف ہو تو تاریخ اسلام کے اندر سے کوئی نہ کوئی شخصیت ضرور ابھر آئی جس نے اس کے رُخ تاباں کو صاف کیا۔ اس کے چہرۂ منوّر کو تابندہ تر کیا اس کے اوپر جمی ہوئی گرد حوادث و بدعات کو جھاڑا اور اسلام کا چہرۂ روشن زمانے کے سامنے کر دیا۔ اس کشمکش میں چاہے اسے کتنی ہی کھکھیڑ اٹھانی اور مصائب برداشت کرنے پڑے ہوں اور بدعت کے متبعین نے چاہے راستے میں کتنے ہی کانٹے بچھائے ہوں لیکن سنت کے وہ علمبردار ہمیشہ سر بکف اور کفن بردوش رہے اور اپنے کام میں کسی سختی ابتلا یا آزمائش کے باعث کبھی کوئی لچک نہ پیدا ہونے دی یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جو امت کے ۱۴۰۰ سالہ پُرآشوب دور زوال میں تجدید دین کا کام کرتی رہی ہیں اور یہی بزرگ مرنے کے بعد مجدد دین اسلام کہلاتے رہے ہیں۔

مولانا مودودی نے اپنی اس معرکۃ الآراء کتاب میں انہیں بزرگوں کے کارناموں پر ایک مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا ہے اور روشنی ڈالی ہے کہ انہوں نے

یہ کارِ تجدید کن کن مراحل میں سے گزر کر انجام دیا اور ان کا یہ کام کس نوعیت اور پیمانے کا تھا یہ ایک نہایت نازک اور کٹھن کام ہے جو مولانا نے اس کتاب کی تالیف کے ذریعے انجام دیا ہے اس کتاب کو پڑھ کر آدمی میں یہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ آئندہ بھی جسے یہ کام انجام دینا ہو اسے اپنے کام میں کن کن حدود کا لحاظ رکھنا چاہیئے اور امت میں گہری پیوست شدہ کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے کیا حکمت کار اختیار کرنی چاہیئے۔

تنقیحات

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور مسلمانوں کی سیاسی مغلوبیت نے مسلمانوں سے صرف تخت و تاج ہی نہیں چھینا بلکہ تہذیب جدید نے ان کے ذہنی اعتماد و قلبی اطمینان اور ایمان و اعتقاد کو بھی تہ و بالا کر دیا اور مسلمانوں کی جس جس چیز پر مغربی تہذیب نے ناک بھوں چڑھائی مسلمانوں نے اسی چیز کے لئے معذرت کی اور اسے اپنے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی چاہے وہ ان کا لباس تھا۔ ان کی نشست و برخاست تھی۔ ان کی زبان تھی یا ان کے نہایت قیمتی اعتقادات تھے۔ ہر چیز سے وہ بری الذمہ ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ مسلمانوں میں اچھا خاصا گروہ ایسا تیار ہو گیا جس کے لئے یورپ سے آئی ہوئی ہر بات وحی بن گئی اور وحی سے آئی ہوئی ہر بات مشکوک ہو گئی۔ حد یہ کہ وہ بجلی کے بلب جلتے دیکھ کر اور آسمان پر غبارے اڑتے .... اور بے تار برقی پر پیغامات سن سن کر معجزات تک سے معذرت کرنے اور ان کی تاویلیں کرنے لگے۔ جب یہ ذہن کسی قوم میں پرورش پانے لگ جائے تو پھر وہ قوم اپنے ہاتھوں سے کدالیں تھام کر خود اپنے لئے قبریں کھودنے لگ جاتی ہے

اور اسے کوئی شخص کسی معجزے سے بھی زندہ نہیں رکھ سکتا۔ مولانا مودودی نے مسلمانوں کے اندر پیدا ہوتے ہوئے اس ذہن پر شدید ضرب لگائی ہے اور اپنی بے پناہ قوت استدلال اور زور بیان سے انہیں اس خطرناک راستے پر جانے سے روکا ہے۔ یہ کتاب مولانا مودودی کے علم کلام کا ایک بیش بہا نمونہ ہے اور تہذیب مغرب کے خطرناک زہر کا انتہائی موثر اور قیمتی تریاق ہے اس کا ہر مضمون فرنگی شیشہ گروں کی اس چمکیلی تہذیب پر ہتھوڑے کا کام کرتا ہے۔ جس نے بھی یہ کتاب پڑھی ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ اس کا ایک ایک مضمون ذہنی مرعوبیت اور غلامی کے خلاف کتنا موثر ہتھیار ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ کالجوں اور اونچی سوسائٹی کے مسلمانوں میں پھیلایا جائے تاکہ ان کے ذہنوں پر سے مغرب کی مرعوبیت کا پردہ اٹھے۔ ان کی اصلاح سے قوم کے دوسرے افراد بھی اچھے نمونے پکڑیں گے۔

رسائل و مسائل

نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک نہایت دلچسپ معلوماتی اور اپ ٹو ڈیٹ کتاب ہے جو تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ مولینا مودودی ایک نظریہ حیات کے حامل ہیں بلکہ اسے لے کر اٹھے ہیں اور اس کے نفاذ کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ کچھ وہ موضوعات ہیں جن پر وہ اپنے مشن کی وضاحت کے لئے خود لکھتے اور تقریریں کرتے ہیں اور کچھ وہ موضوعات ہیں جو ان کے مشن کو سمجھنے کیلئے سوالات و اعتراضات کی شکل میں اندرون و بیرون ملک سے مسلسل خطوط آتے رہتے ہیں اور مولینا ان خطوط کا جواب لکھتے اور لکھاتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں انہیں متفرق موضوعات پر سوالات کے جوابات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسلام کی روشنی میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کا شعور اور فہم پیدا کرنے کیلئے یہ نہایت ہی مفید کتاب ہے۔ قدیم سے قدیم

اور جدید سے جدید ذہن کا آدمی اپنے لئے اس کتاب کے اندر دلچسپی اور فہم و شعور کا بے اندازہ مواد پا سکتا ہے۔ رنگ برنگ کے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً قرآن و حدیث۔ فقہ۔ سیاسیات۔ معاشیات۔ معاشرتی مسائل علمی اور تعلیمی امور غرض ہر نوعیت کا مسئلہ اور اس کا جواب موجود ہے۔ مولینا مودودی کی حاضر دماغی حاضر جوابی اور جامع نگاری کا بہترین نمونہ اس کتاب میں موجود ہے۔

دینیات

یہ کتاب اسلام کی ابتدائی معلومات کے لئے نہایت مفید ہے اور مولانا مودودی کے نظریۂ اسلام کا تعارف جب اس کتاب کے چند صفحات پڑھنے سے ہی ہوتا ہے تو قاری اچانک چونک پڑتا ہے سویا ہوا ضمیر بیدار ہونے لگتا ہے۔ مذہب کا رسمی اور روایاتی تصور ٹوٹنے لگتا ہے اور انسان کے اندر اس کا فعال انسان جو اپنے دین کو چھوڑ کر ہر چیز کے لئے فعّال ہوتا ہے۔ دین کے بارے میں بھی عملی نکتۂ نظر سے غور کرنے لگتا ہے پھر جوں جوں اس کتاب کا مطالعہ جاری رہتا ہے، ایک ذہنی تغیر کی رو آدمی کے اندر داخل ہوتی چلی جاتی ہے اور کتاب کا مطالعہ ختم ہونے پر انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ بدل گیا ہے۔ کوئی داخلی تغیراتی عمل اس پر وارد ہو گیا ہے اور اس نے کچھ پالیا ہے۔ اس نے اسلام کا صحیح تصور جان لیا ہے۔ جسے وہ رسم سمجھ رہا تھا وہ اس کا دین ہے۔ جو زندگی بھر اپنے مالک کی اطاعت کا دوسرا نام ہے اور اطاعت سے مراد زندگی کے ہر گوشے میں اطاعت ہے اور اسی کا دوسرا نام عبادت ہے جب یہ حیرت انگیز انکشافات ایک روائتی دینداری والے ذہن پر منکشف ہوتے ہیں تو اس کی مسرت بے ٹھکانہ اور اس کی حیرت بلا نہایت ہوتی ہے۔ اسے پہلی

بار احساس ہوتا ہے کہ دل ودماغ کے درمیان کوئی پردہ سا تھا جو اٹھ گیا ہے اور اب وہ دل دماغ کی داخلی کیفیات کو بھی محسوس کرتا ۔۔۔ اور ان پر نگاہ رکھتا ہے اسلام کے مفہوم کا یہ انکشاف انسان پر کئی دن تک ایک عجیب سی سرخوشی کا عالم طاری رکھتا ہے

اس کتاب میں مولانا نے نہایت سہل انداز میں اسلام اور اس کے تمام مقتضیات ضروریات اور تفصیلات پر بحث کی ہے۔ ابتداءً اسے ثانوی درجے کی تعلیم گاہوں کے لئے لکھا گیا تھا۔

خطبات

مولانا مودودی کے ۲۹ آسان لیکچرز کا یہ مجموعہ اسلام کی بنیادی عبادات کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے نہایت مفید ہے۔ یہ صرف معلومات ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ ان عبادات کی اصل روح کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے مولانا کی یہ کتاب اب تک ۱۵ ایڈیشن نکل چکی ہے اور مسلمانوں میں اس کی مانگ حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم شائع کرنے والی ایک مشہور فرم کا مالک تو ان خطبات پر اتنا فریفتہ ہوا کہ اس کے بلاک بنوا کر چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں کی شکل میں ہزاروں کی تعداد میں کئی کئی ایڈیشن چھاپ چکا ہے۔ ان پمفلٹوں میں حقیقتِ صوم وصلوٰۃ اور حقیقت جہاد تو ایسے پمفلٹ ہیں کہ جب پہلے پہل ان کا بنگالی میں ترجمہ ہوا تو بنگالی مسلمانوں میں یہ دونوں بے حد مقبول ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں چھپے ۔۔۔ اور اب تک نکل رہے ہیں کم پڑھے لکھے عوام میں دین اسلام کا شعور پیدا کرنے کے لئے اس سے مفید تر اور کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ آدمی کتاب شروع کرتا ہے تو اس کی کیفیت اور ہوتی ہے اور ختم کرتا ہے تو اس کی کیفیت اور ہوتی ہے۔ مولانا

مودودی کے مشن اور دعوت کو عوام میں متعارف اور مقبول کرنے میں اس کتاب کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور کچھ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ مولانا نے یہ تقریریں آج سے ۲۲، ۲۳ سال پہلے پنجاب کے دیہاتی مسلمان میں اسلام کا فہم پیدا کرنے کے لئے دیہات میں جمعہ کے خطبات کی شکل میں کی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے اور جس قسم کے لوگوں کے لیے یہ تقریریں کی گئی تھیں وہی کام آج تک یہ کتاب انجام دے رہی ہے یہ کتاب دیہاتی مبلغین اور مساجد میں خطبات جمعہ کے لئے نہایت مفید ہے۔

تفہیمات

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ان تعلیمات سے متعلق اشکالات اور مباحث پر مبنی ہے۔ مختلف فلسفیانہ بحثیں جو آدمی کی ایمانیات پر اثر انداز ہونے والی اور اس کے روزمرّہ کے مسائل میں اس کی رہنمائی کرنے والی ہیں اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو دین کے مختلف شعبوں کی تشریح۔ توضیح۔ وضاحت اور حمایت میں لکھے گئے ہیں ان میں سے ہر ہر مضمون بڑا خیال انگیز اور ایمان افروز ہے اور قاری کی دینی معلومات میں اتنا بیش بہا اضافہ کرتا ہے کہ پھر وہ ہر مجلس میں دینی موضوعات پر گفتگو کرنے اور مفید مشورے اور رہنمائی دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایک مبلغ دین کے لئے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر جس قسم کی بنیادی معلومات کی ضرورت ہے تاکہ وہ مختلف لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر سکے اس کا کافی مواد اس کتاب میں موجود ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کا ایک مؤید کارکن اس کتاب کے

مطالعے کے بغیر اپنے نکتۂ نظر کو زیادہ کامیابی سے ہر جگہ مؤثر طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر

یہ مختصر کتاب اسلامی عبادات یعنی نماز اور روزہ کے بارے میں نہایت تفصیل اور شرح و بسط سے بحث کرتی ہے۔ ان عبادات کے شرعی، اخلاقی، معاشرتی اور جسمانی فوائد۔ ان عبادات کی تہ میں کام کرنے والی حکمت اور مسلم معاشرے پر ان کے اثرات۔ ان عبادات کی روح اور ان کا ظاہری ڈھانچہ۔ ان کی فرضیت کا بنیادی فلسفہ اور ان کے نفوذ سے مسلم معاشرے میں پیدا ہونے والی اجتماعی برکات۔ مولانا نے اس کتاب میں لفظ عبادت کا وہ وسیع مفہوم بیان کیا ہے جو اسلام اس سے مراد لیتا ہے اور جو محض "پوجا پاٹ" کے محدود مفہوم سے بہت وسیع معانی اپنے اندر رکھتا ہے بلکہ تعمیر کردار انسانی اور اطاعت و نظم و ضبط کا ایک بہترین مظاہرہ ہے، یہ کتاب معمولی فہم کے قاری سے کچھ زیادہ بلند معیار ہے اور سمجھنے کے لئے زیادہ فہم و شعور چاہتی ہے۔

اس کتاب کے ذریعے مولانا نے بتایا ہے کہ اسلامی عبادات محض چند رسوم نہیں ہیں جن کی ادائیگی سے رب کعبہ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ عبادات ایک وسیع تر مقصد زندگی کی تربیت کے لئے فرض کی گئی ہیں اور وہ وسیع تر مقصد زندگی مکمل اسلامی نظام حیات کا نفاذ ہے۔ اس کے لئے پوری پوری جدوجہد کرنا اور اس جدوجہد کی راہ میں ساری مشکلات سہہ جانا یہی تربیت ہے جو یہ اسلامی عبادات ایک مسلم کو دیتی ہیں۔

اسلام کا نظام حیات | یہ مولانا کی پانچ ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ یہ

پاکستان بننے کے فوراً بعد اس دور میں کی گئیں جب اربابِ اقتدار کو یہ اندازہ نہ تھا کہ مولانا مودودی ان کی خواہشاتِ اقتدار کے مقابلے میں اسلام کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کے لئے جان تک کی بازی لگا سکتے ہیں۔ پھر ویسے بھی یہ وہ زمانہ تھا جب اربابِ اقتدار میں سے بعض حضرات اسلام کے لئے لگائے ہوئے نعروں کا کچھ لحاظ رکھتے تھے جب تحریکِ پاکستان کے پرانے کارکن اوپر کی سطح سے چھٹ گئے اور ملک کا سارے کا سارا اقتدار سرکاری ملازمین کی طرف منتقل ہو گیا تو پھر مولانا مودودی کو ریڈیو اسٹیشن کی طرف رُخ کرنے کی دعوت دینے کی کبھی غلطی نہیں کی گئی بلکہ ان کا نام مستقل طور پر بلیک لسٹ میں چلا گیا اور ریڈیو پاکستان صرف ان فنکار حضرات کے لئے وقف ہو گیا۔ جو قوم کو صرف نغمے اور گانے ہی سنانے والے تھے۔

اس کتابچہ میں مولانا نے اسلامی نظامِ حیات کے مختلف شعبوں پر مختصر لیکن نہایت جامع تقاریر درج کی ہیں اسلام کا سیاسی نظام، اخلاقی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام اور روحانی نظام ان پانچ موضوعات پر یہ تقاریر ہیں جو اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں اور ایک مختصر مطالعہ سے قاری اسلام کے بارے میں نہایت عمدہ واقفیت حاصل کر لیتا ہے اور یہ فہم بھی پیدا کر لیتا ہے کہ اسلام حقیقتاً محض ایک جامد مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔

پردہ

یہ کتاب اس نازک موضوع پر نہایت جامع بحث کرتی ہے جو موضوع اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان زبردست اختلافی مسئلہ ہے۔ مغربی تہذیب عورت کو گھر سے نکال کر بازاری زندگی میں جابجا گھسیٹتی پھرتی ہے اور عائلی ذمہ داریوں

کے علاوہ اس پر معاشی، معاشرتی، سیاسی اور بہت کچھ مردوں کے دل بہلاوے کی ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے اور عورت کو بازارِ حیات میں لا کر اس کی چمک دمک سے اپنی ترقی اور جدیدیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مولانا نے مغربی تہذیب کے اس موقف کو دلائل کے ساتھ غلط ثابت کیا ہے۔ دلائل خود مغربی تہذیب کے اپنے گھر سے اس کے زبردست مبلغین اور فلسفیوں کے پاس سے فراہم کیئے گئے ہیں۔ مغربی معاشرے میں عورت کی حیثیت مقام اور مظلومیت کے مختلف گوشوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور پھر اسلام کا متوازن معاشرتی نظام پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک پاکیزہ معاشرے کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ عورت کو اس کا اصل مقام دے اور اس پر وہ بوجھ نہ لادے جس بوجھ کو اٹھانے کے لیئے اسے پیدا ہی نہیں کیا گیا...... مرد اور عورت کی زندگیاں خود فطرت کی طرف سے تقسیم کار کے اصول پر تخلیق کی گئی ہیں اور ان کا مزاج۔ ان کی جسمانی ساخت۔ ان کی صحت۔ ان کی فطری ذمہ داریاں یہ سب تقاضا کرتی ہیں کہ معاشرے میں دونوں کا دائرۂ کار مختلف ہو اور دونوں کو زندگی کے جوئے میں اس طرح نہ جوتا جائے کہ مرد کا بوجھ بھی عورت اٹھائے اور اس کے علاوہ فطرت کی طرف سے دیا ہوا بوجھ بھی وہ اٹھائے۔ یہ دوہرا بوجھ اس پر بھاری ظلم ہے اور جو لوگ عورت کی آزادی کا نام لے لے کر اسے گھر سے باہر گھسیٹ کر ڈالتے ہیں وہ دراصل اپنے نفس کی لذت کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اور انہوں نے عورت کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اسے سخت فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس بھاری بوجھ کے نیچے مغرب کی عورت کس طرح کراہ رہی ہے مولانا نے مستند دستاویزات سے اس

کی تصویر پیش کی ہے اور آخر میں اسلام کا وہ نظام حامل پیش کیا ہے جو سراسر انصاف اور فطری مساوات پر مبنی ہے۔ مولانا کی یہ معرکتہ الآرا کتاب اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ کر کے مغرب کے سامنے غور و فکر کے لئے پیش کیا جائے۔

اسلام اور ضبطِ ولادت

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے آج خاندانی منصوبہ بندی کے اس دور میں بہت اہم ہے اور اس قابل ہے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی اس کا غور و فکر سے مطالعہ کرے اور عقلی دلائل کے ساتھ اس مسئلے کے متعلق اپنی ایک رائے قائم کرے یہ بات کہ جو کچھ بھی مغرب کی طرف سے آئے وہ لازماً عقل و خرد کا شاہکار ہوتا ہے۔ سائنٹیفک ہوتا ہے اور ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں اور اس سے ہٹ کر سوچنا قدامت پسندی ہے۔ یہ ایک ایسی احمقانہ بات ہے جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں سب سے بڑی عقل کی بات بن کر اٹکی ہوئی ہے۔

مغرب کی احمقانہ باتوں میں سے ضبط ولادت بھی ایک بڑی احمقانہ بات ہے اگرچہ ان کے منتشر اور بے حیا معاشرے میں یہ ایک اہم معاشرتی ضرورت بن چکی ہے لیکن جس معاشرے میں بدکاری اب تک بری سمجھی جاتی ہو۔ شرم و حیا کی قدریں اب تک زندہ ہوں اور جزو ایمان قرار دی جاتی ہوں۔ اس معاشرے میں اس کا تجربہ بہت بڑی دھاندلی ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی اس کتاب میں ضبط ولادت کی تحریک اس کے کھوکھلے دلائل اور اس کے مصنوعی طریقوں کا اچھی طرح پول کھولا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ نظریہ عملی طور پر سخت غیر عقلی غیر معتبر اور عملی میدان میں نہایت ناکام نظریہ ہے۔

مصنف نے سب سے پہلے تو اس تحریک کی تاریخ۔ اس کے اسباب، اس کے قائدین اور ان کے دلائل اور اس کی ابتدائی وجوہات پر بحث کی ہے۔ پھر اس کے نتائج جو مختلف مغربی ملکوں میں مترتب ہوئے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔ پھر اسلام کا نکتۂ نظر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام ایک فرد کے لئے اسے کیوں خطرناک اور ہلاکت آفرین سمجھتا ہے اور معاشرتی، نسلی، معاشی اور اخلاقی لحاظ سے ایک معاشرے کے کیلئے کیوں تباہ کن قرار دیتا ہے۔

آخر میں مصنف نے اس کے حق میں پیش کئے گئے تمام دلائل کا کھوکھلا پن ثابت کیا ہے اور عقلی دلائل سے اسے ایک فضول، لغو، غیر عقلی تحریک قرار دیا ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو اور مسلمانوں کے اوپر کے طبقے میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

اسلامی ریاست

مولانا مودودی کی یہ کتاب ہر مسلمان ملک کے ارباب اقتدار کے لئے لمحۂ فکریہ پیش کرتی ہے اور اسلامی نظام حیات کیا ہے۔ اس کے نفاذ کی کیا کچھ تدابیر ہو سکتی ہیں خود اسلامی ریاست کیا ہے۔ اسلامی دستور اور قانون کسے کہتے ہیں اس کے ماخوذ کیا ہیں، جدید دور میں اس کی تدوین کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور جدید دور میں ایک اسلامی ریاست کا ڈھانچہ کن بنیادوں پر کس طرح کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ کس طرح — ایک اسلامی ریاست بہترین رفاہی ریاست ہو سکتی ہے اور آج کی جدید ریاست کے تمام محاسن اپنے دامن میں رکھتی اور اس کی تمام برائیوں سے پاک ہے۔ اس کتاب میں ان سارے مسائل پر اتنی بات مدلل بحث ہے کہ اس کی موجودگی میں

کسی شخص کا یہ کہنا کہ اسلامی دستور کیا ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کیسے قائم ہو سکتی ہے۔ اپنی جہالت اور کم علمی کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی Islamic Law and Const-itutions کے نام سے ہو چکا ہے۔ یہ کتاب تمام مسلمان ملکوں کے ارباب اقتدار پر ایک اتمام حجت ہے اور اس کی موجودگی میں وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم چاہتے تو ہیں کہ اسلامی نظام ہو لیکن وہ کیا ہوتا ہے یہ معلوم نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بتانے والا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس کے ہاتھ میں روشنی ہو اسے وہ جیلوں میں بند کریں اور پھر شور مچائیں کہ روشنی کہاں ہے۔ ہم تو روشنی کے متلاشی ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اس دور اور حالات کی بہترین علمی اور تنقیدی تاریخ ہے جن میں سے مسلمان آج سے ۲۰، ۲۲ سال پہلے گزر رہے تھے اس کتاب میں مسلمانوں کے اس وقت کے سیاسی رجحانات۔ ان کا داخلی انتشار ان کے اندر کام کرنے والی سیاسی تنظیموں اور ان کے لیڈر گروہوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جن حالات میں مولانا مودودی نے کام شروع کیا۔ اس وقت مسلمانوں کے سیاسی حالات کس قسم کے کام کا تقاضا کر رہے تھے وہ حالات مسلمانوں کو کس طرف کھینچے لئے جا رہے تھے۔ کانگرس کی متحدہ قومیت کا نعرہ کس طرح آزاد ہندوستان کے آئندہ سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے لئے دھوکا فریب اور سراب کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس کتاب کا پہلا حصہ مسلمانوں کے اندر کام کرنے والی اس وقت کی عام چھوٹی بڑی تنظیموں کے جائزے پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں

مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی سب سے بڑی شکاری تنظیم کانگرس کا پورا پورا پوسٹ مارٹم کر کے بتایا گیا ہے کہ اس کے پاس مسلمانوں کے لئے کتنی بڑی ہلاکت ہے اور متحدہ قومیت کتنا بڑا فریب اور جھوٹ ہے۔ یہ کام مولانا نے اس وقت کیا جب کہ مسلمانوں کے تمام جدید و قدیم لیڈران کانگرس کے مؤید تھے۔ پھر تیسرے حصے میں مولانا نے مسلمانوں کے لئے اصل کام کا لائحہ عمل پیش کیا ہے جس میں انہوں نے اپنا نکتہ نظر پیش کیا ہے اور مسلمانوں کو کس قسم کی اجتماعی تنظیم میں شریک ہونا چاہئیے اس کا نقشہ بیان کیا ہے اس کتاب کے اندر اس اسلامی تنظیم کا عکس نظر آجاتا ہے جو مولانا کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کے اندر برپا کرنا چاہتے تھے۔ مولانا کی ایک دوسری کتاب "مسئلہ قومیت" بھی اسی دور کی چیز ہے اور اس کا موضوع اور مزاج بھی اس کتاب سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے جس کے ذریعے مولانا نے ثابت کیا ہے کہ مسلمان ایک علیحدہ ملت اور قوم ہے اس کا کسی دوسری قوم کے ساتھ ایسا گٹھ جوڑ ممکن نہیں ہے جو اس کے معتقدات کو خطرے میں مبتلا کر دے۔ یہ وہی کتابیں ہیں جنہیں پاکستان کی تحریک کے دوران مسلم لیگ کے ذہین کارکن اپنے علمی اور استدلالی اسلحہ کے طور پر زیر مطالعہ رکھتے تھے۔

یہ مولانا مودودی کی چند اہم کتابوں کا تعارف ہے جو مختصر طور پر میں نے کرانے کی کوشش کی ہے اس تعارف سے میرا مقصد یہ ہے کہ قاری یہ جان سکے کہ مولانا کے تصنیفی موضوعات کیا کچھ رہے ہیں۔ جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے ان کے پیش نظر ایک ہمہ گیر اسلامی تحریک ہے جو اپنی جدوجہد اور کام سے اپنے گرد بسنے والے معاشرے کو بتدریج اسلامی معاشرے میں تبدیل کرے۔ افراد کا اخلاق

بدلے۔ سوسائٹی کی اقدار بدلے، حکمرانوں کے اطوار بدلے اور بالآخر ایک اسلامی نظامِ مملکت قائم کردے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر یہ سارا لٹریچر تیار ہوا ہے اور اسی مقصد اقامتِ دین کے محور کے گرد یہ گھومتا ہے۔

اب مزید تعارف کی خاطر میں مولینا کی دیگر کتب کو بھی موضوع وار یہاں درج کردیتا ہوں تاکہ بیک نظر یہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے کس کس موضوع پر کیا کیا کچھ کام کیا ہے۔ ہر کتاب کا نام خود اس کے موضوع کی حدود متعین کردے گا۔

قرآن و حدیث

تفہیم القرآن حصہ اوّل، دوم، سوئم	قرآن و حدیث
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات	قرآن فہمی کے بنیادی اصول

اسلام کی بنیادی تعلیمات

رسالہ دینیات	تفہیمات حصہ اول و دوم
خطبات	اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی
مسئلہ جبر و قدر	اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر
رسائل و مسائل اوّل و دوم	اسلام کا نظامِ حیات
اسلام میں مرتد کی سزا	اسلام اور جاہلیت
نشانِ راہ	زندگی بعد موت
سلامتی کا راستہ	دین حق

سیاسیات

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ اوّل دوئم سوئم۔
مسئلہ قومیت
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے
مطالبہ نظامِ اسلامی
انتخابی جدوجہد
ہمارے داخلی اور خارجی مسائل
مخلوط انتخاب
مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ

اسلامی قانون، دستور اور سیاسی نظریات

اسلامی قانون
اسلامی دستور کی تدوین
اسلامی دستور کی بنیادیں
ذمیوں کے حقوق
اسلام کا نظریہ سیاسی
ایک اہم استفتاء
دستوری تجاویز
دستوری تجاویز پر تنقید و تبصرہ
الجہاد فی الاسلام
اسلامی ریاست

اسلامی اجتماعیات

جہاد فی سبیل اللہ
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات
تجدید و احیائے دین
مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل
تحریک اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل
ہدایات
شہادت حق

تعلیمات

تعلیمات
نیا نظام تعلیم
اسلامی نظام تعلیم
خطبۂ تقسیم اسناد

معاشیات

انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
مسئلہ ملکیت زمین
سود حصہ دوئم
سود حصہ اوّل
اسلامی معاشیات کے بنیادی اصول
اسلام اور جدید معاشی نظریات

معاشرتی مسائل

پردہ
اسلام کا اخلاقی نکتۂ نظر
اسلام اور ضبطِ ولادت
حقوق الزوجین
مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات
معراج کی رات

با مقصد تصنیف و تالیف کا یہ وسیع سلسلہ خود بتاتا ہے کہ دلانا نے عمر بھر اتنا کام کیا ہے کہ ایک بڑی سے بڑی اکیڈمی بھی اس نوعیت کا کام اتنے متفرق موضوعات پر انجام نہیں دے سکتی۔ اسے اللہ کی توفیق اور خداداد صلاحیت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

(۱۴)

حرفِ آخر

اب ان آخری سطور میں میں اس کتاب کے قارئین کی خدمت میں چند باتیں خصوصی طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں

آپ نے اس کتاب کے مطالعے کے بعد محسوس کیا ہو گا کہ اس میں میرا موضوع تاریخ نہیں رہا ہے اس لئے کہ تاریخ لکھنا ابھی قبل از وقت ہے اور تاریخ خود زمانہ لکھے گا۔ کسی کام کے معاصرین بہت سے نفسیاتی وجوہ کی بناء پر اس کی تاریخ نہیں لکھ سکتے میرا موضوع سوانح بھی نہیں رہا ہے اس لئے کہ مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کہ فلاں ابن فلاں کون ہے اور اس نے دنیا کی پرحوادث زندگی میں کیسے ایام گزارے میرا موضوع شخصیت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اتنی وزنی اور وسیع الاطراف شخصیت کو قلم کے دامن میں سمیٹنا بالکل میرے بس کی بات نہیں۔ میرا موضوع تو ایک متعارف کردار کا اپنے طور اور اپنے انداز میں تعارف کرانے کی اپنی سعی کوشش کرتا ہے اور اس کردار سے زیادہ اس کے مقصدِ زندگی کا تعارف ہے۔

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ ان سارے صفحات کے پردوں میں سے ایک حیرت انگیز کردار ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہ کردار ایک بامقصد کردار ہے۔

اپنے آس پاس بستی، شہر اور ملک میں نظر دوڑائیے کوئی اس نوعیت کا اور کردار بھی ہے جو مقصدِ زندگی کے اس نہایت وزنی بوجھ کے ساتھ شاہراہِ حیات پر چل رہا ہو

اپنے ملک میں اگر نہ ملے تو دور و نزدیک دیکھئے اور اوپر اٹھ کر اپنے ماضی قریب کے زمانے کی طرف دیکھئے۔ بڑے بڑے مقرر، لیڈر ادیب، مفسر اور جوشیلے انقلابی کارکن نظر آئیں گے لیکن اگر بے لاگ طور پر دیکھیں تو شاذ ایسا کردار اس انداز کے کام اور مقصد کے ساتھ نظر نہ آئے گا۔

یہ کردار تاریخ کے اسٹیج پر کبھی کبھی ابھرا کرتا ہے۔ یہ حق پرستی، حق گوئی اور حق آگاہی کا ایک مخصوص کردار ہے جو تاریخ کے اسٹیج پر باطل کے مقابلے میں حق کو کھول کھول کر بیان کرتا اور اس کے پلڑے میں اپنا سارا وزن ڈال دیا کرتا ہے۔ جو باطل کو للکارتا اور اسے پچھاڑنے کے لئے امت کے اندر سے اسلام کے انصار و اعوان کو پکار پکار کر جمع کرتا اور معرکۂ حق و باطل برپا کر دیا کرتا ہے۔

زمانے نے ایسے معرکے کئی دیکھے ہیں یہ کردار انحطاط و زوال کے ہر موقعہ پر ابھر کر باطل کے خلاف کشمکش کرتا رہا ہے۔ اس کردار کے تاریخ میں مختلف نام ہیں لیکن ان سب کا کام ایک ہے۔ مقصد ایک ہے۔ بنیادی طریق کار ایک ہے۔ اخلاقی اقدار کی حفاظت اور قرآن و سنت کی ترازو میں زندگی کے ہر مسئلے کو تول دینے کا داعیہ یکساں ہے۔

جس جس دور میں یہ کردار ابھرا ہے اس نے اپنے اپنے وقت کے مسلمان معاشرے کو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس نے کھلم کھلا معرکۂ حق و باطل برپا کر کے رکھ دیا ہے اس نے زندگی کے ہر معاملے میں قرآن و سنت کے نفاذ کا مطالبہ کر کے ہر زمانے کے جباروں کے ساتھ کشمکش برپا کی ہے۔ اور ہر زمانے کے مدعیان ایمان کو آزمائش کی کسوٹی پر لا کھڑا کیا ہے۔

کون کس کا ساتھ دیتا ہے!

کون کس نظریۂ زندگی کو برپا کرنے کے لئے اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالتا ہے!

یہ امت ایسے بہت سے تاریخی حوادث پر سر پیٹتی چلی آ رہی ہے کہ اس نے فلاں موقع پر فلاں طرزِ عمل اختیار کیوں نہ کیا۔ اس امت نے اپنی روایات کے تاریخی عجائب گھر میں ایسے بہت سے نوادرات عزیز و مقدس جمع کر کے رکھے ہوئے ہیں جو ان ہستیوں کی یادگاریں ہیں جنہوں نے ایسے معرکوں میں حق کا ساتھ دیا اور اس کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیا لیکن ایسے معرکوں میں اپنی غیر جانبداری پر یہ امت اب تک نادم چلی آتی ہے۔

مولانا مودودی تاریخ کے انہیں کرداروں میں سے ایک کردار ہیں جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں حق کا بول بالا کرنے اور اسلام کو سربلند کرنے کی کوشش کی بڑے خوش بخت ہوتے ہیں وہ لوگ جو ایسے کردار کو اپنے درمیان پاکر اس کی بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اس کی تائید و حمایت کے لئے کھل کر اس کا ساتھ دیں اور اس کی بدبختی کا کیا ٹھکانا ہے جو مزاحمت کر کے تاریخ کے اندر اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے موردِ الزام ٹھہرالیں لیکن جو لوگ "حق وہی ہے جو غالب ہو" کے فارمولے کو لئے خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کا ظلم بھی معمولی درجے کا نہیں ہے اور ان کی آئندہ نسلیں باطل نظام کے نیچے دبی اور کراہتی ہوئی انہیں بھی کبھی معاف نہیں کرتیں۔

اس لئے مولانا مودودی کوئی محض سرسری چیز نہیں ہیں۔ وہ ایک دوراہا ہے

پر کھڑے ہوئے ہیں وہ دوراہوں میں سے ایک خاص راہ "قرآن و سنّت پر مبنی نظامِ زندگی" کی طرف ایک مدّت سے بلا رہے ہیں اس بات پر ایک نہیں ہزاروں اور لاکھوں گواہ ہیں۔ اسی دوراہے پر اس ملک کا ہر فرد بشر کھڑا ہے۔ اسے شعور کیساتھ طے کرنا ہے کہ کونسی راہ اختیار کرے اور کس کا ساتھ دے۔ اور اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالے۔ اسلام کے ساتھ غیر جانبداری کا وزن غیر اسلام کے پلڑے میں ہی پڑتا ہے اس بات پر ہمیشہ کی اور خود اس ملک کی تاریخ بھی گواہ ہے۔

آپ اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالیں!

یہ ایک سوال ہے؛

خاصا بڑا اور مشکل سوال ہے!

کیا گذشتہ کی غیر جانبداریوں اور بے نیازیوں پر ماتم کرتی ہوئی۔ تاریخ کو دہرانا آپ کے لئے، اس ملک کے لئے، اسلام کے لئے، خود آپ کی نسلوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے!؟

اگر مفید ہو سکتا ہے تو پھر اس کتاب کو بے نیازی سے ایک طرف رکھ کر اپنے عزیز کاروبار میں لگ جائیے اور کبھی بھول کر بھی مومن کے مقصدِ زندگی جیسے خطرناک سوال پر غور نہ کیجئے۔ عافیت اور دنیا کی دولت اسی میں ہے۔

اگر مفید نہیں ہو سکتا تو پھر آگے بڑھ کر مولانا مودودی کی دعوت کو سمجھئے ان کا ہاتھ بٹائیے اور ان سے تعاون کرنے کی کوشش کیجئے کہ ممکن ہے دنیا کا خسارہ اس میں نظر آئے لیکن آخرت کی دولتِ بے پایاں اسی راہ میں ہے۔

بہر حال مولانا مودودی سے ضرور ملئے اس لئے کہ ان کے پاس آپکے لئے ایک اہم پیغام ہے

باہتمام:۔ شفیق احمد صدیقی پنجاب نیشنل پرنٹنگ پریس لاہور

آسمانِ ادب سے اتری ہوئی چار دلچسپ کتابیں

:- اسعد گیلانی :-

کا محبوب دور نظامِ اسلامی ہے

اسے اسی کا

انتظار

ہے

اسی محبوب کے انتظار میں واردات قلب کا یہ مجموعہ مصنف نے پیش کیا ہے۔

صفحات ۱۱۲ ، قیمت ایک روپیہ

صدیق الحسن گیلانی

ہمارا معاشرہ ٹیڑھے ترچھے چہروں کا ایک بھیانک جنگل ہے۔

اونچی دوکانیں

اسلامی ادب میں طنز و مزاح کا پہلا دلکش اور شگفتہ مجموعہ

اس کتاب میں مصنف نے انہیں اونچی دوکانوں کے پھیکے پکوان آپ کے سامنے رکھ دیا

:- اثرِ فاروق :-

• نصف انسانیت •

چوکھٹ کے اندر

رہتی ہے

اور اس میں کیا شک ہے کہ وہ نصف انسانیت نصف بہتر ہے اسی کی داخلی کیفیات اور تاثرات کا یہ مجموعہ ہے۔

صفحات ۹۶ ، قیمت ایک روپیہ

:- اسعد گیلانی :-

تاریخ انسانی کا سب سے بڑا انقلاب کوئی چند روزہ جنگی انقلاب نہ تھا بلکہ اخلاقی، معاشرتی، روحانی اور تمدنی اعتبار سے ایک ابدی انقلاب تھا۔

کتابِ انقلاب

اسی انقلاب کے لئے جذبہ، ولولہ اور ذوق و شوق پیدا کرتی ہے۔

صفحات ۱۲۸ ، قیمت ایک روپیہ

آزاد بک ڈپو ــــ سرگودھا ــ مغربی پاکستان

Meet MAULANA MAUDUDI

INTRODUCED

By

ASAD GILANI